الرسائل المهمة فی مسائل المختلفة :ج٢

یعنی حضرت مولانا قاضی رحمت اللہ صاحب لاجپوری ثم راندیری رحمہ اللہ کے تحقیقی اور مفید رسائل کا قابل مطالعہ مجموعہ

ترتیب،حواشی،عنوانات

مرغوب احمد لاجپوری

ناشر: جامعۃ القراءات، کفلیۃ

اجمالی فہرست رسائل

١	سبع سنابل في تصريح المسائل.......	١۵
٢	العطر العنبرى فى حكم اجابة الاذان المنبرى	٦٢
٣	كحل البصر فى ذكر وقت العصر.....	٩٨
۴	ازالة الأوهام عن مسائل الاحكام......	١٢٩
۵	نور العينين فى سنية الخطبتين فى العيدين	١٧۴
٦	هداية البرايا فى احكام الضحايا........	١٩۴
٧	احاديث النّبويّة فى ايّام الاضحيّة......	٢۵٢
٨	تلك عشرة كاملة.....................	٢٦٦
٩	اسلامی ضرورت اور اوقاف کی فاضل آمدنی	٣۴٦

فہرست رسالہ ”سبع سنابل في تصريح المسائل“

عرض محشی وتعارف کتاب..........	۱۶
غرض تالیف..........	۱۹
امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تابعی ہیں اوران کے خلاف جرح مردود ہے..........	۲۰
اذان میں ترجیع نہ کرنے اوراقامت میں دوبار کلمات کہنے کے دلائل..........	۲۵
اقامت کے کلمات مثنی مثنی ہیں..........	۲۸
آپ ﷺ کے چار مؤذن تھے..........	۳۰
نماز میں بسم اللہ آہستہ پڑھنی چاہیے..........	۳۲
نماز میں زیرناف ہاتھ باندھنا..........	۳۶
حدیث:علی پر موقوف وضعیف ہونے کے اشکالات اوران کے جوابات..........	۳۷
امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھنے کے دلائل..........	۴۰
سری نماز میں بھی امام کے پیچھے قرأت نہیں ہے،اس پر چنداحادیث (حاشیہ)	۴۹
سورۂ فاتحہ بھی امام کے پیچھے نہیں پڑھی جائے گی (حاشیہ)..........	۵۰
نماز میں آمین آہستہ کہے یازور سے؟..........	۵۱
ترک رفع یدین کے دلائل..........	۵۴
ضمیمہ......فائدہ جدیدہ جلیلہ..........	۵۸
حضرت علقمہ رحمہ اللہ کا اپنے والد سے سماع ثابت ہے..........	۵۸

فہرست رسالہ ''العطر العنبری فی حکم اجابة الاذان المنبری''

عرض محشی وتعارف کتاب........................	۶۳
اذان جمعہ کا جواب دل میں دیا جائے زبان سے نہیں، اکابر کے فتاوی.......	۶۳
اذان جمعہ کا جواب زبان سے دیا جائے، اکابر کے فتاوی..............	۶۶
اذان کے متعلق پانچ سوالات اوران کے جوابات..............	۷۳
آپ ﷺ کے زمانہ میں اذان جمعہ کتنی تھیں؟..............	۷۳
آپ ﷺ سے اذان کا قولی جواب دینا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے.......	۷۵
حیعلتین کے جواب میں لاحول کہنا چاہئے..............	۷۶
منقطع وغیر متصل، معارض ومخصص ،مرفوع متصل السند کی نہیں ہوسکتی.........	۷۸
خطیب کے نکلنے کے وقت کون سا کلام مکروہ ہےاور کن سا مکروہ نہیں.........	۷۸
اذان منبر کا جواب..............	۷۹
عمل معاویہ رضی اللہ عنہ سے استدلال پر اشکال اوراس کا جواب..............	۸۲
اذان خطبہ کے جواب کومکروہ کہا جائے تو اذان منبری کومکروہ کہنا پڑے گا......	۸۶
دوران خطبہ کلام دینی کا ثبوت..............	۸۶
ایک اورعمدہ دلیل..............	۸۹
دوران خطبہ درود شریف پڑھنے کا حکم..............	۹۰
مؤلف کا ایک فتوی..............	۹۳
تصدیقات علمائے رامپور..............	۹۵
علمائے لکھنؤ وعلی گڈھ کی تصدیقات..............	۹۵

فہرست رسالہ ”کحل البصر فی ذکر وقت العصر“

عرض محشی وتعارف کتاب..	۹۹
ظاہری روایت اورقول مختار میں عصر کا وقت دو مثل پر ہے...............	۱۰۰
وقت عصر کی ابتدا..	۱۰۳
عصر کا آخری وقت..	۱۰۴
ایک مثل کے بعد عصر کا وقت..	۱۰۸
ایک جماعت قائل ہے کہ عصر کا اخیر وقت غروب شمس پر ہوتا ہے..............	۱۰۹
چند احادیث..	۱۱۲
ایک مثل کی روایتیں صریح اور صحیح ہیں..................................	۱۱۴
ایک مثل پر وقت عصر کی احادیث...	۱۱۴
امام صاحب کا ایک قول بھی مثل اول کے موافق ہے..........................	۱۲۰
ظاہر روایت کب راجح ہوتی ہے؟..	۱۲۱
امام صاحب سے متعدد روایات اور صاحبین کے قول کی طرف رجوع........	۱۲۴

فہرست رسالہ ''ازالۃ الأوھام عن مسائل الاحکام''

عرض محشی وتعارف کتاب..	۱۳۰
عرض مؤلف وسبب تالیف..	۱۳۱
مقدمہ..	۱۳۵
ایک مثل پر وقت عصر کی روایت امام اعظم رحمہ اللہ سے ثابت ہے یا نہیں؟....	۱۳۷
اوراس روایت پر علماء حنفیہ محققین نے فتویٰ دیا ہے یا نہیں؟..............	۱۳۷
اوراس روایت پر عمل کرنے والا مذہب حنفی میں رہے گا یا نہیں؟............	۱۳۷
امام صاحب رحمہ اللہ نے عصر کے بارے میں دوسایہ سے رجوع فرمایا؟.......	۱۴۳
جمعہ کی دوسری اذان کا جواب مشروع ہے یا نہیں؟..................	۱۴۶
تصدیقات مع مواہیر ودستخط حضرات علماء کرام اجمیر شریف..............	۱۵۲
تصدیقات حضراتِ علماء کرام ٹونک..	۱۵۴
تصدیقات حضراتِ علماء کرام رامپور..	۱۵۴
تصدیقات حضرات علماء کرام لکھنو وعلی گڈھ..............................	۱۵۵
تصدیقات حضرات علماء کرام کانپور..	۱۵۶
تصدیقات حضرات علماء کرام دہلی..	۱۵۷
استفتاء..	۱۶۲
اشعار..	۱۷۱

فہرست رسالہ ''ازالۃ الأوهام عن مسائل الاحکام''

عرض مرتب	۱۷۴
الفائدۃ الجلیلہ	۱۷۵
دستخط علماء دہلی زادہم اللہ فضلا	۱۸۶
دستخط علماء راندیر زاد اللہ تعظیما لدیہ	۱۹۲
دستخط علمائے بھوپال زادھم اللہ تعظیما لدیہ	۱۹۲
۹۲تخط علماء اہل حدیث سلمہم اللہ تعالی	۱۹۳

فہرست رسالہ ''ھدایۃ البرایا فی احکام الضحایا''

عرض مرغوب	۱۹۵
غرض تحریر،از: موئف رسالہ رحمہ اللہ	۱۹۶
اضحیہ کا لغوی معنی اوراس کی وجہ تسمیہ	۱۹۷
تقربات مالیہ دوقسم کے ہیں	۱۹۷
دس درہم کی قربانی کرنا ہزار درہم صدقہ سے بہتر ہے	۱۹۷
شرع میں اضحیہ کی تعریف	۱۹۸
وجوب قربانی کی شرائط	۱۹۸
قربانی کا سبب ورکن	۱۹۹
قربانی سنت ہے یا واجب؟ اورسنت ووجوب کی دلیل	۲۰۰
قربانی کا منکر کافرنہیں	۲۰۲
قربانی کس پرواجب ہے	۲۰۲
نابالغ پرقربانی	۲۰۳
کس جانور کی قربانی جائز ہے	۲۰۴
حاملہ جانور کی قربانی اورجوبچہ پیدا ہواس کا حکم	۲۰۵
عیب دار جانور کی قربانی	۲۰۶
قربانی کاوقت	۲۰۹
رات میں قربانی کرنا	۲۱۰
قربانی میں مکان کا اعتبار ہے	۲۱۱

قربانی میں شرکت	۲۱۱
قربانی کا جانور مرجائے یا گم ہوجائے اور پھر مل جائے؟	۲۱۲
ایک شریک مرجائے یا نصرانی ہوجائے یا صرف گوشت کی نیت ہو	۲۱۳
تین آدمیوں کی قربانی خلط ملط ہوگئی تو	۲۱۴
غصب کئے ہوئے جانور کی قربانی	۲۱۶
امانت رکھے جانور کی قربانی	۲۱۶
قربانی کے گوشت کی تقسیم	۲۱۷
نابالغ اپنی قربانی کا گوشت کھائے	۲۱۷
نذر کی قربانی کا گوشت کھانا	۲۱۸
قربانی خود ذبح کرے	۲۱۸
اہل کتاب ومجوسی کا قربانی ذبح کرنا	۲۱۸
قربانی کی کھال کے مسائل	۲۱۹
دو جانور قربانی کئے تو	۲۲۰
زیادہ قیمت والی قربانی افضل ہے	۲۲۰
مامور نے قصداً بسم اللہ نہیں پڑھی تو اس پر قیمت واجب ہے	۲۲۰
معین ذابح پر بسم اللہ کا حکم	۲۲۰
ہنود کو خوش کرنے کے لئے گائے کا ذبح بند کرنا کیسا ہے؟	۲۲۲
گائے کو ماں کی طرح سمجھنا اور اس کا گوشت کھانے سے روکنا	۲۲۶

فہرست رسالہ ’’قربانی کے چند اہم مسائل‘‘

حجاج کی قربانی میں ایسے شخص کی شرکت جس پر وجوب قربانی کا وقت ابھی تک نہ ہوا ہو...	۲۴۳
وکیل کی عید نہیں ہے اور مؤکل کی ہے تو وکیل، مؤکل کی قربانی کر سکتا ہے؟.....	۲۴۵
قربانی کی صحت کے لئے قربانی کرنے والے کی جگہ کا اعتبار ہے یا جانور کے ذبح ہونے کی جگہ؟...	۲۳۹
مظاہر علوم سہارنپور کی تصدیق...	۲۴۴
دارالعلوم دیوبند کی تصدیق...	۲۴۴
حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری مدظلہم کی تصدیق وتائید.........	۲۴۴
حضرۃ الاستاذ مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری کا مدظلہم کا فتوی...............	۲۴۶
دارالعلوم کراچی کا فتوی اورا کا بر دارالعلوم کی تصدیقات...............	۲۴۷
اہل برطانیہ کی قربانی ہندوپاک میں جب تک برطانیہ میں صبح صادق طلوع نہ ہو وہاں تک درست نہیں...	۲۴۸
اصیل کے یہاں قربانی کے دن ختم ہو چکے ہوں اور وکیل کے یہاں باقی ہوں تو...	۲۴۸
قربانی کے دن گذر گئے اور رقم رہ گئی تو وکیل خود صدقہ کر سکتا ہے؟..............	۲۵۰

فہرست رسالہ ''احادیث النّبویّة فی ایّام الاضحیّة''

تین دن سے زیادہ قربانی کے گوشت کو رکھنے کی ممانعت	۲۵۳
تین دن کے بعد قربانی کے گوشت کو کھانے کی اجازت	۲۵۳
آثار صحابہ رضی اللہ عنہم	۲۵۴
قربانی کے چار دن کے قائلین کے دلائل اور ان کے جوابات	۲۵۶
((کل ایام التشریق ذبح))	۲۵۶
ایام تشریق ایام ذبح ہیں تو پھر نویں کو بھی قربانی جائز ہونی چاہیے	۲۵۶
دور صحابہ رضی اللہ عنہم میں تمام مراکز اسلام کا فتوی تین دن کا تھا	۲۵۶
جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی روایت علماء اہل حدیث کے نزدیک بھی صحیح نہیں.	۲۵۷
چار دن والی روایت پر اہل حدیث کی خدمت میں چند گذارشات	۲۵۸
نواب صاحب کے نزدیک صحابی کا قول حجت نہیں	۲۵۸
مقلد سے حدیث کا مطالبہ تعجب خیز۔قربانی کی فضیلت میں کوئی صحیح حدیث نہیں، پھر حضرات اہل حدیث حضرات قربانی کیوں کرتے ہیں؟	۲۵۹
قربانی کے ایام میں سات مذاہب	۲۶۱
''الیواقیت'' سے ایام قربانی کے متعلق تین سوالات اور ان کے جوابات	۲۶۲
کیا قربانی کرنے کا صرف ایک ہی دن ہے، دوسرا آرام کرنے کا ہے؟	۲۶۲
ابن عباس رضی اللہ عنہ چار دن کے قائل یا تین دن کے؟ ابن حجر رحمہ اللہ کا تسامح	۲۶۳
ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اثر قربانی کے تین دن ہیں' کا حوالہ	۲۶۴

فہرست رسالہ ’’تلک عشرۃ کاملۃ‘‘

تقریظ از: حضرت مولانا محمد امین الدین صاحب رحمہ اللہ............	۲۶۷
عرض محشی و تعارف کتاب............	۲۶۸
غرض تحریر، از: مؤلف رحمہ اللہ............	۲۷۱
ابوحنیفہ کنیت رکھنے کی وجہ (حاشیہ)............	۲۷۱
نعمان کے تین معنی (حاشیہ)............	۲۷۱
امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کا زمانہ یقیناً پایا ہے............	۲۷۳
امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دعا کرنا............	۲۷۳
اکثر فقہاء موالی و اعاجم میں سے تھے، ایک دل چسپ مکالمہ (حاشیہ)........	۲۷۴
امام صاحب رحمہ اللہ کی ولادت کے بعد وفات پانے والے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین (حاشیہ)............	۲۷۸
امام ابوحنیفہ تابعی نہیں ہے‘ معترضین کی عبارتیں اور ان کے جوابات..........	۲۷۹
امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر قلت عربیت کا الزام اور اس کا جواب............	۲۹۰
کیا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو صرف سترہ حدیثیں یاد تھیں؟............	۲۹۲
امام صاحب رحمہ اللہ کی پندرہ اسانید کا مجموعہ (حاشیہ)............	۲۹۸
امام صاحب پر ’’اصحاب الرائے‘‘ و ’’اہل الرائے‘‘ کا الزام............	۳۰۱
حضرت باقر اور امام صاحب کے درمیان قیاس پر بہترین گفتگو (حاشیہ).....	۳۰۴
بحث: کثرت مشائخ ابی حنیفہ رحمہ اللہ کے اور ان کے ثقہ ہونے میں..........	۳۰۵
بحث ذکر میں اس بات کے کہ: جرح کرنا امام صاحب پر مردود و باطل ہے...	۳۰۸

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مناقب میں علماء غیر احناف کی کتابیں............	۳۱۴
امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی شان میں ابن حجر رحمہ اللہ کے اقوال............	۳۱۵
بحث: فقہ اور فقہاء کی عمدگی اور افضلیت میں............	۳۱۸
امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر قیاس کا الزام............	۳۲۲
بحث ذکر میں اس بات کے کہ: ابوحنیفہ رحمہ اللہ مفسر اور مستنبط کلام اللہ تھے...	۳۲۵
رسالہ کی غرض تحریر یہ ہے کہ امام اعظم کو برا کہنے والوں کو غیرت ہو............	۳۳۵
بخاری، مسلم، ابن تیمیہ، ابن قیم، محی الدین عربی (رحمہم اللہ) وغیرہ پر جرح....	۳۳۶
کون سی جرح مردود ہے؟............	۳۳۶
امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر یہ الزام کہ آپ حدیث پر قیاس کو مقدم کرتے ہیں.....	۳۳۷
امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر یہ الزام کہ آپ کثیر الرائے تھے............	۳۳۷
امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر یہ الزام کہ آپ قلیل الروایت تھے............	۳۳۸
امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر یہ الزام کہ آپ کثیر التعبد تھے............	۳۳۸
امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر یہ طعن کہ سفیان ثوری اور دار قطنی نے آپ پر جرح کی	۳۳۹
امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر یہ طعن کہ آپ کے اکثر تلامذہ وضاعین و مجروحین تھے.	۳۴۱
امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر یہ طعن کہ آپ قلیل العربیہ تھے............	۳۴۲
ایک ضروری وضاحت............	۳۴۳
مختصر تذکرہ مناقب امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کوفی رحمۃ اللہ علیہ......	۳۴۳

فہرست رسالہ ''اسلامی ضرورت اوراوقاف کی فاضل آمدنی''

عرض مرتب..	۳۴۷
مسجد کی فاضل آمدنی سے کوئی مدرسہ یا یتیم خانہ کھول سکتے ہیں یا نہیں؟........	۳۴۸
مسجد کی فاضل آمدنی سے علما' فقرا' سادات اور درویشوں کی خدمت کرنا درست ہے یا نہیں؟...	۳۵۵
مسجد کی ضرورت سے زائد آمدنی کو یتامی اور بیواؤں پر خرچ کرنے کا حکم.....	۳۵۷

سبع سنابل في تصريح المسائل

اس رسالہ میں: امام اعظم رحمہ اللہ تابعی ہیں یا نہیں؟ اذان میں عدم ترجیع اور اقامت کے کلمات مثنی مثنی ہیں، نماز میں بسم اللہ آہستہ پڑھنی چاہیے، نماز میں زیر ناف ہاتھ باندھنا، امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھنا، نماز میں آمین آہستہ کہنا، ترک رفع یدین جیسے سات مسائل مہمہ سوال وجواب کے طرز پر بڑے سلیقہ اور تحقیق سے جمع کیے گئے ہیں۔ دور حاضر میں ہر آدمی کے لئے اس کا مطالعہ انشاء اللہ نافع ہوگا۔

حضرت مولانا قاضی رحمت اللہ صاحب لاجپوری' راندیری

ترتیب، حواشی واضافہ

مرغوب احمد لاجپوری

ناشر: جامعة القراءات، کفلیة

عرض محشی وتعارف کتاب

دورحاضر میں ایک فرقہ نے چند مسائل کو لے کرامت میں عجیب وغریب نااتفاقی اور بیجا بحث ومباحثہ کی فضا بنا رکھی ہے۔حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اورفقہائے امت رحمہم اللہ کے زمانہ ہی سے ان مسائل میں آراء مختلف رہی ہیں،مگران میں اختلاف و افتراق کا پایا جانا جیسا کہ اس زمانہ میں پایا جاتا ہے تاریخ میں مذکور نہیں۔

علماءامت نے بڑی تحقیق سے ان مسائل پر اپنی اپنی تصانیف میں کلام فرمایا ہے اور ہر مسئلہ کو مبرہن اور واضح کردیا ہے، دلائل کے انبار لگا کر حق کو آشکارا کردیا ہے،مگر ضد وعناد کا کیا حل؟ حضرت مولانا قاضی سید رحمت اللہ صاحب لاجپوری ثم راندیری رحمہ اللہ نے ایسے سات مسائل پر سیر حاصل بحث فرما کر ہر ہر مسئلہ پر تحقیق سے قلم اٹھایا۔

(۱)...... پہلا مسئلہ یہ ہے کہ:امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تابعی ہیں یانہیں؟ حضرت نے معتبر حوالوں سے ثابت کیا کہ آپ تابعی ہیں، اوران حوالوں میں اہل حدیث عالم مفسر قرآن نواب حسن خان صاحب کی تحقیق بھی لکھدی کہ وہ بھی اختلاف اقوال کو نقل کرکے اس کو ترجیح دے رہے ہیں کہ آپ تابعی ہیں۔

(۲)......دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ: اذان میں ترجیع ہے یانہیں؟ اوراقامت کے کلمات مثنیٰ مثنیٰ ہیں یانہیں؟ اس پر پانچ روایات سے ثابت کیا کہ اذان میں ترجیع نہیں۔اسی طرح کلمات اقامت کے بارے میں چار حدیثوں سے ثابت کیا کہ کلمات اقامت مثنیٰ مثنیٰ ہیں۔اس بحث کے آخرمیں آپ ﷺ کے چار مؤذنوں کا عمل لکھا کہ:

حضرت بلال رضی اللہ عنہ ترجیع نہیں کرتے تھے اور کلمات اقامت کے ایک ایک بار کہتے تھے، تو حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے بلال رضی اللہ عنہ کی اقامت کو اختیار کیا،اوراہل مکہ نے ابومحذورہ

رضی اللہ عنہ کی اذان اور بلال کی اقامت اختیار کی، اور جناب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور اہل عراق نے بلال رضی اللہ عنہ کی اذان اور ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کی اقامت کو پسند کیا، اور جناب امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور اہل مدینہ نے اذان و اقامت دونوں بلال کی معمول بہا بنائیں، ان سب کے خلاف امام مالک رحمہ اللہ اس کے قائل ہیں کہ تکبیر کا اعادہ نہ کیا جائے اور ''قد قامت الصلوۃ'' ایک مرتبہ کہا جائے۔

(۳)......تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ: نماز میں بسم اللہ آہستہ پڑھنی چاہئے، اس پر بھی آپ نے مسلم، نسائی، مسند احمد وغیرہ سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کو نقل کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان رضی اللہ عنہم نماز میں بسم اللہ زور سے نہیں پڑھتے تھے، پھر حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کی روایت میں جس میں اسے بدعت کہا گیا ہے ترمذی شریف سے نقل کر کے بسم اللہ کا آہستہ پڑھنا ثابت کیا۔

(۴)...... چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ: نماز میں ہاتھ ناف کے نیچے باندھنے چاہئے، اس پر ترمذی ابوداؤد سے احادیث نقل کی، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت: تحت السرہ ہاتھ باندھنا سنت ہے، لکھی، پھر اس پر موقوف وضعیف ہونے کا اشکال اور اس کے جوابات دیئے۔

(۵)...... پانچواں مسئلہ یہ ہے کہ: امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھی جائے، اس پر آپ نے قرآن کریم کی آیت اور مختلف احادیث سے اپنے مسلک کو ثابت کیا، پھر جابر جعفی کے ضعف پر وارد ہونے والا سوال اور اس کا جواب دیا۔

(۶)...... چھٹا مسئلہ یہ ہے کہ: نماز میں آمین آہستہ کہی جائے، اس مسئلہ پر کئی دلائل ذکر کر کے آمین بالسر کو ثابت فرمایا۔

(۷)......ساتواں مسئلہ یہ ہے کہ: ترک رفع یدین کے دلائل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات

شیخین رضی اللہ عنہما کا عمل نقل کر کے ثابت کیا کہ ترک رفع یدین عین حدیث کے مطابق ہے۔

رسالہ کے آخر میں حضرت علقمہ رحمہ اللہ کا اپنے والد سے سماع ثابت ہے یا نہیں؟ اس موضوع پر نفیس بحث فرما کر ثابت کیا کہ حضرت علقمہ رحمہ اللہ کا اپنے والد سے سماع ثابت ہے۔

الغرض رسالہ بہت نافع اور مفید اور دلائل سے پر ہے۔اس دور میں ہر آدمی کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے تا کہ معلوم ہو کہ بعض حضرات کے احناف پر اعتراضات کی حقیقت کیا ہے؟ اور احناف کے پاس تمام مسائل کے کس قدر قوی اور مضبوط دلائل موجود ہیں۔

راقم نے اس رسالہ میں عنوان کا اضافہ کیا۔ چھ مسائل پر مفید حواشی بھی لکھے،اور کئی احادیث کا اضافہ کر کے مسئلہ کو اور مبرہن و مدلل کر دیا ہے۔صرف ساتوں مسئلہ ترک رفع یدین پر چونکہ اسی مجموعہ میں ایک پورا رسالہ ہے،اس لئے اس پر اضافہ کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔جتنی احادیث کا اضافہ کیا ہے وہ ساری حضرت مولانا انوار خورشید صاحب مدظلہ کی بہترین اور مفید کتاب ''حدیث اور اہل حدیث'' سے ماخوذ ہیں۔آیات کے ترجمے حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کے ''آسان ترجمہ'' سے لئے گئے ہیں۔

اللہ تعالی اس حقیر کاوش کو اپنے دربار عالی میں شرف قبولیت عطا فرما کر امت کی اصلاح کا ذریعہ اور ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

مرغوب احمد لاجپوری

....

سنبل: ایک خوشبودار بوٹی، خوشہ۔ جمع سنابل۔ ''سبع سنابل'' سات خوشبودار بوٹیاں۔ سات اختلافی مسائل کی تصریح میں احادیث و دلائل کی عمدہ و فرحت بخش تصریح۔

غرض تالیف

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ علی نوالہ والصلوۃ والسلام علی رسولہ ﷺ وعلی أھلہ وأصحابہ وآلہ

امابعد! خاکسارِ ذرۂ بے مقدار، خیر خواہ انام، امیدوار شفاعت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام، قاضی رحمت اللہ ابن قاضی احمد اللہ قادری نسباً ومشرباً، راندیری توطناً، حنفی مذھباً، ناظرین پر تمکین کی خدمات بابرکات میں عرض پرداز ہے کہ یہ عجالۂ نافعہ [۱] محض اس غرض سے لکھا گیا ہے کہ بعض عوام بسبب جہالت کے حق سے چشم پوشی کرکے آج کل جناب امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ اوران کے مذہب کے مسائل فرعیہ کو نظر حقارت سے دیکھتے ہیں اور گستاخی کے کلمات سے یاد کرتے ہیں، اورعلانیہ ہرزہ سرائی [۲] اور بے ہودہ گوئی [۳] سے علی رؤس الاشہاد [۴] کوچہ وبازار میں بزرگان دین پر طرح طرح کے اتہام لگاتے پھرتے ہیں، یہاں تک کہ میں نے بذات خود سنا ہے کہ کہتے ہیں: ابوحنیفہ (رحمہ اللہ) نے دین بگاڑ دیا، اور بدعت تقلید میں خلق اللہ کو گرفتار کردیا، اورخاص کر فلاں فلاں مسئلے تو محض قیاس کے ڈھکوسلے اور قرآن وحدیث کے بالکل خلاف ہیں۔ معاذ اللّٰہ من ذلک، لہذا یہ چند سطریں تحریر کرکے امید کرتا ہوں کہ یہ بدظن اور گستاخی سے باز آویں اور توبہ کریں۔

---

[۱]......عجالۂ نافعہ: عجالہ کا معنی ہیں: ماحضر، جو چیز سردست میسر آئے، اور جھٹ پٹ حاضر کی جائے۔ نافعہ نفع دینے والا۔ گویا جلدی میں یہ نافع رسالہ جو تیار کیا گیا ہے۔

[۲]...... ہرزہ سرائی: بیہودہ گوئی، یاوہ گوئی۔

[۳]...... بے ہودہ گوئی: فضول باتیں۔

[۴]......علی رؤس الاشہاد: علی الاعلان، علانیہ، گواہوں کے روبرو۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تابعی ہیں اور ان کے خلاف جرح مردود ہے

(۱):سوال:......کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرح متین ! اس مسئلہ میں کہ جناب امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ ¹ کی ملاقات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ ثابت ہے یا نہیں؟ اور ان کا تابعی اور خیر القرون سے ہونا ثابت ہے یا نہیں؟ اور آپ اصحاب فضائل میں سے ہیں یا نہیں؟ اور جن لوگوں نے ان پر جرح وطعن کیا ہے وہ باطل ومردود ہے یا نہیں؟ **بینوا بیاناً شافیاً توجروا أجراً وافیاً۔**

الجواب الوسیط بغیر افراط وتفریط :......صورت مسئولۃ الصدر میں واضح ہو کہ علامہ عبدالحئ لکھنوی رحمہ اللہ "سعایہ" حاشیہ شرح وقایہ (کے ص ۲۷) میں تحریر فرماتے ہیں کہ: علامہ خطیب اپنی تاریخ میں روایت کرتے ہیں اسماعیل بن حماد بن النعمان ابی حنیفہ سے کہ: ثابت بن مرزبان والد ابی حنیفہ فارسی نسل کے آزاد لوگوں میں سے ہیں، خدا کی قسم ہم پر رق اور غلامی کبھی واقع نہیں ہوئی، اور یہ بھی کہا کہ: میرے دادا' ابوحنیفہ کی ولادت: ۸۰ھ (اسّی) میں ہوئی، اور امام صاحب کے والد ماجد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچے ہیں، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے اور ان کی ذریت کے حق میں برکت کی دعا کی ² اور وہ

---

¹......امام صاحب رحمہ اللہ کی کنیت ابوحنیفہ ہے، اس کی وجہ بعض حضرات نے یہ بتائی ہے کہ: آپ کی ایک بیٹی کا نام "حنیفہ" تھا، لیکن تذکرہ نگاروں کی ایک جماعت کی تحقیق یہ ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ کے صرف ایک بیٹے "حماد" (رحمہ اللہ) تھے، ان کے علاوہ کوئی اور اولاد مؤنث یا مذکر نہیں تھیں۔

شیخ بدرالدین علائی رحمہ اللہ نے شیخ محی الدین کافیجی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ: "حنیفہ" اہل عراق کے یہاں دوات کو کہتے ہیں، اور امام صاحب رحمہ اللہ ہر وقت دوات ساتھ رکھتے تھے۔ (عقود الجمان ص ۴۱)

²......امام صاحب رحمہ اللہ کے پوتے اسماعیل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمیں اللہ تعالی سے امید ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دعا ہمارے حق میں قبول ہوئی۔ (تاریخ بغداد ص ۳۲۶ ج ۱۳، سیرت امام ابوحنیفہ ص ۱۱)

عبارت یہ ہے:

”روی الخطیب في تاریخه عن اسمٰعیل بن حماد بن النعمان ان أبي حنیفة من أبناء فارس الأحرار، واللّٰه ما وقع علینا رق ، ولد جدی أبوحنیفة سنة ثمانین ، وذهب ثابت إلی علی بن أبي طالب رضي الله عنه فدعا له بالبركة في ذریته“

اور جناب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے چار صحابیوں کا زمانہ پایا ہے: انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ کوفے میں تھے، اور سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ مدینہ میں تھے، اور ابوالطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ مکہ معظّمہ میں تھے، مگر کسی سے ملاقات نہیں ہوئی، اور نہ کسی سے اخذ کیا ہے، اور اصحاب ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم سے ملاقات کی ہے، اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت بھی ہے۔

وأدرک أبوحنیفة أربعة من الصحابة : أنس بن مالک رضي الله عنه وعبداللّٰه بن أبي أوفیٰ رضي الله عنه بالكوفة ، وسهل بن الساعدی رضي الله عنه بالمدینة ، وأبا الطفل عامر بن واثلة رضي الله عنهم بمكة ، ولم یلق أحداً منهم ولا أخذ عنه ، وأصحابه یقولون : لقی جماعة من الصحابة رضي الله عنهم وروی عنهم،

اوراسی طرح نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم بھوپالی نے اپنی کتاب ”حطہ فی اصول صحاح ستہ“ میں تصریح کی ہے اور اسی طرح اختلاف کا ذکر کیا ہے، اور بعد بیان اختلاف کے امام صاحب رحمہ اللہ کے تابعی ہونے کو ترجیح دی ہے، اور کہا ہے کہ: مثبت کا قول مقدم ہے نافی پر جیسا کہ کتب اصول میں ثابت ہے، اور وہ عبارت یہ ہے:

وقال الكردری : جماعة من المحدثین انكروا ملاقاته مع الصحابة ، وأصحابه أثبتوه بالأسانید الصحاح والحسان ، وهم أعرف بأحواله منهم ، والمثبت العدل أولی من النافی ، وقد جمعوا مسنداته فبلغت خمسین حدیثا یرویها الامام عن

الصحابة الكرام رضی اللہ عنہم وإلى هذا أشار الإمام بقوله : ”ماجاء نا عن رسول الله ﷺ فعلى الرأس والعين ، وماجاء نا عن التابعين فهم رجال ونحن رجال ، لأنه زاحم التابعين في الفتوىٰ“

اور ملاقات ہونا جناب امام اعظم رحمہ اللہ کا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے اور دیکھنا ان کا صحابہ کو ممکن بلکہ ثابت ہے، کیونکہ ولادت امام صاحب کی ۸۰ھ (اسّی) میں ہوئی اور وفات ان کی ۱۵۰ھ (ایک سو پچاس) میں بنابر مذہب اصح کے ہوئی ہے، اور اس سنہ میں صحابہ موجود تھے، [1] چنانچہ سعایہ (صفحہ:۲۸) میں ہے:

”وكانت ولادته سنة ثمانين من الهجرة ، وقيل : أحدى وستين والأول أصح ، وتوفى في رجب ، وقيل : في شعبان سنة خمسين ومائة ، وقيل : ثلث وخمسين ، والأول أصح“

پس خیر القرون سے ہونا امام اعظم صاحب رحمہ اللہ کا اور تابعین میں سے ہونا ثابت ہوگیا، اور جو انکار کرتے ہیں وہ یا تو جہل کے باعث سے یا تعصب کی رو سے منکر ہیں۔

چنانچہ ”حاشیہ شرح نخبۃ الفکر“ میں مذکور ہے، اور تابعی کی تعریف کتب اصول حدیث میں جو مختار عند الجمہور رہے، وہ یہ ہے کہ: تابعی وہ شخص ہے جس نے کسی ایک صحابی سے بھی ملاقات کی ہو۔ بنا بر اس مختار مذہب کے تابعی ہونا امام صاحب کا بلا ارتیاب صحیح وثابت

[1]...... حضرت واثلہ بن اسقع کی وفات ۸۳ھ یا ۸۵ھ میں، حضرت عمر بن حریث کی ۸۵ھ میں، حضرت عبد اللہ بن جزاء ۸۵ھ میں، حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی ۸۷ھ میں، حضرت عبد اللہ بن بسر ۸۸ھ میں، حضرت عبد اللہ بن جعفر کی ایک روایت کے مطابق ۹۰ھ میں، حضرت سائب بن خلاد کی ۹۱ھ میں، حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کی ۹۱ھ یا ۹۲ھ یا ۹۴ھ میں، حضرت انس کی ۹۳ھ میں، حضرت عبد اللہ بن بسر رضی اللہ عنہ کی ۹۶ھ میں، حضرت ابو الطفیل (عامر بن واثلہ) کی ۱۱۰ھ میں، رضی اللہ عنہم اجمعین،

ہے، چنانچہ ''نخبۃ الفکر'' (کے صفحہ:۵۹) میں یہ عبارت اوراس کے ماقبل کی عبارت'' حاشیہ عقدالدررفی جیدنزہۃ النظر'' میں موجود ہے:

التابعي : وهو من لقى الصحابى كذٰلک وهذا معلق باللقاء ، وماذكر معه إلا قيد الإيمان به ، وذلک خاص بالنبى ﷺ وهذا هو المختار، قوله : وهذا هو المختار الخ ، قال الشارح : قال العراقى وعليه عمل الأكثرين ، وقد أشار النبى عليه السلام إلى الصحابة والتابعين بقوله : طوبىٰ لمن رأىٰ وآمن بى' طوبىٰ لمن رأىٰ من رآنى (الحديث) فاكتفى فيهما بمجرد الروية ، قلت : وبه يندرج الإمام الأعظم في سلک التابعين ، فإنه قد رأىٰ أنس بن مالک وغيره من الصحابة رضي الله عنهم على ماذكره الشيخ الجزرى فى " اسماء الرجال " والإمام التوربشتى في " تحفة المسترشدين " وصاحب كشف الكشاف" في سورة المؤمنين" وصاحب مراٰة الجنان وغيرهم من العلماء المتبحرين ، فمن نفى أنه تابعى فإما من التتبع القاصر أو التعصب الفاتر، أقول : وقد أقر برؤيته أنس بن مالک رضي الله عنه إمام الجرح والتعديل " الدار قطنى " مع شدة طعنه في ذلک للإمام الأعظم رضي الله عنه، وصرح به صاحب مجمع البحار حيث قال: " قال الدار قطنى : لم يلق أبوحنيفة أحداً من الصحابة رضي الله عنهم وإنما راىٰ أنسا رضي الله عنه بعينه ولم يسمع منه"

باوجوداس کے دارقطنی جونفی ملاقات کی کرتے ہیں یہ بھی غیرمعتبر ہے، کیونکہ ''حطہ فی اصول صحاح ستۃ'' میں نواب صاحب مرحوم (صفحہ۳۵) میں فرماتے ہیں کہ:''علامہ حافظ ان حجرالعسقلانی رحمہ اللہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

أدرک الإمام أبوحنيفة جماعة من الصحابة ، لأنه ولد بالكوفة سنة ثمانين من الهجرة ، وبها يومئذ من الصحابة عبدالله بن أبي أوفىٰ رضي الله عنه فإنه مات بعد ذلک

بالاتفاق، وبالبصرة يومئذ أنس بن مالک رضی اللہ عنہ ومات سنة تسعين أو بعدها، والمعتمد على أدراكه ما تقدم وعلىٰ رويته لبعض الصحابه ما أورده ابن سعد في الطبقات ، فهو بهذا الاعتبار من طبقة التابعين ، ولم يثبت ذلک لأحد من ائمة الأمصار المعاصرين له كالأوزاعى بالشام ، والحماد بالبصرة ، والثورى بالكوفة ، ومالک بالمدينة ، ومسلم بن خالد الزنجى بمكة ، والليث بن سعد بمصر ، انتهى،

وقال ابن حجر المكى فى شرح " المشكوٰة " : أدرک الإمام الأعظم ثمانية من الصحابة : منهم أنس رضی اللہ عنہ وعبدالله بن أبي أوفىٰ رضی اللہ عنہ وسهل بن سعد رضی اللہ عنہ وأبو الطفيل رضی اللہ عنہ ، انتهى،

اورمقدمہ سعایہ کے صفحہ (۲۸) میں علامہ سیوطی رحمہ اللہ کی ''تبییض الصحیفہ'' سے منقول ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ کی ملاقات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے، اوروہ عبارت یہ ہے:

وفى تبييض الصحيفة أيضاً : قد ألف الإمام أبو معشر عبد الكريم بن عبدالصمد الطبرى الشافعي جزء في ما رواه الإمام أبو حنيفة عن الصحابة رضی اللہ عنہم ، قال فيه : قال الإمام أبو حنيفة : لقيت من أصحاب رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم أنس بن مالک رضی اللہ عنہ وعبدالله بن أنيس رضی اللہ عنہ وعبد الله بن جَزْء رضی اللہ عنہ وجابر بن عبدالله رضی اللہ عنہ ومعقل بن يسار رضی اللہ عنہ وواثلة بن الأسقع رضی اللہ عنہ وابن عجرة رضی اللہ عنہ ثم روى عن أنس رضی اللہ عنہ ثلاثة أحاديث وعن ابن أنيس رضی اللہ عنہ حديثا،

تنبیہ:......ان عبارات سے آپ رحمہ اللہ کا تابعی ہونا اور خیر القرون سے ہونا ثابت ہوگیا۔ اسی طرح آپ کے فضائل حمیدہ اور مناقب پسندیدہ لاتعدولاتحصی ہیں، کتب متداولہ معتبرہ میں بسط سے مبین ومبرہن ہیں، جس کا جی چاہے مقدمات علامہ مولوی عبدالحئی رحمہ اللہ اور ''حطہ فی اصول صحاح ستہ'' اور تواریخ کی کتابیں مثلاً ''ابن خلکان'' وغیرہ ملاحظہ فرمالے۔

اور بعضے رفضہ اور اہل ظواہر اور جناب غوث الاعظم رحمہ اللہ نے اپنی ''غنیۃ الطالبین'' میں جو ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بارے میں طعن کیا ہے، وہ ابوحنیفہ بن ثابت ہمارے مذہب کے پیشوا نہیں ہیں، بلکہ وہ ابوحنیفہ مطعون بنی عامر میں سے ہیں، اور ابوحنیفہ کوفی نہیں ہیں، چنانچہ ''کشف الالتباس'' کے (صفحہ۲۵۲) میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

''مع ھذا یہ مطاعن حق میں ابوحنیفہ کوفی کے نہیں ہے، بلکہ ابوحنیفہ عامری بصری کے حق میں ہیں'' فلاضیر۔

سو مجموع تشنیعات غزالی و جیلانی و قاضی عضد اس کے حق میں ہیں، نہ ابوحنیفہ کوفی رحمہ اللہ کے باب میں۔''ومن أدعی خلافه ، فعليه البيان وعلينا رده بالبرهان'' انتهى،

اسی طرح دوسرے علماء محققین نے بھی تصریح کی ہے، مگر بسبب اختصار کے اتنی ہی عبارات پر اکتفاء کیا گیا، فلله الحمد على اتمامه ، على التحقيق الأنيق بالتوفيق الرفيق،

اذان میں ترجیع نہ کرنے اور اقامت میں دو بار کلمات کہنے کے دلائل

(۲):سوال:......کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرح متین ''زادكم الله تعالى شرفاً وتعظيماً لديه'' اس مسئلہ میں کہ ہمارے مذہب حنفی میں اذان و اقامت کے کلمات دو دو بار کہتے ہیں، اور اذان میں ترجیع نہیں کرتے اور اقامت میں سوائے ''قد قامت الصلوۃ'' کے دوسرے کلمات کو ایک ایک بار نہیں کہتے، اس بارہ میں کوئی حدیث قوی مستند دلیل سے ثابت ہے یا نہیں؟ بينوا بياناً شافياً توجروا أجراً وافياً،

الجواب الوسيط بغير افراط وتفريط:......ہمارے مذہب حنفی کے موافق اذان میں ترجیع نہ کرنے اور اقامت میں دو دو بار کلمات کہنے کے بارے میں حدیثیں موجود ہیں:

چنانچہ ایک حدیث ''ترمذی شریف'' کی ہے:

عن عبداللّٰہ بن زید رضی اللہ عنہ قال : کان أذان رسول اللّٰہ ﷺ شفعا شفعا فی الأذان والإقامة،

اس حدیث پر حنفیہ اور سفیان ثوری اور ابن المبارک رحمہما اللہ وغیرہم نے عمل کیا ہے، جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا:

" قال بعض أهل العلم : الأذان مثنى مثنى والإقامة مثنى مثنى ، وبه يقول سفيان الثورى وابن المبارک وأهل الكوفة "

اور اسی طرح سعایہ (کے صفحہ ١٦) میں ہے:

ونحن نقول لا ترجيع فى الأحاديث المشهورة فلم نقل به ،

یعنی ہم احناف کہتے ہیں کہ: ترجیع کا ثبوت احادیث مشہورہ میں نہیں ہے، لہذا ہم ترجیع کے قائل نہیں ہیں۔

دوسری حدیث وہ ہے جس کو ''ابوداؤد'' اور ''نسائی'' اور ''دارمی'' نے حدیث شعبہ سے روایت کیا ہے:

قال سمعت أباجعفر مؤذن مسجد بنيهلال ، يحدث عن مسلم بن المثنىٰ مؤذن المسجد عن ابن عمر ، قال : إنما كان الأذان على عهد رسول اللّٰہ ﷺ مرتين مرتين،

اس میں دلیل صریح ہے اس بات پر کہ اذان میں ترجیع نہ تھی۔

تیسری حدیث عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی ہے:

ومنها حديث عبداللّٰہ بن زيد رضی اللہ عنہ وقصة منامه فقد رواها أصحاب الصحاح والسنن والمسانيد ولم يذكر أحد منهم فيه ترجيعا ، فدل ذلک على أنه ليس

بشيء ، وإلا لكان مرويا في المنام ، لأنه الأصل في باب ثبوت الأذان،

یعنی ان میں سے حدیث عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی اور قصہ ان کے خواب کا ہے کہ اس کو اصحاب صحاح وسنن ومسانید نے روایت کیا ہے، اور کسی نے اس میں ترجیع کا ذکر نہیں کیا، پس یہ صریح دلیل ہے اس بات کی کہ ترجیع اصل اذان میں داخل نہیں ہے، ورنہ ضرور خواب کے قصہ میں مروی ہوتی، کیونکہ یہ خواب ثبوت اذان کے باب میں اصل ہے۔

اور چوتھی وہ روایتیں ہیں جو بلال رضی اللہ عنہ کی اذان کے بارہ میں مروی ہیں:

ومنها أخبار أذان بلال ، فإنه قد أذن في حياة رسول الله ﷺ ثم أذن بين يدى أبي بكر زمان خلافته ، وقد اتفقوا على أنه لم يكن الترجيع في أذانه كما ذكر العيني،

یعنی بعض ان حدیثوں میں سے حدیثیں اذان بلال رضی اللہ عنہ کی ہیں کہ انہوں نے رسول خدا ﷺ کے زمانۂ حیات تک اذان کہی، پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں اذان کہتے رہے، اور اس امر پر اتفاق ہے کہ ان کی اذان میں ترجیع نہ تھی۔

پانچویں یہ روایت ہے:

ومنها ما رواه الطبراني بسنده عن ابراهيم بن اسمٰعيل بن عبدالملك أبي محذورة رضی اللہ عنہ قال : سمعت جدى عبدالملك يقول : أنه سمع أبامحذورة رضی اللہ عنہ يقول : القى على رسول الله ﷺ الأذان حرفا حرفا : الله اكبر الله اكبر ، الحديث ، ولم يذكر فيه ترجيعا،

اور بعض ان حدیثوں میں سے وہ حدیث ہے جس کو طبرانی نے اپنی سند میں ابراہیم بن اسماعیل بن عبدالملک بن ابی محذورہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ: میں نے اپنے جد عبدالملک کو کہتے ہوئے سنا کہ: ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ: حضرت ﷺ نے مجھ کو کلمات اذان کی تعلیم

فرمائی ایک ایک حرف (یعنی تمام کلمات اذان کے)اوراس میں ترجیع کا ذکر نہیں کیا۔

اور بلال رضی اللہ عنہ کی اذان میں ترجیع نہ ہونے پر علماء کا اتفاق کرنا اس بات کی تائید کرتا ہے جیسا کہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے اس کی تصریح کی ہے،اوراگر ترجیع پر اہل مکہ کا عمل ہے تو عدم ترجیع پر اہل مدینہ کا عمل اوراتفاق ہے،اوریہی اولیٰ بالقبول ہے، چنانچہ اس کی تصریح ''سعایہ''(کے صفحہ ۱۷) میں ہے:

'' ویؤیده : أنه لم یختلف أحد فی أن الترجیع لم یکن في أذان بلال ، صرح به ابن الجوزی وغیره ،فالترجیع عمل أهل مکة وعدم الترجیع عمل أهل مدینة فهو أولی''

اقامت کے کلمات مثنیٰ مثنیٰ ہیں

اسی طرح اقامت کے کلمات مثنیٰ مثنیٰ ہونے پر بھی بہت دلیلیں ہیں: چنانچہ ''سعایہ''(کے صفحہ۲۲) میں اس کی تصریح ہے:

وأما أحادیث مذهبنا فکثیرة قد استوعبها الطحاوی والعینی والزیلعی ' واذکر نبذا منها،

یعنی احادیث ہمارے مذہب حنفی کی بہت ہیں، ان سب کو علامہ طحاوی اورعینی اورزیلعی رحمہم اللہ نے پورے طور پر بیان کیا ہے،اوران میں سے کچھ حدیثیں میں ذکر کرتا ہوں:

فروی الترمذی عن عبدالله بن زید رضی اللہ عنہ صاحب المنام قال : کان الأذان علی عهد رسول الله ﷺ شفعا شفعا والإقامة،

یعنی علامہ ترمذی رحمہ اللہ نے عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ صاحب منام سے روایت کی ہے (چنانچہ اوپر یہ روایت گذر چکی ہے) کہا: عبداللہ بن زید نے کہ: اذان حضرت ﷺ کے زمانہ میں دودوبار تھی اوراقامت بھی۔(یعنی اذان بغیر ترجیع کے اوراقامت بغیر افراد کے)

وروى الطحاوی و عبدا لرزاق والدار قطنی عن الأسود عن بلال ﷜أنه كان يثنی الأذان ويثنی الإقامة ، وكان يبدأ بالتكبير ويختم به ،

اورطحاوی اورعبدالرزاق اوردارقطنی نے اسود سے اوراسود نے بلال ﷜ سے روایت کیا کہ: وہ اذان اوراقامت کے کلمات دودوبارکہتے تھے،اورتکبیر سے شروع کرتے تھے اور تکبیر پرختم کرتے تھے۔

وروى أبـوداؤد والنسائی عن أبيمحذورة ﷜ : أن رسول الله ﷺ علّمه الأذان تسع عشرة كلمة ، والاقامة سبع عشرة كلمة ، قال النسائی : فعدها سبع عشرة كلمة،

اورابوداؤد اورنسائی نے ابی محذورہ ﷜ سے روایت کیا ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے ابومحذورہ ﷜ کواذان کے انیس کلمات اوراقامت کے سترہ کلمات تعلیم فرمائے۔نسائی نے کہا: پس شمارکرلئے کلمات اقامت کے سترہ،اس حدیث سے بھی کلمات اقامت کے دودو بارثابت ہیں،فهو المطلوب۔

اس کے علاوہ حدیثیں اس باب میں بہت ہیں،جس کوزیادہ کی حاجت ہووہ ”سعایہ حاشیہ شرح وقایہ“اور”عینی حاشیہ ہدایہ“ کوملاحظہ کرلے۔[۱]

---

[۱]......چنداوراحادیث یہ ہیں:
(۱)......عبداللہ بن زیدانصاری رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی خدمت میں آئے اورعرض کیاکہ: یارسول اللہ! میں نے خواب میں دیکھاکہ گویاایک شخص دوسبزچادریں اوڑھے ہوئے ایک دیوارکے ٹکڑے پر کھڑاہوا،اوراس نے اذان واقامت کہی،اوراس نے (شروع کی چارتکبیروں کے علاوہ) کلمات دودو بارکہے،اورتھوڑی دیربیٹھا۔راوی کہتے ہیں کہ: حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے یہ سناتوآپ بھی کھڑے ہوئے اورآپ نے بھی اسی طرح اذان واقامت کہی کہ دونوں میں (شروع کی چارتکبیرات کے علاوہ باقی کلمات کو) دودودفعہ کہااورتھوڑی دیربیٹھے۔(مصنف ابن ابی شیبہ ص۲۰۳ ج۱)

آپ کے چار مؤذن تھے

تنبیہ:...... جناب رسول خدا ﷺ کے چار مؤذن تھے: حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد القرظ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ ان میں بعض اذان میں ترجیع کرتے تھے اور اقامت کو دو دو بار کہتے تھے، اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ ترجیع نہیں کرتے تھے اور کلمات اقامت کے ایک ایک بار کہتے تھے، تو حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے بلال رضی اللہ عنہ کی

---

(۲)......بعض روایات میں ہے کہ: آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ: بلال (رضی اللہ عنہ) کو سکھادو۔ (طحاوی ص ۹۳ ج ۱۔ خلافیات بیہقی، بحوالۂ درایۃ ص ۱۱۵ ج ۱۔ صحیح ابوعوانۃ ص ۳۳۱ ج ۱)

(۳)......حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: آپ ﷺ نے انہیں اذان کے: ۱۹؍کلمات اور اقامت کے: ۱۷؍کلمات سکھائے۔ (ترمذی ص ۴۸ ج ۱۔ نسائی ص ۷۳ ج ۱۔ طحاوی ص ۹۵ ج ۱)

(۴)......حضرت بلال رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے سامنے اذان و اقامت کے کلمات دو دو دفعہ کہتے تھے۔ (دار قطنی ص ۲۴۲ ج ۱)

(۵)......حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: انہیں جس وقت نماز جماعت کے ساتھ نہ ملتی تو وہ خود ہی اذان و اقامت کہہ لیتے اور اقامت کے کلمات دو دو دفعہ کہتے تھے۔ (دار قطنی ص ۲۴۱ ج ۱)

(۶)......حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ اذان و اقامت کے کلمات دو دو دفعہ کہتے تھے۔ (طحاوی ص ۹۵ ج ۱)

(۷)......حضرت علی رضی اللہ عنہ اذان و اقامت کے کلمات دو دو دفعہ کہتے تھے۔ آپ ایک مؤذن کے پاس تشریف لائے جو اقامت کے کلمات ایک ایک مرتبہ کہتا تھا، آپ نے اس سے فرمایا کہ: تو اقامت کے کلمات کو دو دو دفعہ کیوں نہیں کر دیتا؟ (مصنف ابن ابی شیبہ ص ۲۰۶ ج ۱)

(۸)......حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اصحاب اذان و اقامت کے کلمات دو دو مرتبہ کہتے تھے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ص ۲۰۶ ج ۱)

(۹)......حضرت مجاہد رحمہ اللہ کے سامنے اقامت کے کلمات کو ایک ایک دفعہ کہنے کا تذکرہ آیا تو فرمایا کہ: یہ چیز امراء نے اپنی آسانی کے لئے پیدا کر لی ہے، اقامت کے کلمات تو دو دو ہی ہیں۔

(مصنف عبدالرزاق ص ۴۶۳ ج ۱۔ طحاوی ص ۹۵ ج ۱)

اقامت کو اختیار کیا، اور اہل مکہ نے ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کی اذان اور بلال کی اقامت اختیار کی، اور جناب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور اہل عراق نے بلال رضی اللہ عنہ کی اذان اور ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کی اقامت کو پسند کیا، اور جناب امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور اہل مدینہ نے اذان و اقامت دونوں بلال کی معمول بہا بنائیں، ان سب کے خلاف امام مالک رحمہ اللہ اس کے قائل ہیں کہ تکبیر کا اعادہ نہ کیا جائے اور ''قد قامت الصلوۃ '' ایک مرتبہ کہا جائے، [1] یہ سب علامہ عبدالحئ لکھنوی نے ''سعایہ'' (کے صفحہ ۲۳) میں ''مواھب اللدنیہ'' سے نقل کیا ہے:

وفی المواهب اللدنية : كان لرسول الله ﷺ أربعة مؤذنين : بلال وعبد الله ابن أم مكتوم وسعد القرظ وأبومحذورة رضی اللہ عنہم ، ومنهم من كان يرجع الأذان ويثنى الاقامة ، وبلال رضی اللہ عنہ لا يرجع ويفرد الاقامة ، فأخذ الشافعى باقامة بلال رضی اللہ عنہ ، وأهل مكة أخذوا بأذان أبي محذورة رضی اللہ عنہ واقامة بلال رضی اللہ عنہ ، وأخذ أبوحنيفة وأهل العراق بأذان بلال رضی اللہ عنہ واقامة أبي محذورة رضی اللہ عنہ، وأخذ أحمد وأهل المدينة بأذان بلال رضی اللہ عنہ واقامته ، وخالفهم مالك في موضعين اعادة التكبيرة وتثنية لفظ الاقامة ، انتهى ملخصاً،

پس ان تمام اقوال سے ظاہر ہے کہ ہر محدث و مجتہد کا مأخذ حدیث رسول خدا ﷺ اور

---

[1]...... مدارج النبوۃ'' میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ نے ان چار مؤذنوں کے حالات لکھ دیئے ہیں۔ (مدارج النبوۃ' اردو ص ۸۰۷ ج ۲)

علامہ عبدالحئ کتانی رحمہ اللہ نے ان چار حضرات کے علاوہ ان حضرات کے اسماء بھی ذکر کئے ہیں جنہوں نے کبھی کبھار آپ ﷺ کے سامنے اذان دی۔ جیسے حضرت زیاد بن حارث الصبائی اور حضرت عبدالعزیز بن الاعصم اور آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبان رضی اللہ عنہم نے حضور ﷺ کے سامنے ایک مرتبہ اذان دی۔ یہ سات مؤذن ہوئے، آٹھویں مؤذن حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ: آپ حضور ﷺ کے سامنے ممبر کے پاس اذان دیا کرتے تھے۔

(عہد نبوی کا اسلامی تمدن ص ۵۲)

افعال صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں، اور ہر زمانہ میں علماء معتبرین کتب متداولہ میں تمام افعال متدینہ کو بیان فرماتے آئے ہیں، لہذا ایک دوسرے پر طعن وتشنیع نہ کرے، اور ہر ایک اپنے مذہب پر عمل درآمد رکھے، فتدبر ولله الشكر على ما منّ علينا بالصراط المستقيم، ودينه القويم،

نماز میں بسم اللہ آہستہ پڑھنی چاہئے

(۳):سوال:......کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرح متین "زادكم الله تعالى شرفاً وتعظيماً لديه" اس مسئلہ میں کہ: مذہب حنفی میں تکبیر اور ثناء کے بعد جہری نماز میں بسم اللہ آہستہ پڑھتے ہیں جہر سے نہیں ادا کرتے، اس حکم کی دلیل میں کوئی حدیث قوی ہے یا نہیں؟ بينوا بياناً شافياً توجروا أجراً وافياً،

الجواب الوسيط بغير افراط وتفريط:......صورت مسئولہ میں احادیث نبویہ قویہ موجود ہیں، جیسا کہ علامہ شوکانی نے (صفحہ ۸۹) میں "منتقی" سے جس قدر احادیث صحیحہ روایت کی ہیں وہ سب مذہب حنفی کے موافق ہیں۔

عن أنس بن مالك رضي الله عنه قال: صليت مع النبي ﷺ وأبي بكر وعمر وعثمان رضي الله عنهم فلم أسمع أحدا منهم يقرأ بسم الله الرحمن الرحيم، رواه أحمد ومسلم،

وفی لفظ: " صليت خلف النبی ﷺ وخلف أبي بكر وعمر وعثمان رضي الله عنهم فكانوا لا يجهرون ببسم الله الرحمن الرحيم"، رواه أحمد والنسائی باسناد على شرط الصحيح،

ولأحمد ومسلم: "صليت خلف النبی ﷺ وأبي بكر وعمر وعثمان رضي الله عنهم وكانوا يستفتحون بالحمد لله رب العلمين، لا يذكرون بسم الله الرحمن الرحيم فی أول

قرائة ولا في آخرها "،

ولعبدالله بن أحمد فی مسند أبيه عن شعبة عن قتادة عن أنس ﷺ قال : صليت خلف رسول الله ﷺ وخلف ابی بکر وعمر وعثمان ﷺ فلم یکونوا یستفتحون القراء ة ببسم الله الرحمن الرحيم ، قال شعبة : فقلت لقتادة : أنت سمعته من انس ﷺ؟ قال : نعم ! نحن سألناه عنه ،

وللنسائی عن منصور بن زاذان عن أنس ﷺ قال : صلی بنا رسول الله ﷺ فلم يسمعنا قراء ة بسم الله الرحمن الرحيم ، وصلی بنا ابوبکر وعمر ﷺ فلم نسمعها منهما،

انس بن مالک ﷺ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے ہمراہ نبی ﷺ اور ہمراہ ابی بکر وعمر اور عثمان ﷺ کے نماز پڑھی اوران میں سے کسی کو بسم اللہ پڑھتے ہوئے نہیں سنا، روایت کیا اس کو احمد اور مسلم نے۔

اورایک روایت میں ہے کہ: میں نے نبی ﷺ اورابی بکراور عمراور عثمان ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی، اور یہ سب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہر سے نہیں پڑھتے تھے۔ روایت کیا اس کو احمد اور نسائی نے ایسی اسناد سے کہ وہ اسناد شرط صحیح کے موافق ہے۔

اور احمد اور مسلم کی روایت میں ہے کہ: میں نے نبی ﷺ اور ابی بکر اور عمر اور عثمان ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی، اور الحمد للہ رب العالمین سے قرأت شروع کرتے تھے (یعنی جہری نماز میں بسم اللہ آہستہ پڑھ کر الحمد للہ سے جہر شروع کرتے تھے) اور نہیں ذکر کرتے تھے بسم اللہ کو نہ اول قرأت میں اور نہ آخر قرأت میں۔

اور عبداللہ بن احمد کے والد کے مسند میں شعبہ سے روایت ہے اور قتادہ سے، اور وہ انس ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ: انس ﷺ نے فرمایا کہ: میں نے رسول خدا ﷺ کے ہمراہ نماز

پڑھی اور بسم اللہ پڑھتے ہوئے نہیں سنا، اور ابو بکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ نماز پڑھی اور نہیں سنی بسم اللہ ان دونوں سے۔

اور ''نیل الاوطار'' میں اسی حدیث کے تحت میں مذکور ہے کہ ان تمام روایتوں میں سے روایت '' فکانوا لا یجهرون ''کی ابن حبان اور دار قطنی اور طحاوی اور طبرانی نے تخریج کی ہے، اور ابی خزیمہ کی ایک روایت میں ہے کہ آہستہ پڑھتے تھے۔

ورواية : " فكانوا لا يجهرون "، أخرجها ايضاً ابن حبان و الدار قطنی والطحاوی والطبرانی ، وفی لفظ لأبي خزيمة : " كانوا يسرّون " وعن ابن عبدالله بن مغفل رضی اللہ عنہ قال : سمعنی أبي وأنا أقول بسم الله الرحمن الرحيم ، فقال : يا بنی ! اياک والحدث ، قال : ولم أر من أصحاب رسول الله ﷺ رجلا كان أبغض إليه الحدث فی الاسلام منه ، فإنی صليت مع رسول الله ﷺ ومع ابی بكر ومع عمر ومع عثمان رضی اللہ عنہم فلم أسمع أحدا منهم يقولها ' فلا تقلها ، إذا أنت قرأت فقل : الحمد لله رب العٰلمين ، رواه الخمسة إلا أباداؤد،

یعنی عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے نے فرمایا کہ: میرے والد نے مجھ کو ''بسم الله الرحمن الرحیم ''جہر سے پڑھتے ہوئے سنا تو فرمایا کہ: اے بیٹے! بدعت سے بچ، اور فرمایا کہ: میں نے اصحاب رسول اللہ ﷺ میں سے کسی کو ایسا نہیں دیکھا کہ وہ بدعت سے زیادہ اور کسی چیز سے بغض رکھتا ہو، اور میں نے رسول خدا ﷺ اور ابی بکر اور عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے ہمراہ نماز پڑھی ہے، اور کسی کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا (یعنی بسم اللہ زور سے پڑھتے ہوئے نہیں سنا) پس تو بھی نہ کہا کر، اور جب تجھ کو قرأت پڑھنی ہو تو کہہ ''الحمد لله رب العالمين ''۔ اس روایت کو پانچوں نے روایت کیا مگر ''ابوداؤد'' نے۔

اور ''ترمذی'' نے اس حدیث کو حسن کہا ہے، اور اس پر اکثر اہل علم اصحاب رسول اللہ

ﷺ کا عمل ہے، ان میں سے ابوبکر اور عمر اور عثمان اور علی رضی اللہ عنہم وغیرہم ہیں، اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد تابعین کا بھی اس پر عمل رہا، اور اسی کے قائل ہیں سفیان ثوری اور ابن مبارک اور احمد اور اسحاق رحمہم اللہ، ان میں سے کوئی بسم اللہ کو جہر سے پڑھنے کا قائل نہیں، سب کہتے ہیں کہ: نماز پڑھنے والا اپنے دل میں آہستہ پڑھے، اور یہی امام اعظم رحمہ اللہ کا مذہب ہے، اور ترمذی کی عبارت یہ ہے:

قال أبوعيسى : حديث عبدالله بن مغفل رضی اللہ عنہ حديث حسن ، والعمل عليه عند أكثر أهل العلم من أصحاب النبی ﷺ : منهم أبوبكر وعمر وعثمان وعلی رضی اللہ عنہم وغيرهم ، ومن بعدهم من التابعين ، وبه يقول سفيان الثوری وابن المبارك وأحمد واسحٰق ، لا يرون أن يجهر ببسم الله الرحمن الرحيم ، قالوا : ويقولها فی نفسه ، هذا ما ظهر لی ، والله أعلم بالصواب ، وعنده علم الكتاب۔ [1]

[1]...... چند اور احادیث یہ ہیں:

(۱)...... حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما: بسم اللہ، اعوذ باللہ، اور آمین اونچی آواز سے نہیں کہتے تھے۔ (معجم طبرانی ص۲۶۳ ج۹)

(۲)...... حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایسے شخص کے بارے میں جو بسم اللہ اونچی آواز سے پڑھتا تھا، فرمایا کہ: یہ گنوار پن ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ خود اور ان کے اصحاب میں سے کوئی بھی بسم اللہ اونچی آواز سے نہیں پڑھتا تھا۔ (کتاب الآثار للامام ابی حنیفہ ص۲۲)

(۳)...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بسم اللہ اونچی آواز سے پڑھنے کے متعلق فرمایا کہ: یہ تو گنواروں کا فعل ہے۔ (طحاوی ص۱۴۰ ج۱)

(۴)...... حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' اونچی آواز سے پڑھنا بدعت ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ص۴۱۱ ج۱)

(۵)...... حضرت امام وکیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''بسم الله الرحمن الرحيم'' اونچی آواز سے پڑھنا بدعت ہے۔ (تذکرۃ الحفاظ ص۳۰۹ ج۱)

نماز میں زیر ناف ہاتھ باندھنا

(۴):سوال:......کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین! اس صورت میں کہ مذہب حنفی کے مطابق نماز میں دونوں ہاتھ زیر ناف باندھنے کی کوئی دلیل احادیث سے ثابت ہے یا نہیں؟ بینوا بیاناً شافیاً توجروا أجراً وافیاً،

الجواب الوسیط بغیر افراط وتفریط:......صورت مذکورہ میں موافق مذہب حنفیہ کے زیر ناف ہاتھ باندھنے کی حدیثیں موجود ہیں، اور''جامع الترمذی''میں بیان کیا ہے کہ زیر ناف یا فوق الصدر باندھنے میں اقوال صحابہ رضی اللہ عنہم مختلف ہیں، بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ: دونوں ہاتھ فوق السرہ باندھے، اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ: تحت السرہ باندھے، اور وہ عبارت یہ ہے:

والعمل على هذا عند أهل العلم من أصحاب النبى ﷺ والتابعين ومن بعدهم يرون أن يضع الرجل يمينه على شماله فى الصلوة ، ورایٰ بعضهم أن يضعهما فوق السرة ، ورای بعضهم أن يضعهما تحت السرة ، وكل ذلك أوسع،

پس''ترمذی''کی اس عبارت سے واضح ہوا کہ فوق السرہ اور تحت السرہ دونوں طرح جائز ہے، پھر ان دونوں قولوں میں سے جس قول کو کسی وجہ سے ترجیح ہو وہ دوسرے سے اولیٰ بالعمل ہوگا۔ بعد تفحص کے معلوم ہوا کہ''ابوداؤد''میں حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ تحت السرہ کے باب میں منقول ہے، اور وہ حدیث بنقل شارح ترمذی ابوالطیب کے یوں ہے:

ويؤيده ما رویٰ أبوداؤد عن عبدالرحمن بن اسحق عن زياد بن يزيد عن أبي جحيفة أن عليا رضي الله عنه قال : " السّنة وضع الكفّ على الكفّ في الصّلوة تحت السّرّة "

حدیث علی: پر موقوف وضعیف ہونے کے اشکالات اوران کے جوابات

اگر کوئی کہے کہ: یہ حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے اور حدیث موقوف حجت نہیں ہے،تو جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض لغو ہے، کیونکہ صحابی جب کہے کہ ” السنة کذا و کذا“ تو اس سے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہوتی ہے اور کسی کی سنت مراد نہیں ہوتی، اور جب کسی اور کی سنت بیان کرنی ہوتی ہے تو اس کو غیر کی طرف منسوب کرتے ہیں، مثلاً سنت ابی بکر رضی اللہ عنہ یا سنت عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ، علامہ عینی نے حاشیہ ہدایہ میں اس کی تصریح کردی ہے جس کا جی چاہے دیکھ لے۔

اور اگر کوئی کہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے، تو جواب دیا جائے گا کہ: حدیث ضعیف متفرق اسنادوں سے مروی ہو تو درجۂ حسن کو پہنچ جاتی ہے، اور یہ حدیث چند طرق سے مروی ہے، لہذا درجۂ حسن کو پہنچ گئی ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ: حدیث ضعیف اس وقت حجت نہیں ہوسکتی جب کوئی قوی حدیث اس کے معارض ہو، مگر ہم کہتے ہیں کہ: قوی تو ایک طرف رہی اس کے برابر بھی کوئی حدیث پیش کرو۔

دوسری سند حدیث مذکور کی:

وقال : عن جرير الضبى قال : رأيت عليا رضی اللہ عنہ يمسک شماله بيمينه على الرسغ فوق السرة ، وروى عن سعيد بن جبير فوق السرة ، وقال أبومجلز : تحت السرة ، وروى عن أبي هريرة : وليس بالقوى ، وعن أبي وائل قال : أبوهريرة أخذ الأكف على الأكف فى الصلوة تحت السرة ،

ابن جوزی نے ”تنقیح“ میں ذکر کیا ہے کہ: امام احمد رحمہ اللہ سے دو روایتیں ہیں: ایک

تحت الصدر کی اور دوسری فوق الصدر کی، مگر چاروں اماموں میں سے کسی نے روایت فوق الصدر کونہیں لیا، اگر یہ روایت ان کے نزدیک صحیح ہوتی تو کیوں اس پر عمل نہ کرتے ؟ خاص کر امام احمد رحمہ اللہ جنہوں نے اس روایت کو اپنی مسند میں بروایت ھلب رحمہ اللہ کے روایت کیا ہے، اور جب کوئی راوی کسی حدیث کو روایت کر کے اس کے خلاف عمل کرے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ روایت قابل عمل نہیں جیسا کہ شرح ابی الطیب کے (صفحہ۲۷۶) میں ہے:

وقال ابن الجوزی فی التنقیح : وعن الإمام أحمد روایتان : الوضع تحت السرة والوضع فوقها ، انتهى، فلم يأخذ أحد من الأئمة الأربعة حديث الوضع على الصدر فلو كان عندهم صحيحا كيف تركوا العمل به خصوصاً الأمام أحمد الذي رواه فى مسنده برواية هلب؟ وإذا روى الراوى حديثا وعمل بخلافه لم يؤخذ برواية تلك،

اور شرح ابی الطیب ترمذی میں ایک جواب اور بھی ہے، وہ یہ ہے کہ: حدیث علی رضی اللہ عنہ میں ضعف عبدالرحمٰن بن اسحاق واسطی کی وجہ سے آیا ہے، اوران کے ضعف سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ حدیث امام ابوحنیفہ اورامام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک بھی ضعیف ہوجائے، کیونکہ یہ دونوں صاحب عبدالرحمٰن پر مقدم ہیں، عبارت یہ ہے:

” ضعف عبدالرحمن لا يلزم منه ضعف الحديث عند الإمام أبي حنيفة ومالک لتقدمهما علیه “

اس عبارت کے بعد ترمذی کی اسی شرح ابی الطیب میں ایک عبارت جامعہ ایسی ہے جس سے ناظرین مصنفین یقین کرلیں گے کہ اس حدیث کی سند بہت قوی ہے اور بالاتفاق صحیح ہے، اور یہ بھی ثابت ہوجائے گا کہ حدیث وضع الیدین زیر ناف کی تمام احادیث

مختلفہ سے قوی ہے، اور فوق الصدر یا فوق السرہ کی حدیث سے تحت السرہ کی حدیث قوی اور قابل احتجاج ہے، چنانچہ وہ عبارت یہ ہے:

ثم اطلعنا على حديث صحيح بحمد الله تعالىٰ وهو سند المذهب ، ومؤيد لحديث على رضي الله عنه وهو ما أخرجه ابن ابى شيبة فى مصنفه ، قال : حدثنا وكيع عن موسى بن عمير عن علقمة ابن وائل بن حجر عن أبيه قال : رأيت النبى صلى الله عليه وسلم وضع يمينه على شماله فى الصلوة تحت السرة ، انتهى ،

یعنی پھر ہم بحمد اللہ مطلع ہوئے ایک حدیث صحیح پر کہ وہ حدیث مذہب کی سند ہے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث کی تائید کرتی ہے، اور وہ حدیث وہ ہے جس کو ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں روایت کیا ہے، انہوں نے کہا: حدیث بیان کی ہم سے وکیع نے موسیٰ بن عمیر سے' اور انہوں نے روایت کی علقمہ بن وائل بن حجر سے' اور انہوں نے روایت کی اپنے باپ سے' انہوں نے فرمایا کہ: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر ناف کے نیچے رکھا۔

دوسری عبارت یہ ہے: **فهذا حديث صحيح سنداً ومتناً تقوم به حجة ، فلا وجه لمن قال : ليس للحنفيين دليل فى هذه المسئلة ،**

یعنی یہ حدیث از روئے سند اور متن کے صحیح ہے اور اس سے حجت قائم ہوسکتی ہے، پس جو کہتے ہیں کہ حنفیوں کی اس مسئلہ میں کوئی دلیل نہیں ہے ان کے اس قول کی کوئی وجہ نہیں ہے، **فافهم واغتنم هذا ، لأنك لا تجد حديثا قويا منه فى هذا الباب**[1]

---

[1]...... چند اور احادیث یہ ہیں:

(۱)......حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نماز میں اپنا

امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھنے کے دلائل

(۵):سوال:......ماقولکم دام فضلکم ایها العلماء العظام والفقهاء الکرام زادکم اللہ تعالیٰ شرفاً وتعظیما لدیه !اس حکم میں کہ سورۂ فاتحہ امام کے پیچھے جہری اور سری نمازوں میں موافق مذہب حنفی کے نہ پڑھنے کی کوئی دلیل قرآن وحدیث میں ہے یانہیں؟ اور امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھنے میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین وغیرہم کا بھی مثل امام اعظم صاحب رحمہ اللہ کے عمل تھا یانہیں؟ بینوا بیاناً شافیاً توجروا أجراً وافیاً،

الجواب الوسیط بغیر افراط وتفریط :......صورت مذکورہ میں امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھنے پر آیت قرآنی اور حدیث نبوی دونوں موجود ہیں، آیت قرآنی یہ ہے: ﴿ واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلکم ترحمون﴾ یعنی ’’جبکہ قرآن شریف پڑھا جاوے تو سنو تم اس کو اور چپ رہو تا کہ تم رحم کئے جاؤ‘‘۔

دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر ناف کے نیچے رکھتے تھے۔

(۲)......حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: نماز میں ہتھیلیوں کو ہتھیلیوں پر ناف کے نیچے رکھا جائے۔(ابوداؤد نسخہ ابن الاعرابی ص۲۸۰ ج۱،محلی ابن حزم ص۳۰ ج۳)

(۳)......حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: تین چیزیں انبیاء علیہ الصلوۃ والسلام کے اخلاق میں سے ہیں: (۱): افطار میں جلدی کرنا۔(۲): سحری دیر سے کھانا۔(۳): ہتھیلی کو ہتھیلی پر ناف کے نیچے رکھنا۔(منتخب کنز العمال برمسند احمد ص۳۵۰ ج۶)

(۴)......حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: تین چیزیں نبوت کے اخلاق میں سے ہیں: (۱): افطار میں جلدی کرنا۔(۲): سحری میں دیر کرنا۔(۳): اور دوران نماز دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر ناف کے نیچے رکھنا۔(محلی ابن حزم ص۳۲۰ ج۳)

(۵)......حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: نمازی نماز میں دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر ناف کے نیچے رکھے۔(مصنف ابن ابی شیبہ ص۳۹۱ ج۱)

اوراس بات پر چند حدیثیں دلالت کرتی ہیں کہ یہ آیت قرأت خلف الامام کے بارے میں اتری ہے، چنانچہ ''سعایہ'' (کے صفحہ ۲۹۱) میں ہے:

فاخرج البیهقی عن مجاهد ، قال : کان رسول الله ﷺ یقرأ فی الصلوة فسمع قرائة فتی من الأنصار ، فنزلت ﴿واذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وانصتوا لعلکم ترحمون﴾

یعنی روایت کیا بیہقی نے مجاہد سے، رسول خدا ﷺ نماز میں قراءت فرمارہے تھے کہ سنی آپ ﷺ نے قرأت ایک جوان کی انصار میں سے، اتری آیت ﴿واذا قرئ القراٰن﴾ الخ،

واخرج عن أحمد ، قال : أجمع الناس علی أن هذه الآیة نزلت فی الصلوة ،

یعنی منقول ہے امام احمد سے کہ انہوں نے فرمایا: اجماع کیا ہے لوگوں نے اس پر کہ یہ آیت نماز کی شان میں اتری ہے۔

وأخرج الدار قطنی فی سننه عن عبدالله بن عامر :حدثنی زید بن اسلم عن أبیه عن أبي هریرة رضی الله عنه فی هذه الآیة قال : نزلت في رفع الأصوات وهم خلف رسول الله ﷺ في الصلوة،

یعنی دارقطنی نے اپنی مسند میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی آیت کریمہ کے بارے میں روایت کیا ہے کہ: نازل ہوئی یہ آیت درباره بلند کرنے آواز کے جبکہ وہ حضرت ﷺ کے پیچھے نماز میں ہوتے تھے۔

وأخرج ابن مردویه فی تفسیره عن موسی بن عبدالرحمن المسروقی : ثنا أبوأسامة عن سفیان عن أبي المقدام هشام بن زیاد عن معاویة بن قرة قال : سألت بعض أشیاخنا من أصحاب رسول الله ﷺ قال المسروقی : أحسبه قال عبدالله بن مغفل رضی الله عنه. قلت له کل من سمع القرآن وجب له الاستماع والانصات ، قال : انما

نزلت هذه الآية ﴿واذا قرئ القراٰن﴾ فی القرائة خلف الإمام ، إذا قرأ الإمام فاستمع له وانصت ،كذا أورده الزيلعی فی تخريج أحاديث الهداية،

یعنی تفسیر ابن مردویہ میں بسند مذکور معاویہ بن قرہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: کہا معاویہ بن قرہ نے کہ: میں نے اپنے بعض شیوخ سے جو صحابی تھے سوال کیا، مسروق نے کہا کہ: میرے خیال میں بعض شیوخ سے عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ ہیں' کہ جو کوئی قرآن سنے اس پر خاموش رہنا اور سننا واجب ہے، انہوں نے جواب دیا کہ آیت ﴿واذا قرئ القراٰن﴾ الخ اسی کے بارے میں تو اتری ہے، جب امام قرأت کرے تو سنو اور چپ رہو، انتہی۔

یہ آیت کا مختصر بیان ہے، اگر کسی کو اس میں کچھ کلام ہو یا زیادہ تصریح کی حاجت ہو تو میرا رسالہ "غنية المهتدی فی قرأة المقتدی" جو خاص اسی بارہ میں ہے ملاحظہ فرما لے۔

ہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ اگر فرض کیا جاوے کہ یہ آیت کریمہ قرأت خلف الامام کے بارے میں نازل نہیں ہوئی، بلکہ خارج نماز کے بارہ میں نازل ہوئی ہے، تاہم کچھ مضائقہ نہیں ہے، کیونکہ یہ بات اپنے موقع پر ثابت ہو چکی ہے کہ اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے نہ خصوصیت سبب کا، اور عموم الفاظ آیت کریمہ کے اسی کو مقتضی ہیں کہ قرأت قرآن کے وقت استماع کیا جاوے خواہ داخل نماز ہو یا خارج نماز، پس قرأت فاتحہ بحالت قرأت امام ضرور ممنوع ہوگی، کیونکہ وہ استماع میں مخل ہے۔

اب ان حدیثوں کا بیان کیا جاتا ہے جن سے قرأت خلف الامام کی ممانعت ثابت ہوتی ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال : " انما جعل الإمام ليؤتم به ، فإذا كبّر فكبّروا ، فإذا قرأ فانصتوا "، رواه الخمسة إلا الترمذي ، وقال مسلم هو صحيح،

یعنی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: امام اسی لئے مقرر کیا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے، پس جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو، اور جب امام پڑھے تو تم چپ رہو۔ روایت کیا اس حدیث کو احمد اور مسلم اور ابوداؤد اور نسائی اور ابن ماجہ نے، اور مسلم نے کہا کہ: یہ حدیث صحیح ہے۔

اور اگر کوئی کہے کہ: اس حدیث میں جملہ ”وإذا قرأ فانصتوا“ مذہب حنفی کی دلیل ہوسکتی ہے، مگر اس زیادتی کو ابوداؤد نے غیر محفوظ کہا ہے، اور کہا ہے کہ: ہمارے نزدیک یہ ابی خالد کا وہم ہے، تو جواب اس کا طرح دیا جائے گا کہ منذری شارح ابوداؤد نے ابوداؤد کے قول کے جواب میں کہا ہے کہ: ابوداؤد کے قول میں نظر ہے، کیونکہ یہ ابوخالد سلیمان بن حبان احمر ہیں، اور یہ ایسے ثقہ ہیں کہ بخاری اور مسلم نے اپنی اپنی صحیحین میں ان کے قول سے حجت پکڑی ہے، اور زیادتی ثقہ کی مقبول ہے، اس کے علاوہ ابوخالد تنہا اس جملہ کی روایت کرنے والے بھی نہیں ہیں، بلکہ ابوسعید محمد بن سعد انصاری اشہلی مدنی نزیل بغداد نے بھی ان کی متابعت کی ہے، اور انہوں نے ابن عجلان سے سنا ہے، اور یحی بن معین اور محمد بن عبداللہ مخزومی اور ابوعبدالرحمٰن نسائی نے ان کی توثیق کی ہے، اور نسائی نے اپنی سنن میں حدیث ابی خالد الاحمر اور حدیث محمد بن سعد سے اس زیادتی کو روایت کیا ہے، اور مسلم نے اس زیادتی کی حدیث ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ اور حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے تصحیح کی ہے جیسا کہ علامہ شوکانی نے ”نیل“ (جلد ثانی کے صفحہ ۱۰۷) اور علامہ عبدالحیٔ نے سعایہ (کے صفحہ ۲۹۲) میں تصریح کی ہے، اور وہ عبارت یہ ہے:

زيادة قوله ” وإذا قرأ فانصتوا “ قال أبو داؤد : ليست بمحفوظة ، والوهم عندنا من أبي خالد ، قال المنذري : وفيما قاله نظر ، فإن أباخالد هذا هو سليمان بن حبان

الأحمر ، وهو من الثقات الذين احتج البخاری ومسلم بحديثهم فی صحيحيهما ، ومع هذا فلم يتفرد بهذه الزيادة ، بل قد تابعه عليها ابوسعيد محمد بن سعد الانصاری الاشهلی المدنی نزيل البغداد ، وقد سمع من ابن عجلان وهو ثقة ، و ثقه يحی بن معين ومحمد بن عبد اللّٰه المخزومی وابوعبدالرحمن النسائی ، وقد اخرج هذه الزيادة النسائی فی سننه من حديث ابی خالد الاحمر ، ومن حديث محمد بن سعد، وقد اخرج مسلم فی الصحيح هذه الزيادة فی حديث ابی موسی الاشعری رضی اللہ عنہ من حديث جرير بن عبدالحميد عن سليمان التيمی عن قتادة ، قال المنذری : ولم يؤثر عند مسلم تفرد سليمان بذلك لثقته وحفظه ، وصحح هذه الزيادة يعنی مسلما ، قال ابواسحٰق صاحب مسلم : قال أبوبكر بن أخت ابی النضر : هذا الحديث لمسلم ای طحن فيه ، فقال : مسلم يزيد احفظ من سليمان ، فقال ابوبكر : فحديث أبيهريرة رضی اللہ عنہ هو صحيح ، يعنی " فاذا قرأ فانصتوا " فقال : هو عنده صحيح ، فقد صحح مسلم هذه الزيادة من حديث أبي موسی الاشعری رضی اللہ عنہ ومن حديث أبيهريرة رضی اللہ عنہ ، انتهی،

وعن ابی موسی رضی اللہ عنہ قال: ان رسول اللّٰه ﷺ خطبنا ، فبين لنا سنتنا وعلمنا صلا تنا، فقال: " إذا صليتم فاقيموا صفوفكم ثم ليؤمكم أحدكم ، فإذا كبّر فكبّروا، وإذا قرأ فانصتوا، وإذا قال غير المغضوب عليهم ولا الضالين فقولوا: اٰمين ، يجبكم اللّٰه ، وإذا كبر وركع فكبروا واركعوا "، رواه احمد ومسلم والنسائی و أبوداؤد،

یعنی ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہا انہوں نے کہ: رسول خدا ﷺ نے خطبہ پڑھا تو ہمارے لئے سنتیں اور نماز کے طریقے بیان فرمائے، پس فرمایا کہ: جب تم نماز پڑھو

توصفیں درست کرو، اورتم میں سے ایک شخص امام بن جائے، پھر جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو، اور جب وہ پڑھے تو تم چپ رہو، اور جب "غیر المغضوب علیھم ولا الضالین" کہے تو تم آمین کہو خدا قبول کرے گا، اور جب تکبیر کہہ کر رکوع کرے تو تم بھی تکبیر کہہ کے رکوع کرو۔ روایت کیا اس حدیث کو احمد اور مسلم اور نسائی اور ابوداؤد نے۔

وعن جابر رضي الله عنه قال : قال رسول الله ﷺ : من كان له إمام فان قرأة الإمام له قرأة ، رواه ابن ماجه،

یعنی جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ: جو امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قرأت اس کے واسطے قرأت ہے۔ روایت کیا اس کو ابن ماجہ نے۔

ف:......اگر کوئی اعتراض کرے کہ اس حدیث میں ایک راوی جابر جعفی ہے اور وہ ضعیف ہے، اور حدیث ضعیف حجت ہونے کے قابل نہیں، تو جواب اس کا یہ ہے کہ اول تو جابر جعفی پر جرح مبہم ہے، باوجود اس کے سفیان ثوری اور شعبہ وغیرہما نے ثقہ بھی کہا ہے، تو اس حدیث کے مقبول ہونے میں کچھ کلام نہیں جیسا کہ "میزان الاعتدال" میں ہے:

وفيه جابر الجعفى متكلم فيه ، قد وثقه سفيان الثورى وشعبة وغيرهما ، هكذا فى ميزان الاعتدال ، قاله فى التعليق الممجد : (وقال محمد) أخبرنا أبوحنيفة قال حدثنا أبوالحسين موسى بن أبي عائشة عن عبد الله بن شداد بن الهاد عن جابر بن عبد الله رضي الله عنه عن النبى ﷺ: ((من صلى خلف الامام فان قرأة الإمام له قرأة)) ، رواه محمد فى المؤطا،

ترجمہ:......کہا امام محمد رحمہ اللہ نے: حدیث بیان کی ہم سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے، انہوں نے ابوالحسن موسیٰ بن ابی عائشہ سے، انہوں نے عبداللہ بن شداد بن الہاد سے اور انہوں

نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ جو امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قرأت اس کے واسطے قرأت ہے۔ امام محمد نے مؤطا میں یہ حدیث روایت کی ہے۔

اگر کوئی کہے کہ: اس حدیث میں ابوحنیفہ اور موسی بن ابی عائشہ کو دارقطنی نے ضعیف کہا ہے، تو جواب یہ ہے کہ: دارقطنی کا یہ قول ضعیف ہے قابل اعتبار نہیں، چنانچہ علامہ عینی نے بنایہ حاشیہ ہدایہ میں لکھا ہے کہ حدیث ابوحنیفہ کی صحیح ہے، کیونکہ ابوحنیفہ تو ابوحنیفہ ہی ہیں، یعنی ایک مجتہد، عابد، متقی، ثقہ اور بے نظیر ہیں، باوجود اس کے تابعی اور خیر القرون میں داخل ہیں جیسا کہ سوال اول کے جواب میں بیان ہو چکا ہے، اور مشرق سے مغرب تک اور جنوب سے شمال تک ان کا مقبول ومعتمد ہونا معروف ومشہور ہے۔ اور موسی بن ابی عائشہ کوفی ثقہ لوگوں میں سے ہیں، اور ثبات اور رجال صحیحین میں سے ہیں۔ اور عبداللہ بن شداد کبار شامیین اور ثقات میں سے ہیں، چنانچہ ''تعلیق الممجد'' میں علامہ عبدالحیٔ لکھنوی مرحوم نے ''بنایہ حاشیہ ہدایہ'' سے یہ عبارت نقل کی ہے:

قال العينى فى البناية : حديث أبي حنيفة حديث صحيح ، إمام أبو حنيفة فأبو حنيفة ، وموسى ابن أبى عائشة الكوفى من الثقات ، الاثبات من رجال الصحيحين ، وعبد الله بن شداد من كبار الشاميين وثقاتهم ، وعن ابن عمر رضي الله عنه أنه كان إذا سئل هل يقرأ مع الإمام ؟ قال : إذا صلى أحدكم مع الإمام فحسبه قرأة الإمام ، و كان ابن عمر لا يقرأ مع الإمام ، رواه مالك فى المؤطا،

یعنی ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب ان سے پوچھا جاتا تھا کہ کیا امام کے پیچھے قرأت کی جائے؟ تو فرماتے تھے کہ: جب تم میں سے کوئی امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قرأت اس کو کافی ہے، اور ابن عمر رضی اللہ عنہ امام کے پیچھے نہیں پڑھتے تھے۔ روایت کیا اس کو

مالک نے مؤطا میں۔

وعن جابر بن عبد الله رضی اللہ عنہ يقول : من صلى ركعة لم يقرأ فيها بإم القرآن فلم يصل إلا وراء الإمام ، رواه مالك والترمذى ، وقال : هذا حديث حسن صحيح ،

اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ: جس نے ایک رکعت بھی بغیر الحمد کے پڑھی تو اس نے نماز نہیں پڑھی، مگر جبکہ امام کے پیچھے ہو تو نہ پڑھے۔ روایت کیا اس کو ترمذی نے، اور ترمذی نے کہا کہ: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

وعن ابى سعيد الخدرى رضی اللہ عنہ مرفوعا : من كان له إمام فقرأة الإمام قرأة ، رواه الطبرانى فى معجمه الاوسط،

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوعا روایت ہے کہ: جو امام کے پیچھے ہو تو قرأت امام کی اس کے واسطے قرأت ہے۔

وعن عطاء بن يسار أنه سأل زيد بن ثابت رضی اللہ عنہ عن القرأة مع الإمام ؟ فقال : لا قرأة مع الإمام فى شىء ، رواه مسلم فى باب سجود التلاوة،

اور عطاء بن یسار رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ: انہوں نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ امام کے پیچھے قرأت کا کیا حکم ہے؟ تو فرمایا کہ: امام کے پیچھے کسی نماز میں قرأت نہیں۔ روایت کیا اس کو مسلم نے "باب سجود التلاوة" میں۔

یہی مذہب ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب کا، اور یہی قول ہے جابر رضی اللہ عنہ، عبداللہ رضی اللہ عنہ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا، اور اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، اور اسی کے قائل ہیں سفیان ثوری اور ابن عیینہ اور ابن ابی لیلیٰ اور حسن بن صالح اور ابراہیم النخعی اور اصحاب ابن مسعود رحمہم اللہ جیسا کہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے 'استذکار'

اور ''تمہید'' میں بیان کیا ہے۔ [1]

---

[1]...... چند اور روایتیں یہ ہیں:

(۱)...... حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔ (کتاب القرأة للبیہقی ص۱۱۳)

(۲)...... حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ایک شخص نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ میں امام کے پیچھے قرأت کروں یا خاموش رہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: خاموش رہو، کیونکہ تمہیں امام کی قرأت ہی کافی ہے۔ (کتاب القرأة للبیہقی ص۱۶۳)

(۳)...... حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ: جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو اس کی طرف کان لگائے رہو اور خاموش رہو، کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ: جو شخص خاموش رہے اور اسے سنائی نہ دے اس کے لئے ایسا ہی اجر ہے جیسا کہ اس شخص کے لئے جسے سنائی دے اور وہ خاموش رہے۔ (کتاب القرأة للبیہقی ص۱۱۳)

(۴)...... حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک جہری نماز میں سے فارغ ہوئے تو فرمایا: کیا تم میں سے کسی نے ابھی میرے ساتھ قرأت کی ہے؟ ایک صاحب بولے: جی ہاں یا رسول اللہ! میں نے قرأت کی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: جب ہی تو میں (اپنے دل میں) کہہ رہا تھا کہ میرے ساتھ قرآن کریم کی قرأت میں منازعت کیوں ہو رہی ہے؟ اس ارشاد کے بعد جن نمازوں میں آپ جہر سے قرأت کیا کرتے تھے، لوگوں نے آپ ﷺ کے پیچھے قرأت ترک کر دی تھی۔

(مؤطا امام مالک ص۶۹)

نوٹ:...... اس مضمون کی کئی روایتیں ہیں۔ دیکھئے! ترمذی ص ۷۱ ج ۱۔ ابو داؤد ص ۱۲۰ ج ۱۔ نسائی ص ۱۰۶ ج ۱۔ مسند احمد ص ۳۴۵ ج ۵۔ ابن ماجہ ص ۶۱۔ طحاوی ص ۱۴۹ ج ۱۔ الجوہر النقی ص ۱۶۲ ج ۲۔ کتاب القرأة للبیہقی ص ۱۲۵۔

(۵)...... حضرت جابر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ: آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے امام کے پیچھے نماز پڑھی تو امام کی قرأت ہی اس کی قرأت ہے۔

(مؤطا امام محمد ص ۹۵۔ مسند احمد منیع، بحوالۂ فتح القدیر ص ۲۹۵ ج ۱)

(۶)...... حضرت بلال رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں امام کے پیچھے

قرأت نہ کروں۔(کتاب القرأة للبیھقی ص١٧٥)

سری نماز میں بھی امام کے پیچھے قرأت نہیں ہے،اس پر چند احادیث

(١)......حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھی تو ایک صاحب آپ کے پیچھے:﴿سبح اسم ربک الاعلی﴾ پڑھنے لگے،جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا:تم میں کس نے قرأت کی ہے؟ یا تم میں سے کون قاری ہے؟ایک صاحب بولے:میں،آپ ﷺ نے فرمایا:مجھے خیال ہوا کہ تم میں سے کوئی مجھے خلجان میں ڈال رہا ہے۔

(مسلم شریف ص١٧٢ ج١۔نسائی ص١٠٦ ج١)

(٢)......ایک روایت میں ظہر یا عصر کا ذکر ہے،اور اس میں ہے کہ:ایک صاحب بولے:میں،اور میری نیت ثواب کے سوا کچھ نہ تھی۔(نسائی ص١٠٦)

(٣)......حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے:آپ ﷺ نے پوچھا:میرے پیچھے﴿سبح اسم ربک الاعلی﴾کس نے پڑھی ہے؟کوئی نہ بولا،آپ ﷺ نے تین دفعہ یہ سوال کیا،ایک صاحب بولے:میں نے یارسول اللہ!آپ ﷺ نے فرمایا:میں نے دیکھا کہ تو مجھے قرأت قرآن کے متعلق خلجان میں ڈال رہا ہے،یا فرمایا کہ:کش مکش میں ڈال رہا ہے۔تم میں سے جو بھی امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قرأت ہی اس کی قرأت ہے۔(کتاب القرأة للبیھقی ص١٢٥)

(۴)......حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:رسول اللہ ﷺ نے ایک دن ظہر کی نماز پڑھائی تو ایک صاحب اپنے جی ہی جی میں آپ ﷺ کے ساتھ قرأت کرنے لگے،نماز پوری ہوئی تو حضور ﷺ نے پوچھا کہ:کیا تم میں سے کسی نے میرے ساتھ قرأت کی ہے؟تین دفعہ آپ ﷺ نے یہ سوال کیا،ایک صاحب بولے:جی ہاں یارسول اللہ میں﴿سبح اسم ربک الاعلی﴾پڑھ رہا تھا،آپ ﷺ نے فرمایا:کیا ہوگیا کہ مجھے قرآن کی قرأت میں کشمکش میں ڈالا جاتا ہے؟کیا تمہیں امام کی قرأت کافی نہیں ہے؟امام تو بنایا ہی اس لئے جاتا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے،لہذا جب وہ قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔(کتاب القرأة للبیھقی ص١١۴)

(۵)......نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھی،میری داہنی جانب ایک انصاری صحابی تھے،انھوں نے آپ ﷺ کے پیچھے قرأت کی،اور میری

بائیں جانب قبیلۂ مزنیہ کے ایک صاحب تھے' جو کنکریوں سے کھیل رہے تھے، جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے پوچھا کہ: میرے پیچھے کس نے قرأت کی ہے؟ انصاری بولے میں نے یا رسول اللہ! آپ ﷺ نے فرمایا: ایسا مت کرو، کیونکہ جو امام کی اقتدا کرے تو امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہوتی ہے۔ جو صاحب کنکریوں سے کھیل رہے تھے ان سے فرمایا: تمہیں نماز سے یہی حصہ ملا ہے۔(کتاب القرأة للبیہقی ص۱۷۶)

(۶)......حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ظہر یا عصر کی نماز میں ایک شخص نے آپ ﷺ کے پیچھے قرأت کی، اثناء نماز میں ایک آدمی نے اشارہ سے اس کو قرأت سے منع کیا، جب نماز سے فارغ ہوئے تو قرأت کرنے والے نے منع کرنے والے سے کہا کہ: تم مجھے آپ ﷺ کے پیچھے قرأت کرنے سے کیوں روکتے ہو؟ وہ دونوں باتیں کررہے تھے کہ آپ ﷺ نے ان کی گفتگو سن لی اور ارشاد فرمایا: جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھتا ہو اس کے لئے امام کی قرأت ہی کافی ہے۔

(کتاب القرأة للبیہقی ص۱۲۶)

سورۂ فاتحہ بھی امام کے پیچھے نہیں پڑھی جائے گی

(۱)......حضرت جابر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ: آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے نماز کی کوئی رکعت پڑھی اور اس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز نہیں ہوئی، مگر یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو۔(طحاوی ص۱۴۹ ج۱۔ مصنف عبد الرزاق ص۱۲۰ ج۱)

(۲)......حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر وہ نماز جس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ ناقص ہے سوائے اس نماز کے جو امام کے پیچھے پڑھی گئی ہو۔

(دار قطنی ص۳۲۷ ج۱۔ کتاب القرأة للبیہقی ص۱۳۶)

(۳)......حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نماز میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ نہیں ہوتی، سوائے اس نماز کے جو امام کے پیچھے پڑھی گئی ہو۔

(کتاب القرأة للبیہقی ص۱۷۳)

(۴)......حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ آپ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ: آپ ﷺ نے فرمایا کہ: اس شخص کی نماز جائز نہیں جو سورۂ فاتحہ کے ساتھ مزید کچھ اور نہ پڑھے۔ حضرت سفیان بن

نماز میں آمین آہستہ کہے یا زور سے؟

(۶): سوال: ......کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور مفتیان شرع متین "زادکم اللّٰہ تعالی شرفا وتعظیما لدیہ "اس صورت میں کہ مذہب حنفی میں آمین آہستہ کہی جاتی ہے، اور دوسرے مذہبوں میں آمین بالجہر یعنی پکار کر کے کہی جاتی ہے، لہذا سوال یہ ہے کہ حنفی مذہب کی جو حدیث دلیل ہو وہ پیش کی جاوے؟ بینوا بیاناً شافیاً توجروا أجراً وافیاً،

الجواب الوسیط بغیر افراط وتفریط: ......صورت مذکور میں معلوم ہو کہ جس طرح آمین بالجہر کہنے پر حدیثیں ہیں، اسی طرح کتب حدیث میں آمین بالاخفاء کہنے پر بھی قوی حدیثیں موجود ہیں، چنانچہ علامہ عبدالحیؒ لکھنوی مرحوم نے "سعایہ" (کے صفحہ ۱۷۳) میں تحریر فرمایا ہے:

وهذا هو قول مالک فی روایة عنه ، والشافعی فی قوله الجدید : أن المنفرد والإمام والمأموم کل منهم یسرون بآمین جهریة کانت الصلوة أو سریة ، لما روی أحمد وأبوداؤد الطیالسی وابویعلی الموصلی فی مسانیدهم من حدیث شعبة عن مسلمة بن کهیل عن حجر أبی العنبس عن علقمة بن وائل عن أبیه ، أن رسول اللّٰه ﷺ لما بلغ غیر المغضوب علیهم ولا الضالین قال : آمین واخفی صوته ،

یعنی آہستہ آمین کہنا ایک روایت کے بموجب امام مالک کا بھی قول ہے، اور امام شافعی کا قول جدید بھی یہی ہے کہ امام اور مقتدی دونوں آمین آہستہ کہیں خواہ نماز جہری یا یا سری، اس

عیینہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: آپ ﷺ کا یہ حکم اس شخص کے لئے ہے جو اکیلا نماز پڑھ رہا ہو۔
(۵)......امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: آپ ﷺ کے فرمان کہ: اس کی نماز جائز نہیں جو سورۂ فاتحہ کے ساتھ قرأت نہ کرے کے متعلق حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ: یہ اس وقت ہے جب کہ کوئی اکیلا نماز پڑھ رہا ہو۔ (ترمذی ص ۷۱ ج ۱)

وجہ سے کہ امام احمد اور ابوداؤد طیالسی اور ابویعلی موصلی نے اپنے اپنے مسانید میں شعبہ اور انہوں نے مسلمہ بن کہیل سے اور انہوں نے حجر ابی العنبس سے اور انہوں نے علقمہ بن وائل سے اور انہوں نے ابی وائل سے روایت کیا ہے کہ: رسول خدا ﷺ جب ''غیر المغضوب علیھم ولا الضالین'' پر پہنچتے تو فرماتے: آمین اور آہستہ کرتے آواز اپنی۔

وروی الطبرانی فی معجمه والدار قطنی فی سننه والحاکم فی المستدرک من حدیث شعبة عن سلمة بن کھیل عن حجر أبی العنبس عن علقمة بن وائل عن أبیه أن رسول اللهﷺ لما بلغ غیر المغضوب علیھم ولا الضالین ، قال : اٰمین واخفی صوته ، ولفظ الحاکم خفظ بھا صوته ، وقالا : صحیح الاسناد ولم یخرجاه،

یعنی علقمہ اپنے باپ وائل سے روایت کرتے ہیں کہ: رسول خدا ﷺ جب ''غیر المغضوب علیھم ولا الضالین'' پڑھتے تو فرماتے: آمین اور مخفی کرتے تھے اپنی آواز کو۔ کہا حاکم نے کہ: یہ حدیث صحیح الاسناد ہے، مگر بخاری اور مسلم نے اپنی اپنی صحیحین میں اس حدیث کی تصریح نہیں کی ہے۔

اگر کوئی اعتراض کرے کہ: اس حدیث میں شعبہ نے خطا کی ہے، وہ یہ ہے کہ شعبہ اس طرح روایت کرتے ہیں: '' عن حجر أبي العنبس '' اور درحقیقت یہ ''عن حجر بن العنبس '' ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ محدثین نے تصریح کی ہے کہ اس بارہ میں شعبہ کے خطا پکڑنے والے خود خاطی ہیں، اور ان کا کہنا کہ وہ ''حجر بن العنبس '' ہے 'ابو العنبس ' نہیں، صحیح نہیں ہے؛ بلکہ وہ ''ابو عنبس حجر بن عنبس '' ہے، ذکر کیا ہے اس کو ابن حبان نے ثقات میں۔

اگر کوئی اعتراض کرے کہ: شعبہ نے ترمذی میں اس کی کنیت ابوالعنبس بیان کی ہے،

اور در حقیقت کنیت اس کی ابوالسکن ہے، تو جواب دیا جائے گا کہ: یہ کچھ مضر نہیں ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ ایک شخص کی دو کنیتیں ہوں، یعنی ایک ابوالسکن اور دوسری کنیت ابوالعنبس ہو۔

اگر کوئی اعتراض کرے کہ: شعبہ نے لفظ عن علقمہ زیادہ کیا ہے اور دوسری روایت میں حجر بن عنبس عن وائل بن حجر ہے، تو جواب یہ ہے کہ: زیادتی علقمہ کی کچھ مضر نہیں ہے، کیونکہ زیادتی ثقہ کی مقبول ہے، چنانچہ ''سعایہ'' (کے صفحہ ۱۷۳) میں اس کی تصریح ہے:

ورده العينى فى البناية بأن تخطية شعبة خطأ كيف ؟ وهو أمير المؤمنين فى الحديث وقوله إنما هو حجر بن العنبس ليس هو كما قال ، بل هو ابوعنبس ذكره ابن حبان فى الثقات ، وقوله : " يكنى أبا السكن " لا ينافيه ، لأنه لا مانع أن يكون لشخص واحد كنيتان ، وقوله :" زاد فيه علقمة " لا يضر ، لأن زيادة الثقة مقبولة ، انتهى،

اور حدیث میں آہستہ کہنے کی علامہ طحاوی نے ''معانی الآثار'' میں روایت کی ہے۔

حدثنا سليمان بن شعيب ، قال : حدثنا على بن معبد ، قال : حدثنا أبوبكر بن عياش عن أبي سعيد عن أبى وائل ، قال : كان عمر رضي الله عنه وعلى رضي الله عنه لا يجهران ببسم الله الرحمن الرحيم ولا بالتعوذ ولا بالتامين،

یعنی علامہ طحاوی نے بسند خود ابی وائل سے روایت کی ہے کہ: وائل نے فرمایا کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ ''بسم الله الرحمن الرحيم'' اور ''اعوذ بالله'' اور آمین جہر سے نہیں کہتے تھے۔ اور اس سے زیادہ تصریح چاہتے ہو تو بڑی کتابیں مثل ''عینی'' اور ''مرقاۃ'' اور ''اشعۃ اللمعات'' وغیرہ کو ملاحظہ کرو۔ اور خدا نے چاہا تو عنقریب ایک رسالہ مستقل اس بارے میں بندہ بھی لکھے گا۔ [۱]

[۱]...... چند اور روایتیں یہ ہیں:

(۱)......حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: امام چار چیزوں کو آہستہ کہے: (۱): اعوذ باللہ، (۲): بسم اللہ،

ترک رفع یدین کے دلائل

(۷):سوال:......کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ سوائے

(۳):آمین،(۴): ربنا لک الحمد۔

(کنز العمال ص۲۷۴ ج۸۔محلی ابن حزم ص۲۰۶ ج۲۔البنایہ فی شرح الھدایہ ص۶۲۰ ج۱)

(۲)......ابووائل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ: حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نہ تو بسم اللہ اور اعوذ باللہ اونچی آواز سے پڑھتے تھے اور نہ ہی آمین اونچی آواز سے کہتے تھے۔(طحاوی ص۱۴۰ ج۱۔الجوہر النقی ص۴۸ ج۱)

(۳)......ابووائل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ: حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نہ تو بسم اللہ اور اعوذ باللہ اونچی آواز سے پڑھتے تھے اور نہ ہی آمین اونچی آواز سے کہتے تھے۔(معجم طبرانی کبیر ص۲۶۳ ج۹)

(۴)......حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: امام تین چیزوں کو آہستہ سے کہے: (۱): اعوذ باللہ، (۲): بسم اللہ، (۳): آمین۔(محلی ابن حزم ص۲۰۶ ج۲)

(۵)......اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿قد اجیبت دعوتکما﴾۔قبول ہو چکی تمہاری دعا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ: حضرت موسی علیہ السلام جب دعا کرتے تو حضرت ہارون علیہ السلام آمین کہتے۔

ابن جریر نے ابن زید سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حضرت ہارون علیہ السلام (چونکہ موسی علیہ السلام کی دعا پر) آمین کہتے تھے، اس لئے اللہ تعالی نے فرمایا: ﴿قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُکُمَا﴾ یعنی: تمہاری دعا قبول کر لی گئی۔(سورۂ یونس، آیت نمبر:۸۹)

لہٰذا آمین کہنا بھی دعا ہوا، جس میں ہارون، موسی (علیہما السلام) کے ساتھ شریک ہوئے۔

(الدر المنثور فی التفسیر بالماثور ص۳۱۵ ج۳)

حضرت عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: آمین دعاء ہے۔(بخاری ص۱۰۷ ج۱)

اور اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَةً﴾ یعنی: تم اپنے پروردگار کو عاجزی کے ساتھ چپکے چپکے پکارا کرو۔(سورۂ اعراف، آیت نمبر:۵۵)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ دعا میں جہر مطلوب نہیں، اور آمین دعا ہے، اس لئے آمین میں بھی جہر نہیں ہونا چاہئے۔

تکبیر تحریمہ کے مثلاً رکوع کے وقت اور رکوع سے اٹھنے کے وقت حنفی مذہب میں رفع یدین نہیں کرتے ،اس پر جو حدیث دلیل ہو وہ پیش کی جائے؟ بینوا بیاناً شافیاً توجروا أجراً وافياً،

الجواب الوسيط بغير افراط وتفريط:......صورتِ مسئولہ میں مذہبِ حنفی کے موافق حدیثیں بہت ہیں، چنانچہ جامع ترمذی میں ہے:

عن علقمة قال : قال عبد الله بن مسعود ﷺ : ألا أصلى بكم صلوة رسول الله ﷺ ؟ فصلى فلم يرفع يديه إلا فى أول مرة،

علقمہ سے روایت ہے کہ: کہا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہ: کیا میں تم کو رسول اللہ ﷺ جیسی نماز نہ پڑھاؤں؟ یہ کہہ کر نماز پڑھائی اور صرف اول مرتبہ رفع یدین کیا۔

وقال : في الباب عن البراء بن عازب،

یعنی کہا ترمذی نے کہ:اس باب میں براء بن عازب سے بھی روایت ہے،

اوراس کی شرح میں ہے کہ: تخریج کی ہے اس حدیث کی احمد اور اسحاق اور دارقطنی اور طحاوی نے یزید بن ابی زیاد کے طریقہ سے، انہوں نے عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے، انہوں نے براء سے۔

قال ابوعيسى : حديث ابن مسعود حديث حسن ، وبه يقول غير واحد من أهل العلم من أصحاب النبي ﷺ والتابعين ، وهو قول سفيان وأهل الكوفة ،

یعنی ابوعیسی ترمذی نے کہا کہ: حدیث ابن مسعود کی حدیث حسن ہے،اوراسی کے قائل ہیں بہت سے اہل علم اصحاب نبی ﷺ اور تابعین میں سے،اور یہی قول سفیان ثوری اور اہل کوفہ کا ہے۔

وحدثنا عثمان بن أبي شيبة ، نا وكيع عن سفيان عن عاصم عن عبد الرحمن

بن الأسود عن علقمة قال : قال عبدالله بن مسعود ﷺ : ألا أصلى بكم صلوة رسول الله ﷺ ؟ قال : فصلى ولم يرفع يديه إلا مرة واحدة ، رواه أبوداؤد،

وحدثنا محمود بن غيلان المروزى : نا وكيع نا سفيان عن عاصم بن كليب عن عبدالرحمن بن الأسود عن علقمة عن عبدالله ﷺ أنه قال : ألا أصلى بكم صلوة رسول الله ﷺ ؟ فصلى ولم يرفع يديه إلا مرة واحدة ، رواه النسائى وأبوبكر بن أبى شيبة في مصنفه،

اوراسی طرح حضرت عمر ﷺ اورحضرت ابوبکر ﷺ سے ان کا فعل دارقطنی میں مروی ہے اوروہ یہ ہے:

حدثنا أبو عثمان سعيد بن محمد بن أحمد الخياط وعبدالوهاب بن عيسى بن أبي حية قالا : نا اسحاق بن أبى اسرائيل ، نا محمد بن جابر عن حماد عن ابراهيم عن علقمة عن عبدالله ﷺ قال : صليت مع النبى ﷺ ومع أبى بكر ﷺ وعمر ﷺ فلم يرفعوا أيديهم إلا عند تكبيرة الافتتاح ،

اوراسی طرح طحاوی نے ''معانی الآ ثار'' میں اورامام محمد نے اپنی ''مؤطا'' میں روایت کیا ہے،اوراس بارہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اوراوزاعی رحمہ اللہ سے مناظرہ مکہ شریف میں ہوا تھا،اورامام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے جواب پراوزاعی رحمہ اللہ ساکت ہوگئے،اس کو میں نقل کرتا ہوں وہ کافی ہے۔

شرح ابی الطیب کے (صفحہ۲۷۹) میں ہے:

ومما يؤيد صحة هذه الزيادة رواية أبى حنيفة من غير الطريق المذكورة ، وذلک أنه اجتمع مع الأوزاعى بمكة فى دار الخياطين ، كما حكى ابن عيينة ، فقال الأوزاعى : ما بالكم لا ترفعون أيديكم عند الركوع والرفع منه ؟ فقال : لأنه لم

يصح عن رسول الله ﷺ فيه شيء ، فقال الأوزاعي : كيف لم يصح ؟ وقد حدثني الزهري عن سالم عن أبيه : أن رسول الله ﷺ كان يرفع يديه إذا افتتح الصلوٰة ' وعند الركوع ' وعند الرفع منه فقال : ثنا حماد عن ابراهيم عن علقمة الأسود عن عبدالله بن مسعود أن النبي ﷺ كان لا يرفع يديه إلا عند افتتاح الصلوة ، ثم لا يعود بشيء من ذلک ، فقال الأوزاعي : أحدثک عن الزهري عن سالم عن أبيه ، وتقول حدثني حماد عن ابراهيم ؟ فقال أبوحنيفة : كان حماد أفقه من الزهري ، وكان ابراهيم أفقه من سالم ، وعلقمة ليس بدون ابن عمر في الفقه ، وإن كان لإبن عمر صحبة ، فله فضل صحيحة ، فللأسود فضل كثير وعبدالله عبدالله ، فرجح بفقه الرواة كما رجح الأوزاعي بعلو الاسناد ، والترجيح بفقه الرواة هو المذهب المنصور عندنا ،

تنبیہ:...... ہر مذہب کی دلیلیں کتب حدیث واصول میں موجود ہیں، کسی مذہب کے فروعی مسائل بلا دلیل نہیں ہیں، اور جو بعض کم فہم: علماء عظام اور فقہاء کرام پر طعن کرتے ہیں وہ دو حال سے خالی نہیں: یا تو جہالت سے ان دلائل کو معلوم نہیں کر سکتے جو مجتہدین کے اذہان میں تھے، اور جن سے فروعی مسائل اخذ کئے گئے ہیں، یا دیدہ ودانستہ تجاہل کر کے تعصب اور ہٹ دھرمی سے اپنی عداوت قلبی کو ظاہر کرتے ہیں، ایسی حرکتوں سے خدا بچائے اور اپنی پناہ میں رکھے۔ بزرگان دین کے کلام کو نیک محمل پر حمل کرنا اور اپنے ذہن کو قاصر سمجھ کر اقرب الی الانصاب، بلکہ عین ادب ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على رسوله وعلى آله وأصحابه يوم الدين۔ کتبہ: عبد من عباد اللہ خادم الطلبہ

القاضی رحمت اللہ عفی عنہ

ضمیمہ......فائدہ جدیدہ جلیلہ

یہ رسالہ جو پہلی دفعہ شائع ہوا تو اس پر بعض اصحاب غیر مقلدین نے ایک اعتراض کیا، اور میرے ایک محسن نے مجھے اطلاع دی، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ نوبت ثانی میں ان کے اعتراض کو بطور سوال ذکر کر کے اس کا جواب دیا جائے، تا کہ برادران مذہب کو فائدہ پہنچے، وھو ھذا:

حضرت علقمہ رحمہ اللہ کا اپنے والد سے سماع ثابت ہے

سوال: ......رسالہ ’’سبع سنابل‘‘ میں نماز میں زیر ناف ہاتھ باندھنے کے بارے میں ابن ابی شیبہ کی حدیث نقل کی گئی ہے، اور حنفی مذہب کا اس بارے میں دار و مدار اسی حدیث پر ہے، اور باقی تمام حدیثیں اس بارے میں ضعیف ہیں۔ رہی یہ روایت تو اس میں علقمہ اپنے والد وائل سے روایت کرتے ہیں، اور بعض محدثین نے اس حدیث کو منقطع کہا ہے، کیونکہ علقمہ کا سماع اپنے والد وائل سے ثابت نہیں، کیونکہ یہ اپنے والد کے انتقال سے چھ ماہ بعد پیدا ہوئے تھے، چنانچہ اس کی تصریح ’’الفیہ عراقی‘‘ کے حاشیہ پر صفحہ:۲۳ر میں موجود ہے، عبارت یہ ہے:

’’ ومثاله مارواه ابن ابی شيبة فی مصنفه : حدثنا وكيع عن موسى بن عمر عن علقمة بن وائل بن حجر عن ابيه قال : رأيت النبی صلی الله عليه وسلم وضع يمينه علی شماله فی الصلوٰة تحت السرة ، انتهٰی ، فهذا الحديث منقطع ، لان علقمة لم يسمع من ابيه ، لانه ولد بعد وفاة ابيه بستة اشهر، فلم يوجد شروط الصحة وهو اتصال السند ' وعدم الشذوذ ' وان لا يكون فيه علة قادحة ، ويعارضه حديث وائل بن حجر قال : صليت مع النبی صلی الله عليه وسلم فوضع يده اليسرى علی صدره

اخرجه ابن خزيمة وصححه ’’اس کا کیا جواب ہے؟

الجواب:......ابن ابی شیبہ کی حدیث کے ضعیف ہونے کی وجہ فقط یہی بیان کی جاتی ہے کہ علقمہ (رحمہ اللہ) کا اپنے والد سے سماع ثابت نہیں۔ پس جبکہ علقمہ (رحمہ اللہ) کا سماع ثابت ہوجائے تو حدیث کی صحت میں کوئی کلام نہ ہوگا، لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ: علقمہ (رحمہ اللہ) نے اپنے والد (حضرت) وائل (رضی اللہ عنہ) سے سنا ہے اور اس پر نہایت قوی دلیلیں موجود ہیں۔ ’’ترمذی‘‘ جلد اول صفحہ: ۱۸۸ر میں ہے:

علقمة بن وائل بن حجر سمع من ابيه ، وهو اكبر من عبدالجبار بن وائل بن حجر ، وعبدالجبار بن وائل بن حجر لم يسمع من ابيه،

یعنی علقمہ بن وائل (رحمہ اللہ) نے اپنے والد وائل ابن حجر (رضی اللہ عنہ) سے سنا ہے اور یہ علقمہ (رحمہ اللہ) عبدالجبار بن وائل (رحمہ اللہ) سے بڑے ہیں، اور عبدالجبار بن وائل (رحمہ اللہ) نے اپنے والد وائل (رضی اللہ عنہ) سے نہیں سنا ہے، اور اسی طرح ’’شرح نسائی‘‘ جلد اول صفحہ: ۱۷۱ر میں ہے:

علقمة بن وائل بن حجر الكندي الحضرمي : اخو عبد الجبار تابعي ، ذكره ابن حبان فى الثقات ، روى عن ابيه والمغيرة وعنه اخوه عبدالجبار وسلمة بن كهيل وعمرو بن مرة وعاصم بن كليب ، رواه البخارى فى الادب ، وفى رفع الايدى فى الصلٰوة ، ومسلم فى ’’ صحيحه ‘‘ أى فى كتاب الصلٰوة ، وفى كتاب الامارة ، وفى الاصول دون المتابعات ، والترمذى فى جامعه فى احكامه ، وقال: حسن صحيح ، كذا افاده الشيخ اللؤلوى فى الاكمال، قال الفاضل القاري فى المرقاة : والصحيح ان علقمة سمع من ابيه ، وان الذى لم يسمع من ابيه هو عبدالجبار بن وائل، ولد

بعد وفاته بستة اشهر ، كذا نقله الترمذی عن البخاری ، ذکره میرک ، انتهی، وقد صرح الترمذی فی جامعه فی ابواب الحدود : انه سمع من ابیه ، فاحفظ فانه ینفعک فی کثیر من المواضع۔

ترجمہ:......علقمہ بن وائل بن حجر کندی حضرمی عبدالجبار کے بھائی تابعی ہیں،ابن حبان نے ان کوثقات میں ذکر کیا ہے۔انہوں نے اپنے والداور مغیرہ سے روایت کی ہے،اوران سے انکے بھائی عبدالجباراورسلمہ بن کہیل اور عمرو بن مرہ اور عاصم بن کلیب نے روایت کی ہے۔(امام) بخاری (رحمہ اللہ) نے اسے ''الادب المفرد''اور رسالہ'' رفع یدین'' میں روایت کیا ہے۔اور(امام) مسلم (رحمہ اللہ) نے اپنی''صحیح''میں''کتاب الصلوٰۃ''اور ''کتاب الامارۃ'' میں اصل روایت میں روایت کی ہے نہ کہ متابعات میں۔اور(امام) ترمذی (رحمہ اللہ) نے اپنی''جامع''میں''کتاب الاحکام''میں۔اورکہا کہ: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔اسی طرح شیخ لؤلوئی نے''اکمال''میں افادہ فرمایا ہے۔علامہ ملاعلی قاری (رحمہ اللہ) نے''مرقاۃ شرح مشکوٰۃ''میں فرمایا ہے کہ: صحیح یہ ہے کہ علقمہ نے اپنے والد سے سنا ہےاور جس کی جانب نہ سننا منسوب ہے وہ ان کے بھائی عبدالجبار بن وائل ہیں جو اپنے والد کی وفات سے چھ ماہ بعد پیدا ہوئے تھے۔اسی طرح (امام) ترمذی (رحمہ اللہ) نے (امام) بخاری (رحمہ اللہ) سے نقل کیا ہے جیسا کہ میرک نے ذکر کیا ہے۔اور(امام) ترمذی (رحمہ اللہ) نے اپنی''جامع''میں''کتاب الحدود''میں تصریح کردی ہے کہ علقمہ نے اپنے والد سے سنا ہے۔اس بات کو یادرکھنا چاہئے ، کیونکہ بہت جگہ اس کا نفع ظاہر ہوگا۔ممکن ہے کہ حافظ ابن حجر (رحمہ اللہ) اس قول صحیح پر مطلع نہ ہوئے ہوں ،اس وجہ سے''تقریب التہذیب''میں لکھ دیا کہ: علقمہ کا اپنے والد سے سماع ثابت نہیں۔پس ان عبارات سے

صاف واضح ہوگیا کہ معترض کا اس روایت پر اعتراض بے جا ہے اور یہ کہ علقمہ کے سماع وعدم سماع کے بارے میں قول صحیح یہی ہے کہ سماع ثابت ہے، اور جو عدم سماع کے قائل ہیں ان کو عبدالجبار بن وائل کے عدم سماع سے علقمہ کے سماع میں دھوکا لگا ہوا ہے اور غلطی سے عدم سماع ان کی جانب منسوب کردیا۔

رہی وہ روایت جو معترض نے حاشیہ ''الفیہ عراقی'' سے نقل کی ہے، یعنی ابن خزیمہ والی روایت جس سے سینہ پر ہاتھ باندھنا ثابت ہوتا ہے، اور ابن خزیمہ نے اس کو صحیح کہا ہے، اس کا جواب ''شرح ابی الطیب'' سے نقل کرتا ہوں:

فلم يأخذ احد من الائمة الاربعة حديث الوضع على الصدر، فلو كان عندهم صحيحًا كيف تركوا العمل به ، خصوصا الامام احمد الذى رواه فى مسنده برواية هلب ، واذا روى الراوى حديثا وعمل بخلافه لم يؤخذ بروايته تلك۔

ترجمہ:......پس سینہ پر ہاتھ باندھنے کی روایت کو ائمہ اربعہ میں سے کسی نے نہیں لیا، تو اگر یہ حدیث ان کے نزدیک صحیح ہوتی تو اس پر عمل کیوں نہ کرتے؟ بالخصوص امام احمد (رحمہ اللہ) جنہوں نے اپنی مسند میں اس روایت کو ہلب کے طریقہ سے روایت کیا ہے، اور جب کوئی راوی کوئی حدیث روایت کرے اور اس کے خلاف عمل کرے تو اس کی روایت پر عمل نہ ہوگا۔

ف:......پس جبکہ کسی مجتہد نے سینہ والی حدیث پر عمل نہیں کیا تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس میں کوئی علت خفیہ قادحہ ضرور ہوگی، جس پر ائمہ مجتہدین مطلع ہوئے ہیں، اور اس وجہ سے انہوں نے چھوڑ دی ہے، فتدبر۔

قاضی محمد رحمت اللہ

العطر العنبری فی حکم اجابة الاذان المنبری

اس رسالہ میں: آپ ﷺ کے زمانہ میں اذان جمعہ کتنی تھیں؟ آپ ﷺ سے اذان کا قولی جواب دینا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، خطیب کے نکلنے کے وقت کون سا کلام مکروہ ہے اور کن سا مکروہ نہیں، اذان منبر کا جواب، عمل معاویہ رضی اللہ عنہ سے استدلال پر اشکال اور اس کا جواب، دوران خطبہ درود شریف پڑھنے کا حکم وغیرہ امور کو بڑے مضبوط دلائل سے جمع کیا گیا ہے۔

حضرت مولانا قاضی رحمت اللہ صاحب لاجپوری' راندیری

ترتیب، حواشی واضافہ

مرغوب احمد لاجپوری

عرض محشی وتعارف کتاب

اذان جمعہ کا جواب دینے کا کیا حکم ہے؟ اور زبان سے دیا جائے یا سراً اور دل میں، اس مسئلہ میں علماء امت کا اختلاف ہے، فقہاء اور علماء کی ایک جماعت کا مسلک یہ ہے کہ سراً اور دل میں جواب دیا جائے، دوسری جماعت کا مسلک یہ ہے کہ عام اذانوں کی طرح اس کا جواب بھی زبان سے دیا جائے، دونوں طرف کے حضرات اپنے اپنے دلائل پیش کرتے ہیں، اسی قسم کے ایک سوال کے جواب حضرت مولانا قاضی رحمت اللہ صاحب لاجپوری ثم راندیری رحمہ اللہ نے ایک تفصیلی جواب تحریر فرمایا، اوراس میں اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جمعہ کی اذان جو منبر کے سامنے ہوتی ہے اس کا جواب بھی زبان ہی سے دیا جائے گا، اوراپنے مسلک کو مختلف دلائل سے ثابت فرمایا ہے۔

راقم یہاں اپنے بزرگوں کے چند فتاوی اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے نقل کرنا مناسب سمجھتا ہے تاکہ ناظرین کے سامنے ہمارے اکابر کی رائے بھی آجائے، پہلے ان حضرات کے فتاوی نقل کرتا ہوں جن کا رجحان یہ ہے کہ اس اذان کا جواب دل میں دیا جانا چاہئے اور زبان سے نہیں دینا چاہئے۔

اذان جمعہ کا جواب دل میں دیا جائے زبان سے نہیں، اکابر کے فتاوی

(۱)......حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ کا فتوی۔

جائز نہیں اور جب امام اپنی جگہ سے اٹھے اسی وقت سے سکوت واجب ہے۔

(تالیفات رشیدیہ مع فتاوی رشیدیہ ص۲۶۰)

(۲)......حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ کا فتوی۔

اذان ثانی کا جواب دینا مکروہ ہے۔(فتاوی دارالعلوم دیوبند ص۲۷ج۱،سوال نمبر۱۰۸)

نیز دیکھئے! فتاوی دارالعلوم دیوبند ص ۵۴/۵۸/٦٦/۱۳۴، ج ۵۔ (طبع دارالاشاعت کراچی)

(۳)......حضرت مولانا مفتی عبداللطیف صاحب رحمہ اللہ کا فتوی۔

خروج امام کے بعد صلوۃ وکلام دونوں ممنوع ہیں، اوراس عموم میں اجابت اذان بھی داخل ہے.....لہذا اس وقت میں اجابت اذان امام کے لئے بھی مکروہ ہوگی، لہذا مقتدین کو اس میں اقتدا جائز نہیں۔ (فتاوی مظاہرعلوم ص ۲۸٦ ج ۱)

(۴)......حضرت مولانا مفتی مرغوب احمد صاحب لاجپوری رحمہ اللہ کا فتوی۔

اجابت فعلی ہوتے ہوئے اجابت قولی کی ضرورت نہیں، لیکن اگرکوئی شخص جواب دینا اور بعد ختم اذان کے دعا کرنا چاہے تو جائز ہے، لیکن دل ہی دل میں اذان کا جواب دے اور دعا بھی دل ہی دل میں کرے۔ (مرغوب الفتاوی ص ۹۷ ج ۳)

راقم نے ''مرغوب الفتاوی'' ہی کے حوالہ سے اپنے رسالہ ''نماز جمعہ وخطبہ کے مسائل'' میں یہی مسئلہ لکھا ہے۔ (مرغوب الرسائل فی عمدۃ المسائل ص ۲۸۵ ج ۱۔مجموعۃ الخطب ص ۱۹)

(۵)......حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ کا فتوی۔

اذان خطبہ کا دہرانا امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک نہیں چاہئے، اذان اول کی اجابت مسنون ہے نہ کہ اذان خطبہ کی، لیکن امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک اذان خطبہ کا جواب بھی دینا جائز ہے، اگراس کے موافق دہرائیں تو آہستہ دل میں دہرائیں۔

(کفایت المفتی ص ۲۰٦ ج ۵، ادارۃ الفاروق کراچی)

(٦)......حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا فتوی۔

جائز نہیں، البتہ دل میں جواب دینا بہتر ہے۔ (امداد المفتین ص ۳۳۱ ج ۲)

نوٹ:......اس موضوع پر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا ایک مختصر رسالہ

’’القول الجریب فی اجابة الاذان بین یدی الخطیب ‘‘یعنی اذان خطبہ کا جواب دینے کی شرعی تحقیق‘ قابل مطالعہ ہے۔(جواہر الفقہ ص ۵۲۹ ج ۲۔امداد المفتین ص ۲۴۷ ج ۲)

(۷)......حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی رحمہ اللہ کا فتوی۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ اذان خطبہ کا زبان سے جواب نہ دیا جائے۔دل میں جواب دے۔(فتاوی محمودیہ ص ۳۳۱/۳۳۲ ج ۸،جامعہ فاروقیہ کراچی)

(۸)......حضرت مولانا مفتی قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی رحمہ اللہ کا فتوی۔

خطبہ کی اذان کا جواب زبان سے دینا یا اذان کے بعد دعا پڑھنا مناسب نہیں ہے، البتہ دل ہی دل میں پڑھ لے۔(فتاوی قاضی ص ۷۸)

(۹)......حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی رحمہ اللہ کا فتوی۔

اذان خطبہ کا جواب زبان سے دینا جائز نہیں، ہاں دل ہی دل میں جواب دیا جا سکتا ہے۔(احسن الفتاوی ص ۱۲۵ ج ۴)

(۱۰)......حضرت مولانا مفتی محمد یوسف لدھیانوی رحمہ اللہ کا فتوی۔

خطبہ کی اذان کا جواب نہیں دیا جاتا۔(آپ کے مسائل اوران کا حل ص ۱۷۱ ج ۲)

خطبہ کی اذان کا جواب بھی دل میں دینا چاہئے۔(آپ کے مسائل اوران کا حل ص ۱۴۰ ج ۲)

(۱۱)......حضرت مولانا مفتی محمد انور صاحب مدظلہم مفتی جامعہ خیر المدارس ملتان کا فتوی۔

جمعہ کی اذان ثانی کا جواب دل میں دے لے، زبان سے نہ دے۔

(خیر الفتاوی ص ۲۳۴ ج ۲)

(۱۲)......جامعہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کا فتوی۔

اگر چہ اذان کا جواب دینا ضروری امر ہے، لیکن جمعہ کے دن اذان ثانی کا جواب زبان

سے دینا فقہاء کے ہاں مختلف فیہ ہے، مناسب یہ ہے کہ جواب نہ دیا جائے، البتہ اگر دل ہی دل میں جواب دیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ (فتاوی حقانیہ ص ۳۹۷ ج ۳)

(۱۳)......حضرت مولانا مفتی خالد سیف اللہ صاحب رحمانی مدظلہم اللہ کا فتوی۔

خطیب کے علاوہ کسی اور شخص کو زبان سے اذان کا جواب نہیں دینا چاہئے۔

(کتاب الفتاوی ص ۱۴۰ ج ۲)

(۱۴)......حضرت مولانا مفتی محمد سلمان صاحب منصور پوری مدظلہم اللہ کا فتوی۔

خطبہ کی اذان کا جواب صرف دل دل میں دیا جائے، زبان سے کلمات اذان نہ دہرائیں، اس لئے کہ خطیب کے منبر پر آنے کے بعد زبان سے اذکار منع ہے۔

(کتاب المسائل ص ۴۲۹ ج ۱)

اذان جمعہ کا جواب زبان سے دیا جائے، اکابر کے فتاوی

ان حضرات کے فتاوی جو جواب کے قائل ہیں:

(۱)......حضرت مولانا عبدالحیٔ صاحب لکھنوی رحمہ اللہ کا فتوی۔

مسئلہ:......خطبہ کی اذان کا جواب بالاتفاق درست نہیں۔ (درمختار)

مگر میرے نزدیک اس میں نظر ہے، چونکہ خطبہ کی اذان کے وقت امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک کلام دنیوی مکروہ ہے اور جواب دینا یہ تو دینی کلام ہے، نیز رسول اللہ ﷺ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے اس اذان کا جواب دینا ثابت ہے۔

(بخاری۔ذخیرۃ المسائل ترجمہ نفع المفتی والسائل ص ۱۳۶)

(۲)......حضرت مولانا مفتی عبدالشکور لکھنوی صاحب رحمہ اللہ کا فتوی۔

جمعہ کی دوسری اذان کا جواب دینا واجب نہیں، لیکن اگر جواب دے تو مکروہ نہیں، بلکہ

مستحب ہے۔(علم الفقہ ص ۱۵۹، حصہ دوم)

(۳)......حضرت مولانا مفتی ظفر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ کا فتوی۔

جمعہ کی اذان ثانی کا جواب دینا مختلف فیہ ہے، صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک جائز ہے، اور امام صاحب رحمہ اللہ کے قول میں مختلف روایات ہیں، ایک روایت سے کراہت معلوم ہوتی ہے، اور ایک روایت سے جواز معلوم ہوتا ہے، اور ''طحطاوی'' نے اس کا اصح ہونا نقل کیا ہے، اور امام صاحب رحمہ اللہ سے جو یہ قول مشہور ہے کہ خروج امام قاطع صلوۃ وکلام ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ خروج امام قاطع کلام الناس ہے، اور قاطع سائر الکلام خطبہ کا شروع ہو جانا ہے، پس ابتداء خطبہ سے پہلے کلام دینی یعنی تسبیح وجواب اذان جائز ہے۔

(امداد الاحکام ص ۴۱۹ ج ۱)

(۴)......حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ کا فتوی۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک وقت خروج امام سے انصات یعنی خاموشی ضروری ہے، اور دلیل ان کی '' إذا خرج الامام ''الخ، ہے یہ حدیث مرفوعاً وموقوفاً مروی ہے، اگر چہ اس کی اسناد میں کلام ہے، لیکن ''بخاری'' کی روایت ''ثم راح فلم یفرق بین اثنین فصلی ما کتب لہ ثم إذا خرج الامام انصت غفر لہ مابینہ وبین الجمعۃ الاخریٰ'' اس کی مؤید ہے کہ اس میں بھی وقت خروج امام سے انصات کا ارشاد موجود ہے، تاہم متاخرین حنفیہ نے بوجہ حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ اجابت اذان منبری کی اجازت دی ہے، لیکن نماز شروع کرنے کی بالاتفاق بین الائمہ اجازت نہیں ہے، اور خاکسار کے خیال میں اجابت اذان منبری کے علاوہ دیگر اذکار سے انصات اولیٰ واقدم ہے، واللہ اعلم۔

(ترتیبُ المسائِل علیٰ اقوی الدّلائل ، الرسائل المهمة ص ۴۰۴ ج ۱)

(۵)......حضرت مولانا مفتی سید عبد الرحیم صاحب لاجپوری رحمہ اللہ کا فتوی۔

یہ مسئلہ ہمیشہ علماء کرام کے درمیان مختلف فیہ اور معرکۃ الآراء رہا ہے، بعض کے نزدیک بوجہ حدیث'' اذا خرج الامام فلا صلوة ولا کلام ''۔(ھدایہ ص۱۵۱ ج۱) اجابت اذان خطبہ ممنوع ومکروہ ہے، اور بعض کے نزدیک'' اذا سمعتم النداء فقولوا مثل ما یقول المؤذن '' کے عموم میں اذان خطبہ کا جواب بھی داخل ہے، یعنی یہ حضرات جواب دینے کے قائل ہیں۔ اور حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ اس کی مؤید ہے،......حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ کی وجہ سے اجابت اذان خطبہ کی اجازت کا قول درست معلوم ہوتا ہے۔

(فتاوی رحیمیہ ص٦٩ ج۳)

(٦)......حضرت مولانا مفتی رضاء الحق صاحب مدظلہم کا فتوی۔

احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلق اذان کا جواب دینا سنت ہے، اور جمعہ کی اذان ثانی بھی اذان ہونے میں برابر ہے، لہذا اس کا جواب دینا بھی سنت ہوگا۔ کیونکہ اس کے خلاف نص موجود نہیں ہے، جس کی وجہ سے ممانعت ثابت کی جاوے، اور خطبہ کا سننا واجب ہے' یہ مسلم ہے، لیکن ابھی شروع ہی نہیں ہوا، پھر استماع کیسے واجب ہوگا؟

(فتاوی دارالعلوم زکریا ص۵۴۵ ج۲)

(۷)......حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب پالنپوری رحمہ اللہ کا فتوی۔

امام (خطیب) کے لئے خطبہ کی اذان کا جواب دینا نہ صرف جائز بلکہ مستحب ہے، اور حدیث سے ثابت ہے، اور مقتدیوں کے لئے خطبہ کی اذان کا جواب نہ دینا بہتر اور افضل ہے، لیکن جواب دینے میں کوئی گناہ بھی نہیں ہے، کیونکہ اس دوسری صورت میں علماء کی دو رائیں ہیں، بعض حضرات کہتے ہیں کہ مقتدیوں کے لئے خطبہ کی اذان کا جواب دینا مکروہ ہے، اور بعض کے نزدیک مکروہ نہیں ہے بلکہ جائز ہے۔ (آداب اذان واقامت ص۱۱۷)

چونکہ یہ رسالہ اسی موضوع پر ہے اس لئے کچھ تفصیل اپنے اکابر کے رجحانات کے بارے میں لکھ دی گئی ہے تاکہ اس مسئلہ پر تحقیق کرنے والوں کے لئے اکثر مواد ایک جگہ مل جائے۔

مؤلف رحمہ اللہ نے اپنے موقف کو مدلل لکھا اور ثابت کیا کہ صحیح بات یہ ہے کہ جمعہ کی اذان منبری کا جواب بھی زبان سے ہی دیا جائے گا۔ ''اذا خرج الامام لاصلوۃ ولا کلام'' کی وجہ سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی صحیح روایت کو ترک نہیں کیا جا سکتا، پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے جن حضرات نے امام کے لئے زبانی جواب کو ثابت کرنے کی کوشش کی، مؤلف نے اس کا بھی جواب دیا، اور ایک دلیل یہ بھی دی کہ اگر اس روایت کو مان لیا جائے تو اذان منبری بھی صحیح نہیں ہونی چاہیئے۔ اسی طرح وہ روایات جن میں اذان کے جواب دینے کا حکم ہے وہ عام ہیں، اس میں خطبہ کی اذان کا کوئی استثنی نہیں ہے۔ اسی طرح اس کو بھی مفصل لکھا کہ خطیب کے نکلنے سے دینی کلام ممنوع نہیں ہے دنیوی کلام کی ممانعت ہے۔ حدیث میں ایسے واقعات آئے ہیں کہ دوران خطبہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے بارش کی کمی اور دوسری جمعہ بارش کی کثرت کی شکایت کی اور آپ ﷺ اس پر نکیر نہیں فرمائی، اسی طرح ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو نماز تحیۃ المسجد کا حکم فرمایا، اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے غسل جمعہ کی بابت سوال فرمایا وغیرہ امور بھی جواز پر استدلال کرتے ہیں۔

اور زیادہ مضبوط دلیل حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے: حضرت سہل بن حنیف رحمہ اللہ راوی ہیں کہ: میں نے حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما سے سنا اور آپ منبر پر تشریف فرما تھے، جب مؤذن نے کہا: ''اللہ اکبر، اللہ اکبر'' تو حضرت

معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ’’الله اکبر، الله اکبر ‘‘ پھر جب مؤذن نے کہا: ’’اشهد ان لا الہ الا اللہ ‘‘ تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں بھی گواہی دیتا ہوں، پھر جب مؤذن نے کہا: ’’اشهد ان محمدا رسول الله‘‘ تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں بھی گواہی دیتا ہوں، پھر جب اذان پوری ہوگئی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے لوگو! میں نے رسول اللہ ﷺ سے اسی مجلس میں سنا ہے کہ جب مؤذن اذان دے تو تم وہ کلمات کہو جو میری زبان سے سنے ہیں۔

(بخاری ص ۱۲۵ ج ۱، باب یجیب الامام علی المنبر اذا سمع النداء ، رقم الحدیث: ۹۱۴)

ایک قابل غور بات یہ بھی ہے کہ اذان کا جواب دینا قولاً واجب ہے یا مستحب؟ علماء کی ایک جماعت عدم وجوب کی قائل ہے، مگر ایک بڑی جماعت نے وجوب کا قول اختیار کیا ہے، جب قول وجوب پر غور کیا جائے تو اذان کا جواب نہ دینا بھی ایک قسم کا گناہ ہوگا۔ اس اعتبار سے بھی جواب کے قائلین کا قول زیادہ درست معلوم ہوتا ہے، تاہم چونکہ ہمارے اکابر دونوں طرف ہیں، اس لئے کسی قول پر ضد اور دوسرے قول کو بالکل غلط کہنا بھی مناسب نہیں۔

رسالہ کے آخر میں قدرے تفصیل اس پر بھی آرہی ہے کہ اذان کا جواب قولاً واجب ہے یا مستحب؟

بہر حال رسالہ اپنے موضوع پر مفید اور قابل مطالعہ ہے، اہل علم کو ضرور اس سے استفادہ کرنا چاہئے۔ راقم نے اس پر عنوانات قائم کئے اور نئی ترتیب سے مرتب کیا۔ حواشی میں احادیث وعبارات کے حوالے بھی لکھ دیئے۔

اللہ تعالی اس محنت کو قبول فرمائے اور حضرت مؤلف اور مرتب اور اس رسالہ کی طباعت

کے جملہ معاونین کے لئے ذخیرۂ آخرت وذریعۂ نجات اور صدقۂ جاریہ بنائے، آمین۔

راقم الحروف نے حضرت مولانا قاضی رحمت اللہ صاحب لاجپوری ثم راندیری رحمہ اللہ کے نو مفید رسائل کو تحقیق وحواشی اور عنوانات سے مزین کر کے جدید طرز پر شائع کیا، ان رسائل کی طباعت کے بعد معلوم ہوا کہ موصوف کے اور بھی تین رسائل ہیں، جو طبع ہونے سے رہ گئے ہیں، بڑا افسوس ہوا کہ اسی وقت موصول ہو جاتے تو ساتھ ہی طبع ہو جاتے، تاہم اسی وقت جب بھائی مفتی رشید احمد صاحب نے اطلاع دی تو میں نے عرض کیا فوراً ان کو بھی بھیج دو، ملنے پر پہلے مطالعہ کیا، اور اب ان کو ترتیب دے کر طباعت کے لئے بھیج رہا ہوں۔

چونکہ دو رسالے ''العطر العنبری فی حکم اجابة الاذان المنبری ''اور'' کحل البصر فی ذکر وقت العصر '' دو مسئلوں پر مشتمل ہیں اور تیسرا رسالہ'' ازالة الاوهام عن مسائل الاحکام '' کو ان ہی کا تتمہ سمجھنا چاہئے، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ تینوں کو ایک ساتھ ہی طبع کرادوں۔

مرغوب احمد لاجپوری

العطر العنبری فی حکم اجابة الاذان المنبری

اس رسالہ میں: آپ ﷺ کے زمانہ میں اذان جمعہ کتنی تھیں؟ آپ ﷺ سے اذان کا قولی جواب دینا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، خطیب کے نکلنے کے وقت کون سا کلام مکروہ ہے اور کون سا مکروہ نہیں ہے، اذان منبر کا جواب، عمل معاویہ رضی اللہ عنہ سے استدلال پر اشکال اور اس کا جواب، دوران خطبہ درود شریف پڑھنے کا حکم وغیرہ امور کو بڑے مضبوط دلائل سے جمع کیا گیا ہے۔

حضرت مولانا قاضی رحمت اللہ صاحب لاجپوری' راندیری

ترتیب، حواشی واضافہ

مرغوب احمد لاجپوری

اذان کے متعلق پانچ سوالات اوران کے جوابات

سوال:……ما قولکم دام فضلکم ایھا العلماء العظام و الفقہاء الکرام! اس صورت میں کہ جناب رسول خدا ﷺ کے زمانۂ مبارک میں جمعہ میں کتنی اذانیں تھیں؟ اوراذان کا قولی جواب دینا رسول اکرم ﷺ سے ثابت ہے یا نہیں؟ اوراگراذان کا قولی جواب دینا حدیث سے ثابت ہے تو علی العموم ہرایک اذان کا جواب دینا ثابت ہے یا کسی خاص اذان کا؟ اورحدیث منقطع اور موقوف، حدیث صحیح، مرفوع، متصل کا معارضہ کرسکتی ہے یا نہیں؟ اور جب خطیب خطبہ دینے کے لئے اپنی جگہ سے چلے تو اسی وقت سے نماز اور کلام منع ہے یا خطبہ شروع کرنے کے بعد سے نماز اور کلام ممنوع ہے؟ اور جس صورت میں کلام منع ہے تو کلام سے دنیوی کلام مراد ہے یا دینی بھی؟ اوراگر صرف دنیوی کلام منع ہو تو منبر پر خطیب کے بیٹھنے کے بعد اذان کا قولی جواب دینا امام اور مقتدیوں دونوں کے لئے مسنون ہے یا صرف امام کے لئے؟ اور جب قولی جواب دینا حدیث صحیح و کتب فقہ سے ثابت ہو تو بعض کتب فقہ کا اس کو مکروہ لکھنا بے اصل اور بلا دلیل ہے یا نہیں؟ بینوا بیانا شافیا، توجروا

جواب:……اقول وبہ نستعین ، الجواب الوسیط بغیر افراط وتفریط:

آپ ﷺ کے زمانہ میں اذان جمعہ کتنی تھیں؟

جواب سوال اول کا یہ ہے کہ: حضوراکرم ﷺ کے مبارک زمانہ میں جمعہ کی دو اذانیں تھیں: ایک اذان جب حضور انور ﷺ منبر پر بیٹھتے، اور دوسری خطبہ سے فارغ ہونے کے بعد جسے اقامت کہا جاتا ہے۔

آنحضرت کے مبارک زمانے میں اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے عہد خلافت میں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی ایک عرصہ تک یہی طریقہ جاری

رہا، پھر جب مسلمانوں کی کثرت ہوئی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک اذان اور زیادہ کی جو زوراء پر کہی جاتی تھی۔اس حدیث کو''بخاری''اور''نسائی''اور''ابوداؤد'' نے روایت کیا جیسا کہ''منتقی''میں ہے:

وعن السائب بن يزيد رضى الله عنه قال : كان النداء يوم الجمعة اوله إذا جلس الإمام على المنبر على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم وابى بكر وعمر، فلما كان عثمان وكثر الناس زاد النداء الثالث على الزوراء ، رواه البخارى والنسائى وابوداؤد ، ولأحمد والنسائى : كان بلال يؤذن إذا جلس النبى صلى الله عليه وسلم على المنبر ويقيم إذا نزل۔[۱]

یعنی سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے عہد خلافت میں جمعہ کے روز پہلی اذان اس وقت ہوتی جب امام منبر پر خطبہ کے لئے بیٹھتا، پھر جب کہ عثمان رضی اللہ عنہ کا زمانہ ہوا اور لوگ زیادہ ہوگئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک تیسری اور اذان بڑھائی زوراء پر۔

اور احمد اور نسائی کی روایت میں ہے کہ: بلال رضی اللہ عنہ اذان کہتے جبکہ نبی ﷺ منبر پر بیٹھتے، اور اقامت کہتے جب حضرت ﷺ منبر سے اترتے۔

اور''تعليق الممجد''میں ہے:عند ابن خزيمة كان الأذان على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم وابى بكر وعمر أذانين يوم الجمعة۔

یعنی''صحیح ابن خزیمہ''میں ہے کہ اذان جمعہ رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں صرف دو اذانیں تھیں۔

[۱]......بخاری، باب الاذان يوم الجمعة ، رقم الحديث :۹۱۲۔نسائی، باب الاذان للجمعة ، رقم الحديث:۱۳۹۲۔ابوداؤد، باب النداء يوم الجمعة ، رقم الحديث:۱۰۸۷۔

قال ابن خزيمة يريد الأذان والإقامة اوله إذا خرج الإمام والاثانی إذا اقيمت الصلوة ۔یعنی ابن خزیمہ نے کہا کہ: دواذانوں سے مراد ایک اذان وہ ہے جب امام اپنی جگہ سے خطبہ کے لئے نکلے اور دوسری اقامت نماز کی ہے۔[۱]

آپ ﷺ سے اذان کا قولی جواب دینا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے

جواب دوسرے سوال کا یہ ہے کہ: رسول خدا ﷺ سے اذان کا قولی جواب دینا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، اس میں کسی کا اختلاف صحیح طور پر ثابت نہیں، چنانچہ ''مؤطا امام مالک'' اور ''مؤطا امام محمد'' میں بروایت صحیحہ معتبرہ مروی ہے۔

عن ابی سعيد الخدری ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال : إذا سمعتم النداء فقولوا مثل ما يقول المؤذن ۔[۲]

یعنی ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: رسول خدا ﷺ نے فرمایا: جب اذان سنوتو تم بھی مثل قول مؤذن کے کہو۔

اور ''منتقی'' میں اس حدیث کو ذکر کر کے کہا ہے کہ: اس حدیث کو جماعت [۳] نے

---

[۱]......التعليق الممجد على مؤطا محمد ص۱۳۷، باب وقت الجمعة وما يستحب من الطيب والدهان ۔مؤطا الامام مالک مع التعليق الممجد على مؤطا محمد ص۶۰۰ ج۱۔

[۲]......مؤطا امام مالک ص۵۲، باب ما جاء فی النداء للصلوة ۔مؤطا امام محمد ص۸۵، باب الاذان والتثويب۔

[۳]......بخاری، باب ما يقول اذا سمع المنادی ، رقم الحديث :۶۱۱۔مسلم، باب استحباب القول مثل قول المؤذن لمن سمعه ، رقم الحديث :۳۸۳۔ترمذی، باب ما جاء يقول اذا اذن المؤذن ، رقم الحديث :۲۰۸۔نسائی، باب الاذان للجمعة ، رقم الحديث :۶۷۳۔ابوداؤد، باب ما يقول اذا سمع المؤذن ، رقم الحديث:۵۲۰۔

سوائے ''ابن ماجہ'' کے روایت کیا ہے۔[۱]

پس اس حدیث اور اس کے علاوہ دوسری حدیثوں سے بھی اذان کا جواب دینا ثابت ہوا، بلکہ علامہ لکھنوی رحمہ اللہ نے ''تعلیق المجد ''میں متقدمین حنفیہ سے اذان کے جواب دینے کو واجب ثابت کیا ہے۔ان کی عبارت یہ ہے:

استدل به علی وجوب اجابة المؤذن ، حکاه الطحاوی عن قوم من السلف ، وبه قال الحنفية والظاهرية وابن وهب۔[۲]

حیعلتین کے جواب میں لاحول کہنا چاہئے

مگر یہ بات بتا دینا ضروری ہے کہ اگر چہ حدیث مذکور سے ثابت ہوتا ہے کہ جو کلمات مؤذن کہے وہی کلمات مجیب بھی جواب میں کہتا چلا جائے ،مگر دوسری حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ'' حی علی الصلوة ''اور''حی علی الفلاح '' کے جواب میں'' لا حول ولا قوة إلا بالله'' کہے جیسے کہ علامہ لکھنوی رحمہ اللہ نے ''تعلیق'' میں تصریح کی ہے۔

ان کی عبارت یہ ہے:

قوله مثل ما یقول الخ ، ظاهره : انه یقول مثله فی جمیع الکلمات ، لکن حدیث عمر وحدیث معاوية فی البخاری وغیره دل علی انه یستثنی من ذلک حی علی الصلوة وحی علی الفلاح ، فیقول بدلها لا حول و لا قوة إلا بالله ، وهو المشهور عند الجمهور۔[۳]

---

[۱]......ابن ماجہ میں بھی یہ روایت موجود ہے، باب السنة فی الاذان ، رقم الحدیث:۷۲۰۔

[۲]......التعليق الممجد علی مؤطا محمد ص۸۵، باب الاذان والتثویب۔مؤطا الامام مالک مع التعليق الممجد علی موطا محمد ص۳۵۴ ج۱۔

[۳]......التعليق الممجد علی مؤطا محمد ص۸۵، باب الاذان والتثویب۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث یہ ہے:

وعن عمر بن الخطاب رضى الله تعالى عنه قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : إذا قال المؤذن : الله اكبر الله اكبر، فقال احدكم : الله اكبر الله اكبر، ثم قال : اشهد ان لا إله إلا الله ، قال : اشهد ان لا إله إلا الله ، ثم قال : اشهد ان محمدا رسول الله ، قال : اشهد ان محمداً رسول الله ، ثم قال : حى على الصلوة ، قال : لا حول ولاقوة إلا بالله ، ثم قال : حى على الفلاح ، قال : لاحول ولا قوة إلا بالله ، ثم قال : الله اكبر الله اكبر، قال : الله اكبر الله اكبر، ثم قال : لا إله إلا الله ، قال : لاإله إلا الله ، من قلبه دخل الجنة ، رواه مسلم وابوداؤد۔[۱]

یعنی عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ: جناب رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ: جب مؤذن ''الله اكبر، الله اكبر '' کہے تو تم بھی ''الله اكبر، الله اكبر '' کہو، پھر جب مؤذن ''اشهد ان لا إله إلا الله '' کہے تو تم بھی ''اشهد ان لا إله إلا الله '' کہو، پھر جب مؤذن ''اشهد ان محمدا رسول الله '' کہے تو تم بھی ''اشهد ان محمدا رسول الله'' کہو اور جب ''حى على الصلوة' کہے تو تم ''لاحول ولا قوة إلا بالله'' کہو، پھر جب وہ ''حى على الفلاح '' کہے تو تم ''لاحول ولا قوة إلا بالله'' کہو، اور جب ''الله اكبر، الله اكبر '' کہے تو تم بھی ''الله اكبر، الله اكبر '' کہو، جب مؤذن ''لا إله إلا الله '' کہے تو تم بھی ''لا إله إلا الله '' کہو اپنے دل سے تو داخل ہوں گے جنت میں۔ روایت کیا اس کو ''مسلم'' اور ''ابوداؤد'' نے۔

اسی طرح اذان کا جواب دینا حدیث ابی سعید خدری رضی اللہ عنہ سے جو اوپر مذکور ہوئی

[۱]...... مسلم، باب استحباب القول مثل قول المؤذن لمن سمعه ، رقم الحديث :۳۸۵۔ ابوداؤد، باب ما يقول اذا سمع المؤذن ، رقم الحديث:۵۲۵۔

ثابت ہے۔ پس ان حدیثوں سے ثابت ہوا کہ ہراذان کا جواب دینا مسنون ہے، عام اس سے کہ وہ پہلی اذان منارہ والی ہو یا دوسری اذان منبر پر خطیب کے بیٹھنے کے بعد والی ہو، کیونکہ حدیث ’’ إذا سمعتم النداء فقولوا : مثل ما يقول المؤذن ‘‘ عام ہے۔ یہ دونوں اذانیں اس کے عموم میں داخل ہیں، اور کسی صحیح حدیث مرفوع متصل السند سے کسی اذان کی تخصیص اور استثناء ثابت نہیں۔

منقطع وغیر متصل معارض ومخصص، مرفوع متصل السند کی نہیں ہوسکتی

جواب تیسرے سوال کا: حدیث منقطع اور غیر متصل معارض اور مخصص حدیث مرفوع متصل السند کی نہیں ہوسکتی، چنانچہ کتب اصول میں مذکور ہے، بالخصوص علامہ لکھنوی رحمہ اللہ نے ’’ تعليق الممجد ‘‘ میں لکھا ہے: وهو غير جار على قاعدتنا ، لأن عندنا المخصص للأول مالم يكن متصلا به يخصص ، الخ ۔[۱]

اور ’’تفسیر احمدی‘‘ میں ہے: لأن النص مطلق فلا يتقيد من غير دليل الخصوص انتهى ۔[۲]

پس جواب اذان کو اذان اول منارہ والی کے ساتھ مقید کرنا اور اذان منبری کو جواب سے مستثنی کرنا اور اس جواب دینے کو مکروہ کہنا دعوی بلا دلیل اور نقل بلا اصل ہے۔

خطیب کے نکلنے کے وقت کون سا کلام مکروہ ہے اور کن سا مکروہ نہیں

جواب چوتھے سوال کا: جب خطیب منبر پر آنے کے لئے اپنی جگہ سے چلے تو اس وقت

---

[۱]......التعليق الممجد على مؤطا محمد ص۸۵، باب الاذان والتثويب۔مؤطا الامام مالک مع التعليق الممجد على موطا محمد ص۳۵۴ ج۱۔

[۲]......تفسیر احمدی ص۔

کلام اور نماز منع نہیں ہے، بلکہ منبر پر خطیب کے بیٹھ جانے کے بعد،مگر خطبہ شروع کرنے سے پہلے بھی نماز اور کلام منع نہیں ہے، ہاں خطبہ شروع کرنے کے بعد نماز اور کلام منع ہے، اور جو کلام منع ہے وہ بھی دنیوی کلام منع ہے دینی کلام ہر گز منع نہیں ہے، چنانچہ علامہ شامی نے ''حاشیہ درمختار'' میں لکھا ہے:

قوله (ولا كلام) اى من جنس كلام الناس اما التسبيح ونحوه فلا يكره ، وهو الأصح كما فى النهاية والعناية۔[۱]

اذان منبر کا جواب

پس جب کلام دینی منع نہیں ہے تو خطیب کے سامنے والی اذان کا جواب دینا مسنون، بلکہ بنا بر مذہب اصح کے واجب ہے مثل جواب دینے دوسری اذانوں کے۔ پس اس سے واضح ہوا کہ جو لوگ منبر کے سامنے والی اذان کا جواب دینا مکروہ کہتے ہیں ان کا قول بے اصل اور بلا دلیل ہے،اور'' تعليق الممجد '' میں قول زہری کے تحت میں تصریح ہے:

قال محمد : اخبرنا مالک حدثنا الزهرى قال : خروجه يقطع الصلوة وكلامه يقطع الكلام ، (قوله يقطع الكلام) بهذا أخذ ابويوسف ومحمد ومالک والجمهور ، وقال ابوحنيفة : يجب الانصات بخروج الإمام ' كذا فى المرقاة ، وفى النهاية والبناية وغيرهما عن العون ، اختلف المشائخ على قوله ' فقال بعضهم يكره كلام الناس ، اما التسبيح وغيره فلا يكره ، وقال بعضهم يكره ذلک كله ، والاول اصح انتهى ، قلت : بهذا يظهر ضعف ما فى الدر المختار نقلا عن النهر الفائق ، ينبغى ان لا يُجيبَ بلسانه اتفاقا فى الأذان بين يدى الخطيب ' وان يجيب اتفاقا فى

[۱]......شامی ص۳۴ ج۳،باب الجمعة۔(ط: مكتبة دار الباز ، مكة المكرمة)

الأذان الأول يوم الجمعة انتهى، وجه الضعف اما اولا فلانه لا وجه لعدم الاجابة عندهما لأنه لا يكره عندهما الكلام الدينى قبل الشروع فى الخطبة ، بل لا يكره الكلام مطلقا عندهما ' قبله على ما نقله جماعة بخلاف ما ينقله صاحب العون وغيره ، واما ثانيا فلأ نه لا وجه لعدم الاجابة على مذهبه ايضا على ما هو الأصح انه لا يكره الكلام مطلقا بل الكلام الدنيوى لا الدينى ، وقد ثبت فى صحيح البخارى : ان معاوية رضى الله تعالى عنه اجاب الأذان وهو على المنبر' وقال : يا ايها الناس انى سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم على هذا المجلس حين أذن المؤذن يقول مثل ما سمعتم منى مقالتى، وإذا ثبت الاجابة عن صاحب الشرع وصاحبه فما معنى الكراهة۔ [۱]

یعنی زہری رحمہ اللہ نے کہا: نکلنا خطیب کا قطع کرتا ہے نماز کو اور کلام خطیب کا قطع کرتا ہے کلام کو، اسی کو اختیار کیا ہے ابو یوسف اور محمد اور مالک رحمہم اللہ اور جمہور نے، اور جناب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: امام کے نکلنے کے وقت سے سکوت واجب ہے، اسی طرح ''مرقاۃ شرح مشکوۃ'' میں ہے، اور ''نہایہ'' اور ''بنایہ'' وغیرہما میں ہے کہ: اختلاف کیا ہے مشائخ نے امام صاحب کے قول کے بیان میں، بعض نے کہا کہ: کلام الناس مکروہ ہے اور تسبیح وغیرہ مکروہ نہیں ہے، اور بعض نے کہا کہ: ہر کلام مکروہ ہے یعنی کلام دینی ہو یا دنیوی دونوں مکروہ ہیں، اور قول اول اصح ہے (یعنی کلام دنیوی مکروہ ہے نہ کہ کلام دینی) اور ''کفایہ'' وغیرہ میں بحوالہ عون کے منقول ہے کہ: مراد کلام متنازعہ فیہ سے اجابۃ اذان ہے، پس مکروہ ہے نزدیک امام کے نہ کہ نزدیک صاحبین کے، اور اجابۃ اذان کے سوا اور سب

---

[۱]......التعليق الممجد على مؤطا محمد ص۱۳۷، باب وقت الجمعة وما يستحب من الطيب والدهان۔مؤطا الامام مالک مع التعليق الممجد على موطا محمد ص۶۰۴ ج۱۔

کلام مکروہ ہے اجماعا، انتہی۔

میں کہتا ہوں کہ: اس تقریر سے ''درالمختار'' کے اس قول کا جو''نہر الفائق'' سے منقول ہے ضعف ظاہر ہوگیا، وہ قول یہ ہے کہ: جمعہ کے روز خطیب کے سامنے والی اذان کا جواب دینے کا عدم وجوب مناسب ہے، اور پہلی اذان کی اجابت بالاتفاق واجب ہے، انتہی۔

وجہ ضعف کی اولاً یہ ہے کہ: صاحبین کے مذہب کے موافق اذان منبری کی عدم اجابت کی کوئی وجہ نہیں، کیونکہ ان کے نزدیک خطبہ شروع کرنے سے پہلے کلام دینی ممنوع نہیں ہے جیسا کہ ایک جماعت علماء نے ان سے نقل کیا ہے، ہاں صرف صاحب عون نے اس کا خلاف ان سے نقل کیا ہے۔ اور ثانیاً یہ کہ امام صاحب رحمہ اللہ کے اصح مذہب کے موافق ان کے نزدیک بھی اجابت اذان کے مکروہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں، کیونکہ اصح یہی ہے کہ ان کے نزدیک بھی کلام دنیوی مکروہ ہے نہ دینی۔

اور ''صحیح بخاری'' میں ہے کہ: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے منبر پر اذان منبری کا جواب دے کر فرمایا: تحقیق میں نے رسول خدا ﷺ سے سنا کہ: آپ بھی مؤذن کے جواب میں یہی کلمات فرماتے جاتے تھے جو تم نے مجھ سے سنے۔ پس جب کہ اذان منبری کی اجابت صاحب شرع اور ان کے صحابی سے ثابت ہوگئی تو پھر اس کے مکروہ ہونے کے کیا معنی؟

اگر کہا جائے کہ بعض صحابہ بھی اذان منبری کی اجابت کو مکروہ کہتے ہیں جیسا کہ کتب حدیث میں ثابت ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ قول صحابی ہمارے نزدیک حجت ہے اور اس کی تقلید واجب ہے، مگر جب کہ کوئی حدیث مرفوع اس کے منافی نہ ہو، اور یہاں حدیث مرفوع موجود ہے جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے، ''شامی'' جلد اول میں ہے:

والحاصل ان قول الصحابی حجة یجب تقلیده عندنا إذا لم ینفه شیء آخرمن السنة ۔[۱]

عمل معاویہ رضی اللہ عنہ سے استدلال پر اشکال اور اس کا جواب

اگر کہا جاوے کہ حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ سے اگر چہ اذان منبری کا جواب دینا ثابت ہوا، مگر امام اور خطیب کے لئے ثابت ہوا، دوسرے حاضرین کے لئے جواز اس سے ثابت نہیں ہوتا، اور حدیث ’’ إذا خرج الإمام فلا صلوة ولا کلام ‘‘ سے جو ’’ہدایہ‘‘ میں مرفوعاً روایت کی گئی ہے سے حاضرین کے لئے ممانعت ثابت ہوتی ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ: اس حدیث کی کوئی اصل نہیں ہے، جیسا کہ علامہ لکھنوی اور زیلعی رحمہما اللہ نے اس کی تصریح کی ہے، چنانچہ زیلعی رحمہ اللہ شرح ہدایہ میں فرماتے ہیں:

حدیث ’’ إذا خرج الإمام فلا صلوة ولا کلام ‘‘ لم اجده ، وقد قال البیهقی : رفعه وهم ، وانما هو من کلام الزهری، الخ۔[۲]

یعنی یہ حدیث کہ ’’جب امام نکلے تو نہ نماز ہے نہ کلام‘‘ میں نے اسے نہیں پایا، اور بیہقی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: اس کو مرفوع بیان کرنا وہم ہے، بلکہ یہ زہری رحمہ اللہ کا کلام ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ اس حدیث ہدایہ پر اگر دھوکا کھا کے حدیث معاویہ اور حدیث ابوسعید خدری کا کوئی معارضہ کرے تو اس کا قول صحیح نہیں، بلکہ اذان منبری کے جواب دینے کی تائید میں علامہ عبدالحی مرحوم نے ’’عمدۃ الرعایہ حاشیہ شرح وقایہ‘‘ میں لکھا ہے:

واما الکلام فانما یکره منه قبل شروع الخطبة الدنیوی لا الدینی کألاذکار

---

[۱]......شامی ص۳۴ ج۳، باب الجمعة۔ (ط: مکتبة دار الباز ، مکة المکرمة)۔

[۲]......شرح ہدایہ ص۱۸۱ ج۱، قبیل باب العیدین۔

والتسبيح بعد الشروع فيها يكره مطلقا ' هذا هو الأصح كما في النهاية وغيره ، فلا تكره اجابة الأذان الذى يؤذن بين يدى الخطيب ، وقد ثبت ذلک من فعل معاوية فى صحيح البخارى ولا دعاء الوسيلة الماثورة بعد ذلک الأذان هذا عند ابى حنيفة ، وعندهما لا بأس بالكلام الدنيوى إذا خرج الإمام قبل أن يشرع فى الخطبة الخ۔[1]

یعنی کلام کرنا جومکروہ ہے قبل شروع کرنے خطبہ کے وہ کلام دنیوی ہے اور کلام دینی مکروہ نہیں ہے مثل اذکار اور تسبیح کے، اور بعد شروع کرنے خطبہ کے مکروہ ہے مطلقاً، اور یہی اصح ہے جیسا کہ ''نہایہ'' وغیرہ میں ہے، پس نہیں مکروہ ہے جواب دینا اذان کا جو منبر کے سامنے کہی جاتی ہے خطیب کے روبرو، اور یہ جواب دینا ثابت ہے فعل معاویہ (رضی اللہ عنہ) سے صحیح بخاری میں، اور اسی طرح نہیں مکروہ ہے دعائے وسیلہ جو منقول ہے بعد اسی اذان کے اور (یہ نزدیک امام ابی حنیفہ رحمہ اللہ کے ہے)

اور صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک کلام دنیوی میں بھی مضائقہ نہیں، جبکہ امام خطبے کے لئے نکلے، لیکن ابھی خطبہ شروع نہ ہوا ہو، اور اس پر یہ حدیثیں دلیل ہیں:

عن أبي هريرة رضى الله تعالى عنه : ان النبى صلى الله عليه وسلم قال : إذا قلت لصاحبک يوم الجمعة : انصت والإمام يخطب فقد لغوت ، رواه الجماعة الا

---

[1]......شرح وقایہ ص۲۰۲ ج۱، قبیل باب العيدين۔

[2]......بخاری، باب الانصات يوم الجمعة والامام يخطب ، رقم الحديث:۹۳۴۔مسلم، باب فى الانصات يوم الجمعة فى الخطبة ، رقم الحديث :۸۵۱۔ترمذی، باب جاء فى كراهية الكلام والامام يخطب ، رقم الحديث:۵۱۲۔نسائی، باب الانصات للخطبة يوم الجمعة ، رقم الحديث : ۱۴۰۲۔ابوداؤد، باب الكلام والامام يخطب ، رقم الحديث:۱۱۱۲۔ابن ماجہ میں بھی یہ روایت موجود ہے، باب ما جاء فى الاستماع للخطبة والانصات لها ، رقم الحديث:۱۱۱۰۔

ابن ماجة۔ [۲]

یعنی جب تو امام کے خطبہ ادا کرنے کی حالت میں اپنے ساتھی سے کہے کہ خاموش رہو تو' تو نے لغو کام کیا۔اس حدیث کو جماعت نے سوائے''ابن ماجہ'' کے روایت کیا ہے۔

وعن علی رضی اللہ تعالی عنه فی حدیث له قال : من دنا من الإمام فلغا ولم یسمع ولم ینصت کان علیه کفل من الوزر ' ومن قال : صه فقد لغا ' ومن لغا فلا جمعة له ' ثم قال : ھکذا سمعت نبیکم صلی الله علیه وسلم ، رواہ احمد وأبوداؤد۔[۱]

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: جو شخص امام سے قریب ہو اور لغو کام کرے اور خطبہ نہ سنے نہ خاموش رہے تو اس پر ایک حصہ گناہ ہے، اور جو شخص دوسرے کو کہے خاموش رہ اس نے بھی لغو کام کیا، اور جس نے لغو کام کیا اس کا جمعہ نہیں ہوا، پھر فرمایا کہ: میں نے تمہارے نبی ﷺ سے ایسے ہی سنا ہے۔اس کو احمد وابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

وعن ابن عباس رضی الله عنھما قال : قال رسول الله صلی الله علیه وسلم : من تکلم یوم الجمعة والامام یخطب فھو کمثل الحمار یحمل اسفارا الذی یقول له انصت لیس له جمعة ، رواہ احمد۔[۲]

اور روایت ہے ابن عباس سے کہا کہ: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جو کلام کرے جمعہ کے روز جس وقت کہ امام خطبہ ادا کرتا ہو تو وہ آدمی مثل گدھے کے ہے بوجھ دار، اور جو کہے کسی کو چپ رہ تو اس کے واسطے جمعہ نہیں ہے۔روایت کیا اس کو احمد نے۔

وعن ابی الدرداء رضی اللہ عنه قال : جلس النبی صلی الله علیه وسلم یوما

---

[۱]......ابوداؤد، باب فضل الجمعة ، رقم الحدیث:۱۱۱۲۔مسند احمد بن حنبل، رقم الحدیث:۷۱۹۔

[۲]......مسند احمد بن حنبل، رقم الحدیث :۷۱۹۔کنز العمال ،رقم الحدیث :۲۱۲۰۶/۲۱۲۱۳۔مشکوۃ، باب الجمعة ، باب التنظیف و التبکیر۔مظاہر حق ص۹۰۶ ج۱۔

علی المنبر ' فخطب الناس وتلا آیة ' والی جنبی ابی بن کعب ، فقلت : یا ابیّ! متی نزلت ھذه الآیة ؟ فابی ان یکلمنی ، ثم سألته فابی ان یکلمنی حتی نزل رسول الله صلی الله علیه وسلم ، فقال لی ابیّ : مالک من جمعتک إلا ما لغیت ، فلما انصرف رسول الله صلی الله علیه وسلم جئته فاخبرته فقال : صدق ابیّ ، فاذا سمعت اماما یتکلم فانصت حتی یفرغ ، رواہ احمد منتقی۔ [1]

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ایک روز آنحضرت ﷺ منبر پر بیٹھے پھر خطبہ شروع فرمایا، اور ایک آیت پڑھی، میرے پہلو میں ابی بن کعب بیٹھے تھے، میں نے ان سے کہا کہ: اے ابی! یہ آیت کب اتری ہے؟ انہوں نے کلام نہ کیا، پھر میں نے دریافت کیا پھر انہوں نے کلام نہیں کیا، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ منبر سے اترے، پھر مجھ سے ابی نے کہا کہ: آج جمعہ سے آپ کو سوائے اس لغو کام کے کچھ حاصل نہ ہوگا، جب رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ماجرا عرض کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ابی نے سچ تو کہا، جب تم امام کو کلام کرتے یعنی خطبہ پڑھتے سنا کرو تو خاموش رہا کرو یہاں تک کہ امام فارغ ہوجائے۔ اسے امام احمد نے روایت کیا ہے۔ ''منتقی'' میں اسی طرح ہے۔

ان تمام حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ جب امام خطبہ شروع کردے اس وقت کلام کرنا ممنوع ہوتا ہے اس سے پہلے نہیں، اور زہری رحمہ اللہ کا قول'' خروجه یقطع الصلوۃ وکلامه یقطع الکلام '' بھی اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ خطبہ شروع کرنے کے بعد کلام ممنوع ہے اس سے پہلے نہیں، پس اس سے اذان منبری کا جواب دینا اور اذان کے بعد دعا

[1] ...... مسند احمد بن حنبل، رقم الحدیث: ۲۱۷۳۱۔

کرنا جائز ثابت ہوا۔

اذان خطبہ کے جواب کو مکروہ کہا جائے تو اذان منبری کو مکروہ کہنا پڑے گا

اگر کوئی کہے کہ صاحب ہدایہ نے کہا کہ:’’ إذا خرج الامام فلا صلوة ولا کلام‘‘ حدیث ہے، اور اس کی وجہ سے اذان منبری کی اجابت مکروہ ہے، تو جواب یہ ہے کہ: اول تو یہ مسلم نہیں کہ یہ حدیث مرفوع ہے جیسے سابق میں اس کی تصریح گزر چکی، اور اگر بالفرض اسے حدیث تسلیم بھی کرلیا جائے تاہم اجابت اذان کو مکروہ کہنے والوں کے لئے مفید نہیں، بلکہ ان کی مثال ایسی ہوگی کہ’’ بارش کے قطروں سے بھاگ کر پرنالے کے نیچے کھڑے ہوگئے‘‘ کیونکہ اگر اس حدیث سے مطلقاً کلام کی کراہت ثابت کی جائے اور اس میں اجابت اذان کو بھی داخل مانا جائے تو لازم آتا ہے کہ خود اذان منبری بھی مکروہ ہو، کیونکہ آخر یہ اذان بھی تو امام کے نکلنے بلکہ منبر پر بیٹھنے کے بعد کہی جاتی ہے، حالانکہ آج تک کوئی اس کا قائل نہیں ہوا، یہ کیوں؟ صرف اس وجہ سے کہ اذان احادیث صحیحہ سے ثابت ہے جیسا کہ اوپر گزر چکا، اس کے علاوہ جو کلام مکروہ ہے وہ کلام دنیوی ہے اور اذان کا جواب دینا کلام دنیوی نہیں ہے۔

دوران خطبہ کلام دینی کا ثبوت

اور کلام دینی خطبہ شروع ہونے سے پہلے مکروہ ہونے کی تو کوئی وجہ ہی نہیں، بلکہ کلام دینی تو درمیان خطبہ کے بھی احادیث صحیحہ سے ثابت ہے جیسا کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ خطبہ پڑھتے تھے کہ ایک صحابی [۱] نے بارش کی دعا کرنے کے لئے عرض کیا، [۲] پھر

۱......حضرت کعب بن مرہ یا حضرت خارجہ بن حصین رضی اللہ عنہما۔ (بذل المجھود ص۲۸۴ج۵)

۲......حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص مسجد میں جمعہ کے روز دار القضا کی

اگلے جمعہ کو بارش کی موقوفی کے لئے دعا کے واسطے درخواست کی۔ [۱]

طرف والے دروازہ سے داخل ہوئے، رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے خطبہ دے رہے تھے، وہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ: یارسول اللہ! مال مویشی ہلاک ہوگئے (خشک سالی کی وجہ سے) اور راستے منقطع ہوگئے، سو اللہ تعالی سے دعا کیجئے کہ ہمارے لئے بارش برسادے، رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور فرمایا: اے اللہ! ہم پر بارش برسادے، اے اللہ! ہم پر بارش برسادے، اے اللہ! ہم پر بارش برسادے، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: اللہ کی قسم! ہم آسمان پر کوئی بادل یا بدلی نہ دیکھتے تھے اور ہمارے اور (جبل) سلع کے درمیان کوئی گھر یا محلّہ نہ تھا (آسمان بالکل صاف تھا اور سلع تک بالکل صاف نظر آرہا تھا) کہ اچانک سلع کے پیچھے سے ایک بدلی نکلی ایک ڈھال کی مانند اور جب آسمان کے وسط میں پہنچی تو پھیل گئی اور بارش ہونے لگی، اللہ کی قسم! پھر ہم نے ہفتہ بھر سورج نہ دیکھا (اور ہفتہ بھر رسول اللہ ﷺ کی دعا سے بطور معجزہ مدینہ میں بارش برستی رہی) پھر اگلے جمعہ کو وہی شخص اسی دروازہ سے مسجد میں داخل ہوئے، رسول اللہ ﷺ کھڑے خطبہ دے رہے تھے، وہ آپ ﷺ کے سامنے کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ: یا رسول اللہ! (بارش کی کثرت سے) مال مویشی ہلاک ہوگئے اور راستے مسدود ہوگئے، اللہ سے دعا کیجئے کہ پانی روک دیں، رسول اللہ ﷺ نے ہاتھ اٹھائے اور فرمایا: اے اللہ! ہمارے اردگرد برسا ہم پر نہ برسا' اے اللہ! ٹیلوں' بلندیوں' نالوں اور درختوں کے اگنے کی جگہوں میں برسا، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: فوراً ہی بارش رک گئی اور ہم مسجد سے نکلے تو دھوپ میں نکلے۔

(بخاری، باب الدعاء اذا كثر المطر : حوالينا ولا علينا ، رقم الحديث:۱۰۲۱۔ مسلم، باب الدعاء فی الاستسقاء ، رقم الحديث:۸۹۷۔ ابوداؤد، باب رفع اليدين فی الاستسقاء ، رقم الحديث: ۱۱۷۵)

[۱]......حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت سلیک غطفانی رضی اللہ عنہ مسجد میں آئے جبکہ حضور ﷺ خطبہ دے رہے تھے، آپ ﷺ نے پوچھا: کیا تم نے نماز پڑھی؟ انہوں نے کہا: نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: مختصر دو رکعتیں پڑھ لو۔ (تحفۃ المعبود ص۱۳۸ ج۱)

بخاری، باب اذا رأى الامام رجلا جاء وهو يخطب امره ان يصلی ركعتين ، رقم الحديث: ۹۳۰ مسلم، باب التحية والامام يخطب ، رقم الحديث :۸۷۵۔ ترمذی، باب ما جاء فی الركعتين اذا

اسی طرح ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے خطبہ کے درمیان میں ایک صحابی کو تحیۃ المسجد پڑھنے کا حکم فرمایا اور اس صحابی کا جواب دینا بھی حدیث صحیح سے ثابت ہے۔[۱]

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ کی حالت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے دربارہ تاخیر و غسل (یعنی دیر سے آنے اور غسل جمعہ نہ کرنے کی وجہ سے) کلام کیا۔[۱]

اور اسی قسم کی اور حدیثیں بھی بہت ہیں، پھر اذان منبری کا جواب دینا حدیث ''إذا سمعتم النداء فقولوا مثل ما يقول المؤذن'' کے عموم میں داخل ہے، اور اس حدیث کو جماعت نے سوائے ابن ماجہ کے روایت کیا ہے، اور حدیث معاویہ تو ''بخاری شریف'' میں موجود ہے [۲] اور جبکہ ایسے قوی دلائل سے اذان منبری کی اجابت کا جواز ثابت ہو گیا تو اب کس کی مجال ہے کہ اسے مکروہ کہے، کیونکہ ان دلائل کے مقابلہ میں کوئی حدیث مخصص وارد نہیں ہوئی، اور جب کہ جواز اجابت کی حدیثیں مطلق ہیں، تو خاص اس اذان کی اجابت کو مکروہ بتانے والی حدیث مخصص اور مقید ہوگی اور ایسی کوئی روایت نہیں۔

''تفسیر احمدی'' میں ہے:

لان النص مطلق فلا يتقيد من غير دليل الخصوص، انتهى۔[۳]

اور چونکہ حدیث'' فقولوا مثل ما يقو ل المؤذن '' اپنے عموم کی وجہ سے منبر والی اذان کو بھی شامل ہے اس لئے اذان منبری کا جواب دینا بھی اس قولی حدیث سے ثابت ہو گیا۔

جاء الرجل والامام يخطب ، رقم الحديث :۵۱۰۔نسائی، باب الصلوة يوم الجمعة لمن جاء وقد خرج الامام ، رقم الحديث:۱۳۹۶۔ابوداؤد، باب اذا دخل الرجل والامام يخطب ، رقم الحديث : ۱۱۱۵۔ابن ماجہ، باب ما جاء فيمن دخل المسجد والامام يخطب ، رقم الحديث:۱۱۱۲۔

[۱]......طحاوی ص۱۵۳ ج۱، باب غسل يوم الجمعة ، رقم الحديث:۶۹۰۔

[۲]......بخاری ص۱۲۵ ج۱، باب يجيب الامام على المنبر اذا سمع النداء ، رقم الحديث:۹۱۴۔

[۳]......تفسیر احمدی ص، تحت الآیۃ : سورۃ۔

اور ایک عمدہ دلیل

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اذان اول آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں نہ تھی پھر اس کی اجابت کو بحکم ''فقولوا مثل ما یقول المؤذن '' کے مسنون کہنا اور اذان منبری جو آنحضرت ﷺ کے زمانۂ مبارک میں ہوتی تھی اور اسی وقت بلا تفصیل حضور انور نے ''فقولوا مثل ما یقول المؤذن '' فرمایا تھا اس کے جواب کو مکروہ کہنا کس قدر بے انصافی اور ہٹ دھرمی ہے؟

اس کے علاوہ جناب امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ: '' إذا صح الحديث فهو مذهبى '' تو احادیثِ صحیح کا خلاف کرنا اور اپنے امام کا نافرمان بننا نفسانیت نہیں تو اور کیا ہے؟

بعض لوگوں نے حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ کا جواب یہ دیا ہے کہ اس حدیث سے امام کا جواب دینا ثابت ہوتا ہے دوسروں کا جواب دینا ثابت نہیں، مگر یہ جواب بھی صحیح نہیں، اور ان بعض کا یہ قول دعویٰ بلا دلیل ہے اور دعویٰ بلا دلیل باطل ہے؟ کیونکہ حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابل میں کوئی حدیث صحیح مرفوع متصل السند اس درجہ کی پائی نہیں جاتی، اور قول زہری رحمہ اللہ سے حدیث معاویہ کی تخصیص کرنی بے اصل اور خلاف نقل ہے، کیونکہ زہری رحمہ اللہ نہ صحابی ہیں نہ تابعی، ان کا قول حدیث مرفوع متصل السند یعنی حدیث معاویہ کا مخصص کیسے بن سکتا ہے؟ ''شامی'' وغیرہ کتب اصول میں ہے کہ قول صحابی حجت ہے، مگر جب کہ اس کے منافی کوئی حدیث نہ ہو، جب قول صحابی کا یہ حال ہے تو زہری رحمہ اللہ کس شمار میں ہیں؟ ''والحاصل ان قول الصحابى حجة يجب تقليده عندنا إذا لم ينفه شئ آخر من السنة '' پھر جس طرح قول زہری کے حدیث معاویہ منافی ہے اسی طرح

حدیث'' فقولوا مثل ما یقول المؤذن '' بھی منافی ہے،اور یہ حدیث اس درجہ کی قوی اور متصل السند اور مرفوع ہے کہ تمام محدثین کی جماعت نے سوائے'' ابن ماجہ'' کے اسے روایت کیا۔

دوران خطبہ درود شریف پڑھنے کا حکم

مسئلہ:...... جب خطیب خطبہ میں'' صلوا علیہ '' کہے(یعنی درود پڑھو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر) تو سامعین آہستہ درود شریف پڑھیں،جیسا کہ'' شرح وقایہ'' میں ہے:إلا إذا قرأ قوله : صلوا علیه ' فیصلی سرا ،پس حالت خطبہ میں جب درود شریف پڑھنا جائز، بلکہ مستحسن ہوا تو قبل خطبہ شروع کرنے کے خطبہ کی اذان کا جواب دینا کیوں جائز نہ ہو، مکروہ ہونے کی کیا وجہ؟اسی طرح'' عمدۃ الرعایہ حاشیہ شرح وقایہ''میں ہے:

''إلا إذا قرأ الآیة المشتملة علی الأمر بالصلوة فح یسر السامع بالصلوة علی النبی صلی الله علیه وسلم وهذا علی سبیل الاستحسان ''[1]

یعنی یہ درود شریف پڑھنے کا حکم درمیان خطبہ کے بطور استحسان ہے۔

جواب پانچویں سوال کا: ناظرین رسالہ ہذا پر واضح ہو کہ اذان منبری کے جواب دینے کا جواز احادیث صحیحہ مرفوعہ متصلہ اور اقوال فقہیہ صحیحہ صریحہ سے ثابت ہو چکا ہے، چنانچہ دلیلیں مع عبارات واضحہ اوپر گزر چکیں،لہذا اجابت اذان منبری کو مکروہ کہنا دعویٰ بلا دلیل ہے اور دعویٰ بلا دلیل باطل ہے جیسا کہ سابق میں ''تعلیق الممجد ''اور'' عمدۃ الرعایہ'' سے بیانِ واضح منقول ہو چکا ہے،عبارت یہ ہے:

'' واما الکلام فإنما یکرہ منه قبل شروع الخطبة الدنیوی لا الدینی کألاذکار

---

[1]...... عمدۃ الرعایۃ حاشیہ شرح وقایہ ص ج ۱،حاشیہ نمبر: قبیل باب العیدین۔

والتسبیح بعد الشروع فیہ یکرہ مطلقاً ھذا ھو الأصح کما فی النھایة وغیرہ ، فلا تکرہ اجابة الأذان الذی یؤذن بین یدی الخطیب ، وقد ثبت ذلک من فعل معاویة فی صحیح البخاری ولا دعاء الوسیلة الماثورة بعد ذلک الأذان ھذا عند ابی حنیفة ، وعندھما لا بأس بالکلام الدنیوی إذا خرج الإمام قبل أن یشرع فی الخطبة وإذا نزل قبل أن یکبر ' لأن الکراھة للاخلال بالاستماع ولا استماع ھھنا کذا فی جامع الرموز" [۱]

یعنی خطبہ شروع کرنے سے پہلے کلام دنیوی مکروہ ہے، کلام دینی جیسے اذکار اور تسبیح تو وہ خطبہ شروع کرنے سے پہلے مکروہ نہیں ہے، ہاں خطبہ شروع کرنے کے بعد مطلقاً کلام مکروہ ہے اور یہی اصح ہے جیسا کہ ''نہایہ'' وغیرہ میں اس کی تصریح ہے، پس اس اذان کا جواب دینا جو خطیب کے سامنے کہی جاتی ہے مکروہ نہیں، اور یہ جواب دینا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے فعل سے ''صحیح بخاری'' میں ثابت بھی ہو چکا ہے، اور دعائے وسیلہ جو اذان کے بعد پڑھنا منقول ہے وہ بھی اس اذان کے بعد مکروہ نہیں، یہ مذہب تو حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ہے، اور صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک امام کے نکلنے کے بعد شروع خطبہ سے پہلے کلام دنیوی بھی ممنوع نہیں اور خطبہ ختم ہونے کے بعد تکبیر نماز سے پہلے بھی مکروہ نہیں، کیونکہ کراہت کی وجہ یہ ہے کہ خطبہ سننے میں کلام سے خلل پڑے گا، اور ان حالتوں میں استماع خطبہ متحقق نہیں ''جامع الرموز'' میں اسی طرح ہے۔

حاصلِ کلام وخیر المراد یہ ہے کہ اذانِ منبری کا جواب دینا مکروہ نہیں ہے اور حدیث ''إذا خرج الإمام'' کا حدیث ہونا ثابت نہیں جیسا کہ علامہ زیلعی رحمہ اللہ نے تخریج ہدایہ میں

---

[۱]......عمدۃ الرعایۃ حاشیہ شرح وقایہ ص۲۰۲ ج۱، حاشیہ نمبر:۱۰، قبیل باب العیدین۔

اس کے متعلق ''لم اجدہ'' فرمایا ہے اور کہا کہ: یہ زہری کا قول ہے، اور ظاہر ہے کہ زہری نہ صحابی ہیں اور نہ تابعی، اور ان کے ہم مقلد نہیں، اور اس کے خلاف صحیح حدیث ''إذا سمعتم المؤذن'' موجود ہے جسے تمام جماعت محدثین نے سوائے ابن ماجہ کے روایت کیا ہے، اور یہ حدیث اپنے عموم سے اذان منبری کو بھی شامل ہے۔

اور کلام کی ممانعت صرف تین صحابیوں (حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت جابر رضی اللہ عنہم) سے منقول ہے، [1] ان کے علاوہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم جواز کے قائل ہیں۔

دوسرے یہ کہ: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے روز تمام صحابہ کے سامنے اس اذان کا جواب دیا اور پھر آنحضرت ﷺ سے نقل کیا اور کسی نے اس کا انکار نہ کیا، بلکہ سکوت کیا اور سکوت موضعِ بیان میں بیان ہوتا ہے۔

تیسرے یہ بھی ممکن ہے کہ: ان صحابہ رضی اللہ عنہم کے نزدیک بھی جنس کلام کی کراہت منقول ہے، کلام سے کلام دنیوی مراد ہو۔ اور یہ کہنا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے کراہت منقول ہے، اول تو اس لئے مسلم نہیں کہ بنا بر اصح مذہب کے ان کے نزدیک بھی کلام سے دنیوی کلام مراد ہے جیسا کہ ہم پہلے تصریح کر چکے ہیں، نیز فقہاء نے درمیانی خطبہ میں خطیب کے قول ''صلوا علیہ'' پر آہستہ درود پڑھنے کی اجازت دی ہے جسے ہم ''شرح وقایہ'' سے نقل کر چکے ہیں، پس ثابت ہوگیا کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور فقہاء معتمدین کلام دینی کی کراہت کے قائل نہیں ہیں، بلکہ کراہت کا قول صرف صاحب درمختار اور ان کے متبعین نے اختیار کیا ہے، پس جو لوگ کہ اب بھی کراہت کو معتبر سمجھیں ان کو

[1]...... مصنف ابن ابی شیبہ' میں حضرت علی' حضرت ابن عباس' اور حضرت جابر کے بجائے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کا ذکر ہے ''عن ابن عباس و ابن عمر انهم كا نوا يكرهون الصلوة والكلام بعد خروج الامام''۔ (مصنف ابن ابی شیبة ص۱۲۴ ج۲۔ بذل المجهود فی حل سنن ابی داؤد ص۱۵۶ ج۵)

حدیث'' إذا سمعتم المؤذن '' کے عموم کے لئے کوئی معتبر مخصص پیش کرنا چاہئے، ھا توا برھانکم ان کنتم صٰدقین ،

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العٰلمین ، هذا ما ظهر لی والله اعلم بالصواب وعنده علم الکتاب والیه المرجع والمآب ،کتبه :عبد من عباد الله خادم الطلبة القاضی رحمت الله غفر له

خاکسار مؤلف نے مسئلہ معلومہ کے متعلق ایک مختصر سوال وجواب مرتب کر کے مختلف شہروں کے علمائے کرام کی خدمت میں روانہ کیا، جس قدر علماء کی تصدیقات موصول ہوئیں وہ بغرض افادہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

مؤلف کا ایک فتوی

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین زادکم الله تعالیٰ تعظیماً لدیه :اس صورت میں کہ جمعہ کے روز جو اذان منبر کے سامنے کہی جاتی ہے، اس کا جواب قولی دینا مثل دوسری اذانوں کے مشروع ہے یا ممنوع ہے؟ بینوا توجروا،

اقول: وبه نستعین الجواب :......صورتِ مسئولہ میں معلوم ہو کہ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، جناب امام اعظم رحمہ اللہ کے ظاہر اقوال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس اذان منبری کا جواب قولی دینا مکروہ ہے، بدلیل اس حدیث کے'' إذا خرج الإمام فلا صلوة ولا کلام '' مگر جب بنظرِ تعمق محققین حنفیہ نے تأمل کیا تو اس کا خلاف ثابت ہوا؟ کیونکہ حدیث مذکور فی الہدایہ کے متعلق تخریج زیلعی میں ''لم اجده '' لکھا گیا ہے، اور یہ بھی کہا کہ: جس شخص نے اس حدیث کو مرفوع کہا ہے اس کا وہم ہے، بلکہ یہ زہری رحمہ اللہ کا قول ہے، چنانچہ'' مؤطا امام مالک'' میں یہ قول موجود ہے، اور جو مضمون احادیث صحیحہ سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ:

خطبہ شروع کرنے کے بعد کلام مطلقاً ممنوع ہے، اس لئے کہ سماعت خطبہ میں خلل واقع ہوگا۔

اذان منبری کا جواب دینا شروع خطبے سے پہلے ہے، پس معلوم ہوا کہ اس اذان کے جواب دینے کو مکروہ کہنے کی کوئی وجہ نہیں، دوسرے یہ کہ صاحب عنایہ وغیرہ سے علامہ مولوی عبدالحی لکھنوی نے ''تعليق الممجد ''اور''عمدۃ الرعایہ'' وغیرہ اپنی تالیفات میں تصریح تام فرمائی ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک جو کلام کرنا وقت نکلنے خطیب کے مکروہ ہے وہ کلام دنیوی ہے نہ کہ کلام دینی۔ اور یہ جواب دینا اور وسیلہ کی دعا کرنی کلام دنیوی نہیں ہے، بلکہ ذکر ہے مثل تسبیح وتہلیل کے، پس اس سے ثابت ہوا کہ جواب اذان منبری کا دینا مکروہ نہیں بلکہ مشروع ہے۔

تیسرے یہ: کہ حدیث'' إذا سمعتم النداء فقولوا مثل ما يقول المؤذن ''عام ہے تمام اذانوں کو شامل ہے، اور اس حدیث کو جماعت محدثین نے سوائے ابن ماجہ کے روایت کیا ہے، پس اس عموم سے بھی ثابت ہوا کہ اذان منبری کا جواب قولی دینا مثل دوسری اذانوں کے مشروع ہے ممنوع نہیں ہے۔

چوتھے یہ کہ: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے ''بخاری'' میں جواب دینا اذان منبری کا صراحۃً ثابت ہے کہ انہوں نے منبر پر جماعت صحابہ کے روبرو جواب دیا اور کسی نے انکار نہیں کیا۔ پس بنا بران حدیثوں اور وجوہ مذکورۂ بالا کے جواب دینا اذان منبری کا مشروع ثابت ہوا، لہذا مکروہ نہیں ہوسکتا، والله اعلم وعلمه اتم، کتبہ: عبد من عباد اللہ خادم الطلبہ

القاضی رحمت اللہ عفی عنہ

مہتمم مدرسہ اشرفیہ راندیر

تصدیقات علمائے رامپور

علمائے حنفیہ کے نزدیک اذان منبری کا جواب قولی مشروع ومندوب ہے''إذا خرج الإمام فلا صلوة ولا كلام''اس کے منافی نہیں ہے، کیونکہ مراد کلام سے دنیوی ہے نہ کہ دینی، واللہ اعلم۔ محمد معز اللہ عنہ

مدرس سوم مدرسہ عالیہ ریاست رامپور

تحقیق مجیب مصیب صحیح ہے	جواب حسب تحقیق بالا صحیح ہے، واللہ اعلم
محمد منور العلی غفر لہ	احمد امین عفی عنہ
صح الجواب	الجواب بهذا التفصيل والتحقيق هو الجواب
نظیر الدین عفی عنہ	محمد فضل حق اصلح اللہ حالہ

علمائے لکھنؤ وعلی گڈھ کی تصدیقات

لکھنؤ علی گڈھ کے علماء کی خدمت میں سوال مذکور کا حسب ذیل جواب بھیجا گیا تھا:

الجواب:......صورتِ مسئولہ میں اذان مذکور کا جواب دینا مکروہ نہیں ہے اسی کو محققین علمائے حنفیہ نے ترجیح دی ہے، کیونکہ یہ اذان آنحضرت ﷺ کے وقت سے جاری ہے، بخلاف اذان متعارف کے کہ وہ اذان عثمانی ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے وقت میں جاری کی ہے، اور آنحضرت ﷺ نے علی وجہ العموم امر فرمایا ہے:'' إذا سمعتم النداء فقولوا مثل ما يقول المؤذن ''یہ امر اذان منبری اور اذان عثمانی دونوں کو شامل ہے، اس میں کسی اذان کی تخصیص نہیں ہے۔

اسی طرح علامہ لکھنوی مرحوم مولوی عبدالحی صاحب رحمہ اللہ نے اپنے''عمدۃ الرعایہ'' اور'' تعليق الممجد على مؤطا امام محمد ''میں تصریح فرمائی ہے،''بخاری'' کی

حدیث معاویہ سے استدلال کیا ہے، اور ''عنایہ'' اور ''جامع الرموز'' سے جواز نقل کیا ہے، جس کا جی چاہے ملاحظہ فرمالے۔ ہاں بعض فقہاء مکروہ کہتے ہیں، ان کی دلیل حدیث ہدایہ ہے ''إذا خرج الإمام فلا صلوۃ ولا کلام '' مگر یہ حدیث نہیں ہے، چنانچہ علامہ زیلعی رحمہ اللہ نے اپنی تخریج ہدایہ میں تصریح کی ہے کہ '' لم اجدہ '' اور بیہقی نے کہا کہ: اس کو حدیث مرفوع کہنا وہم ہے، بلکہ یہ قول زہری رحمہ اللہ کا ہے، اور ایسے اقوال حدیث معاویہ اور حدیث ابوسعید خدری " إذا سمعتم النداء " الخ، کے (جن کو جماعت محدثین نے سوائے ''ابن ماجہ'' کے مرفوع متصل السند روایت کیا ہے) معارض اور مخصص نہیں ہو سکتے، پس مکروہ کہنا قول ضعیف اور بے اصل ہے۔ هذا ما ظهر لی والله اعلم،

کتبه : عبد من عباد الله خادم الطلبه

القاضی رحمت اللہ عفی عنہ

مہتمم مدرسہ اشرفیہ راندیر

واقعی اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جس وقت سے امام منبر پر جائے کلام وصلوۃ دونوں ممنوع ہیں، اور اس قول کے موافق حدیثیں موجود ہیں، جن کی تفصیل میرے نانا جناب مولانا مولوی عبدالحی صاحب رحمہ اللہ کے ہدایہ کے حاشیہ میں موجود ہے، لیکن صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک نماز تو ممنوع ہے جبکہ امام منبر پر جائے، لیکن کلام دینی مثل اجابت اذان ثانی ممنوع نہیں ہے جیسا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے اور حق قولِ ثانی ہے، وتحقيق ذلک فی السعاية۔

حررہ: الفقیر محمد ایوب غفرلہ الذنوب

لکھنؤ

الجواب حق الجواب صحیح

محمد عبدالمتین عفی عنہ محمد عبدالصمد عفی عنہ (علی گڈھ)

الجواب صحیح والمجیب نجیح ' من قال سوی ذلک فقد قال محال

حررہ: راجی إلی رحمت ربہ القوی

عبدالتواب غزنوی ثم العلی گڈھی

جواب صحیح ہے، کیونکہ حدیث نبوی اجابت اذان میں علی العموم وارد ہے، مع ہذا جس اذان کا سائل نے ذکر کیا ہے وہ اذان زمانۂ رسول اللہ ﷺ میں کہی جاتی تھی اور مثل اذان پنج گانہ نماز کے اذان جمعہ بھی ایک اذان ہے، لہذا حکم نبوی اجابت اذان میں بلا ریب داخل ہے، واللہ اعلم۔

محمد منیر خاں عفی عنہ

مدرس سوم عربیہ مدن پورہ، بنارس شہر

کحل البصر فی ذکر وقت العصر

اس رسالہ میں مؤلف رحمہ اللہ نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ظاہری روایت اورقول مختار میں عصر کا وقت دو مثل پر ہے، ایک مثل کی روایتیں صریح اور صحیح ہیں، ایک مثل پر وقت عصر کی احادیث، امام صاحب کا ایک قول بھی مثل اول کے موافق ہے، امام صاحب سے متعدد روایات ہیں اور ایک روایت میں صاحبین کے قول کی طرف رجوع بھی ثابت ہے۔

حضرت مولانا قاضی رحمت اللہ صاحب لاجپوری راندیری

ترتیب، حواشی واضافہ

مرغوب احمد لاجپوری

عرض محشی وتعارف کتاب

عصر کا ابتدائی وقت ایک مثل پر ہے یا دو مثل پر، اس مسئلہ میں علماء امت کا اختلاف مشہور ومعروف ہے کہ ائمۂ ثلاثہ اور صاحبین رحمہم اللہ ایک مثل کے قائل ہیں، اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ دو مثل کے قائل ہیں، احادیث دونوں قولوں کی مؤید ہیں۔

اس رسالہ میں مؤلف رحمہ اللہ نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ظاہری روایت اور قول مختار میں عصر کا وقت دو مثل پر ہے، ایک مثل کی روایتیں صریح اور صحیح ہیں، ان احادیث کو بھی جمع فرمادیا، ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ: امام صاحب رحمہ اللہ کا ایک قول بھی مثل اول کے موافق ہے، اسی طرح اس کو حوالوں سے مزین کیا کہ امام صاحب رحمہ اللہ سے متعدد روایتیں منقول ہیں اور ایک روایت میں صاحبین رحمہما اللہ کے قول کی طرف رجوع بھی ثابت ہے۔ موصوف نے یہ رسالہ سید احمد دحلان مفتی مکہ معظّمہ کے رسالہ ''رسالة النصر فی ذکر وقت العصر ''اور'' التعلیق الممجد علی مؤطا الامام محمد '' کا خلاصہ اور لب لباب کے طور پر لکھا ہے۔ سید احمد دحلان کا رسالہ راقم نے انٹرنیٹ سے نکال کر اس رسالہ کی اس سے تصحیح کی، قدیم طرز پر اس میں کوئی فہرست نہیں تھی، راقم نے فہرست تیار کی تاکہ مطالعہ میں سہولت ہو جائے، اسی طرح اصل رسالہ میں کوئی عنوانات بھی نہیں تھے، اس لئے اس پر اپنی سمجھ کے مطابق عنوانات قائم کیے۔

ایسا لگتا ہے کہ اس رسالہ پر اہل علم کی طرف سے اشکالات بھی ہوئے، مؤلف رحمہ اللہ نے ایک دوسرے رسالہ میں'' ازالة الاوھام ''ان کے جوابات بھی دیئے ہیں، وہ رسالہ بھی اسی کے ساتھ طبع کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حقیر کاوش کو حضرت مؤلف اور راقم اور ان رسائل کی طباعت کے معاونین کے لئے صدقۂ جاریہ اور ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله الذی فضل سيدنا محمدا صلى الله عليه وسلم على سائر المخلوقات ، وشرف امته على سائر الامم ، واعلى لهم الدرجات ، وعلى آله واصحابه المقتفين آثاره ومن تبعهم فی جميع الحالات،

سوال:......ما قولكم دام فضلكم سادتنا علماء الحنفية هل المعتمد المفتى به فی مذهب سيدنا الامام الاعظم هو رواية العصر الأول التی نحاها اصحابه الاربعة وعليها عمل جميع مراكز اهل الاسلام وهی الارفق بالعباد ، أو رواية العصر الثانی أو هما بمرتبة واحدة فی الاعتماد والصحة فی الفتوى والعمل المسئلة واقعة حال افتونا ماجورين،

اقول وبه نستعين:...... رواية العصر الثانی قول الامام وهو الصحيح والمختار وظاهر الرواية ، واستدلاله باحاديث متعددة ، منها : ما اخرجه مالک فی المؤطا

ہمارے دینی پیشوا علمائے حنفیہ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں کہ آیا سیدنا امام اعظم رحمہ اللہ کے مذہب میں ایک مثل عصر کا وقت ہوجانے کی روایت معتبر اور مفتی بہ ہے جس پر امام اعظم رحمہ اللہ کے چاروں شاگرد ہیں، اور اسی پر تمام مراکز اہل اسلام کا عمل ہے، اور وہی مسلمانوں کے مناسب اور ان کو نافع بھی ہے، یا دو مثل کی روایت؟ یا دونوں فتوے دینے اور عمل کرنے میں ایک درجہ کی معتبر اور صحیح ہیں، یہ مسئلہ حال کا حادثہ ہے، حکم بتا کر ثواب کے مستحق بنیں۔

ظاہری روایت اور قول مختار میں عصر کا وقت دو مثل پر ہے

اقول وبه نستعين:......دو مثل پر عصر کا وقت ہونے کی روایت امام اعظم رحمہ اللہ کا قول ہے اور وہی صحیح اور مختار ہے اور وہی ظاہر الروایۃ ہے۔ اور ان کا استدلال چند حدیثوں سے ہے:

عن عبيد الله بن رافع مولى ام سلمة رضى الله عنها زوج النبى صلى الله عليه وسلم عن ابى هريرة : أنه ساله عن وقت الصلوة ' فقال ابوهريرة : انا اخبرک صل الظهر إذا كان ظلک مثلک ' والعصر إذا كان ظلک مثليک ' الخ ،

قال جمع من علماء المسلمين ان اول وقت صلوة الظهر زوال الشمس عن كبد السماء و وسط الفلک اذا استيقن بذلک فى الارض بالتامل هو قول متفق عليه والاجماع عليه ، واختلفوا فى آخر وقت الظهر ، فقال مالک واصحابه : آخر وقت الظهر إذا كان ظل كل شىء مثله بعد القدر الذى زالت عليه الشمس' وهو اول وقت العصر بلا فصل ، وبذلک قال ابن المبارک وجماعة ،

منجملہ ان کے وہ روایت ہے: جو''مؤطا امام مالک'' میں عبید اللہ بن رافع رحمہ اللہ (ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ غلام) نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، عبید اللہ رحمہ اللہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اوقات نماز دریافت کئے، تو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: میں تمہیں اوقات نماز بتاتا ہوں، ظہر تو اس وقت پڑھو جب تمہارا سایہ ایک مثل ہو جائے اور عصر جبکہ تمہارا سایہ دو مثل ہو جائے، الخ۔

علمائے اسلام کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ: ظہر کا اول وقت زوال شمس سے ہوتا ہے یعنی جبکہ آفتاب وسط آسمان سے ڈھل جائے، اور زمین پر غور و تامل سے اس کا ڈھل جانا معلوم ہو جائے، یہ قول متفق علیہ ہے، اور اس پر اجماع ہے۔ ہاں ظہر کے آخر وقت میں اختلاف ہے تو امام مالک رحمہ اللہ اور ان کے شاگرد اس کے قائل ہیں کہ ظہر کا آخر وقت وہ ہے کہ ہر شئی کا سایہ ایک مثل ہو جائے، لیکن سایہ اصلی جو عین زوال کے وقت ہوتا ہے اس سے مستثنیٰ ہے، اور یہی اول وقت عصر کا ہے درمیان میں کچھ فاصلہ نہیں، اور اسی کے عبد اللہ ابن مبارک رحمہ اللہ اور ایک جماعت قائل ہے۔

وفی الاحادیث الواردة بامامة جبرئیل ما یوضح لک ان آخر وقت الظهر هو اول وقت العصر،

وقال الشافعی وابوثور وداؤد : آخر وقت الظهر إذا کان ظل کل شیء مثله إلا بین آخر وقت الظهر واول وقت العصر فاصلة ' وهو ان یزید الظل ادنی زیادة علی المثل،

وقال الحسن بن صالح بن حی والثوری وابویوسف ومحمد واحمد بن حنبل واسحٰق بن راهویه ومحمد بن جریر الطبری : آخر وقت الظهر إذا کان ظل کل شیء مثله ' ثم یدخل وقت العصر ولم یذکروا فاصلة ،

وقال ابوحنیفة : آخر وقت الظهر حین یصیر ظل کل شیء مثلیه ، وخالفه

اور امامت جبرئیل علیہ السلام کی حدیثوں میں اس امر پر دلالت ہے کہ ظہر کا آخر وقت اور عصر کا اول وقت متصل ہیں، ان کے درمیان میں فاصلہ نہیں۔

اور امام شافعی اور ابوثور اور داؤد رحمہم اللہ نے فرمایا کہ: ظہر کا آخر وقت ایک مثل سایہ ہوجانے پر ہوجاتا ہے، مگر ظہر کے اخیر وقت اور عصر کے اول وقت میں تھوڑا سا فاصلہ ہے، وہ یہ کہ ایک مثل پر سایہ کچھ زائد ہوجائے۔

اور حسن بن صالح اور سفیان ثوری اور ابو یوسف اور محمد اور احمد بن حنبل اور اسحٰق بن راہویہ اور محمد بن جریر طبری رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ: ہر چیز کے ایک مثل سایہ ہوجانے پر ظہر کا وقت ختم ہوجاتا ہے، اور پھر فوراً عصر کا وقت داخل ہوجاتا ہے، ان دونوں کے درمیان کسی فاصلہ کا ان حضرات نے ذکر نہیں کیا۔

اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ظہر کا اخیر وقت ہر شئی کا دو مثل سایہ ہونے پر

اصحابه فی ذلک ، وذکر الطحاوی روایة اخریٰ عنه انه قال : آخر وقت الظهر ان یصیر ظل کل شیء مثله مثل قول الجماعة ' ولا یدخل وقت العصر حتی یصیر ظل کل شیء مثلیه ، وهذا لم یتابع علیه،

واما اول وقت العصر فقد تبین من قول مالک ما ذکرنا فیه ' ومن قول الشافعی ومن تابعه ما وصفناه ، وقال ابوحنیفة : اول وقت العصر من حین یصیر الظل مثلین' وهذا خلاف الآثار وخلاف الجمهور ، وهو قول عند الفقهاء من اصحابه وغیرهم مهجور،

ہوتا ہے، امام صاحب رحمہ اللہ کے شاگردوں نے اس میں ان سے اختلاف کیا، اور امام طحاوی رحمہ اللہ نے امام صاحب رحمہ اللہ سے ایک اور روایت نقل کی ہے، وہ یہ کہ انہوں نے فرمایا کہ: ظہر کا اخیر وقت ایک مثل سایہ کے ختم ہونے پر ختم ہوجاتا ہے (جیسا کہ جمہور کا قول ہے) اور عصر کا وقت جب تک کہ سایہ دومثل نہ ہو داخل نہیں ہوتا، اس قول میں کوئی ان کا موافق نہیں۔

وقت عصر کی ابتدا

اب رہا عصر کا اول وقت تو امام مالک رحمہ اللہ کے قول سے جو ہم اوپر ذکر کرچکے ہیں معلوم ہوگیا کہ ایک مثل پر بلا فاصلہ شروع ہوجاتا ہے، اور امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے موافقین کے قول سے جو ہم نے بیان کردیا کہ بعد مثل تھوڑا سا سایہ بڑھنے پر شروع ہوتا ہے، اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: عصر کا اول وقت دومثل سایہ ہونے سے شروع ہوتا ہے، اور یہ آثار کے خلاف اور جمہور کے خلاف ہے، اور ان کے شاگردوں وغیرہم فقہاء کے نزدیک یہ قول مہجور ہے۔

واختلفوا فی آخر وقت العصر، فقال مالک : آخره حين يصير ظل كل شیء مثليه ، وهو عندنا محمول على وقت الاختيار ، ومادامت الشمس بيضاء نقية ' فهو وقت مختار ايضا للعصر عنده وعند سائر العلماء ،

وقال ابن وهب عن مالک : الظهر والعصر آخر وقتهما غروب الشمس ، وهذا كله لاهل الضرورة كالحائض تطهر ،

وقال ابويوسف ومحمد : وقت العصر إذا صار ظل كل شیء مثله إلى ان يتغير الشمس ، وقال ابوثور : إلى ان تصفر الشمس وهو قول احمد بن حنبل ، وقال اسحق : آخر وقته ان يدرک المصلی منها ركعة قبل الغروب ، وهو قول داؤد لكل

عصر کا آخری وقت

اور عصر کے اخیر وقت میں بھی اختلاف ہے، امام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ہر شئی کا سایہ دو مثل ہونے پر عصر کا اخیر وقت ہوجاتا ہے، مگر ہمارے نزدیک یہ قول وقت مختار پر محمول ہے اور جب تک آفتاب سفید اور صاف رہے وہاں تک عصر کا وقت مختار ان کے نزدیک بھی رہتا ہے، اور تمام علماء کے نزدیک بھی۔

اور ابن وہب رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ ظہر اور عصر کا اخیر وقت غروب شمس پر ہوتا ہے، اور یہ قول اہل ضرورت کے لئے جیسے حائضہ کہ حیض سے پاک ہو۔

اور امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ نے فرمایا کہ: عصر کا وقت ایک مثل سے شروع ہوکر آفتاب کے متغیر ہونے تک ہے، اور امام ابوثور رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: آفتاب کے زرد ہونے تک ہے، اور یہی قول امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا ہے۔ اور امام اسحاق رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: اس کا اخیر وقت وہاں تک ہے کہ غروب آفتاب سے پہلے نماز پڑھنے والے کو ایک

الناس معذور وغير معذور ،

وقول ابى هريرة فى الاثر المذكور إذا كان ظلك مثلك ، الخ ، قال الزرقانى أى مثل ظلك يعنى قريبا منه بغير فئى الزوال انتهى،

ووجه تفسيره انه إذا كان الظل مثلا يخرج وقت الظهر فلذا فسره بالقرب، وهذا الوقت هو الذى صلى فيه النبى صلى الله عليه وسلم بجبرئيل فى اليوم الثانى من يوم امامته ، وصلى فى ذلک اليوم العصر إذا صار ظل مثليه ،

واما فى اليوم الاول فصلى الظهر حين زالت الشمس وصار الفىء مثل الشراک ' والعصر حين كان ظل كل شىء مثله ، اه،

رکعت مل جائے ،اور یہی امام داؤد رحمہ اللہ کا قول ہے،اور تمام لوگ معذور وغیر معذور کے لئے یہ حکم یکساں ہے۔

اور اثر مذکور میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ جو قول ہے کہ '' جبکہ تمہارا سایہ ایک مثل ہوجائے'' تو علامہ زرقانی رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر یوں کی ہے کہ سوائے سایہ اصلی کے ایک مثل کے قریب ہوجائے ،انتہی ۔

اور اس تفسیر کی وجہ یہ ہے کہ جب سایہ ایک مثل پورا ہوجائے گا تو ظہر کا وقت تو نکل جائے گا،اس لئے انہوں نے قریب کے ساتھ تفسیر کی ہے،اور یہ وہ وقت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے امامت جبرئیل کے دوسرے روز جس وقت (ظہر کی) نماز پڑھی ہے،اور اس دن عصر کی نماز دو مثل سایہ ہونے پر پڑھی ہے۔

رہا پہلا دن تو اس میں ظہر کی نماز آفتاب ڈھلتے ہی پڑھی تھی، جبکہ سایہ شراکِ نعل کے برابر تھا،اور عصر کی نماز ایک مثل سایہ ہوجانے پر پڑھی تھی۔

هكذا ورد فی روایة ابی داؤد والحاکم وصححه من حدیث ابن عباس ، وفی روایتهم من حدیث جابر ، وفی روایة البیهقی والطبرانی واسحق بن راهویه من حدیث ابی مسعود الانصاری ، وفی روایة البزار والنسائی من حدیث ابی هریرة ، وفی روایة عبدالرزاق من حدیث عمروبن حزم ، وفی روایة احمد من حدیث ابی سعید الخدری وغیرهم ،

وقال الطحاوی فی شرح معانی الآثار بعد ذکر الروایات : ذکر عن النبی صلی الله علیه وسلم انه صلی الظهر حین زالت الشمس' وعلی ذلک اتفاق المسلمین' ان ذلک اول وقتها کما هو مذکور سابقا،

واما آخر وقتها فان ابن عباس واباسعید وجابر و اباهریرة رووا انه صلاها فی

''ابوداؤد'' اور'' حاکم'' کی روایت میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کے طریقہ سے (اور حاکم کی روایت نے تصحیح بھی کی ہے) اورانہیں کی روایت میں جابر کے طریقہ سے اور بیہقی اورطبرانی اوراسحٰق بن راہو یہ رحمہم اللہ کی روایت میں ابومسعود انصاری رحمہ اللہ کے طریقہ سے اور بزاراورنسائی کی روایت میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے طریقہ سے اورعبدالرزاق کی روایت میں عمرو بن حزم رحمہ اللہ کے طریقہ سے اورامام احمد رحمہ اللہ کی روایت میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے طریقہ سے اسی طرح وارد ہوا ہے۔

اورحضرت امام طحاوی رحمہ اللہ نے ''شرح معانی الآثار'' میں آنحضرت ﷺ سے بہت سی روایات ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ: آنحضرت ﷺ سے منقول ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے نماز ظہر آفتاب ڈھلنے پر پڑھی ،اوراس پر تو مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ زوال آفتاب سے ظہر کا وقت شروع ہوتا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا۔

رہا ظہر کا اخیر وقت تو ابن عباس اورابوسعید خدری اور جابراورابو ہریرہ رضی اللہ عنہم نے

اليوم الثانى حين كان ظل كل شىء مثله ، فاحتمل ان يكون ذلک بعد ما صار ظل كل شىء مثله فيكون هو وقت الظهر ، ويحتمل ان ذلک على قرب ان يصير ظل كل شىء مثله ، وهذا جائز فى اللغة ، فما روى انه صلى الظهر فى اليوم الثانى حين صار ظل كل شىء مثله ' يحتمل ان يكون على قرب ان يصير ظل كل شىء مثله ' فيكون الظل إذا صار مثله فقد خرج وقت الظهر ، والدليل على ما ذكرنا من ذلک ان الذين ذكروا هنا عنه قد ذكروا عنه ايضا انه صلى العصر فى اليوم الاول حين صار ظل كل شىء مثله ، ثم قال ما بين هذين وقت فاستحال ان يكون ما بينهما وقت وقد جمعها فى وقت واحد ،

روایت کیا ہے کہ: آنحضرت ﷺ نے دوسرے روز ظہر کی نماز ایک مثل سایہ ہونے پر پڑھی، تو اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ ایک مثل سایہ ہوجانے کے بعد پڑھی ہو، تو ایک مثل کے بعد بھی ظہر کا وقت رہے گا، اور یہ بھی احتمال ہے کہ ایک مثل سایہ ہونے کے قریب پڑھی ہو، اور باعتبار لغت یہ جائز ہے، پس جس روایت میں یہ آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک مثل سایہ ہونے پر دوسرے روز ظہر کی نماز پڑھی، اس سے مراد یہ ہوسکتی ہے کہ قریب ایک مثل سایہ ہوجانے کے پڑھی تھی، تو اس صورت میں یہ ہوگا کہ جب ایک مثل سایہ پورا ہوگیا تو ظہر کا وقت نکل گیا، اور اس بات کی دلیل یہ ہے کہ جن حضرات نے آنحضرت ﷺ سے یہ نقل کیا ہے کہ دوسرے روز ظہر کی نماز ایک مثل ہونے پر پڑھی، انہیں حضرات نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ اول روز عصر کی نماز ایک مثل سایہ ہونے پر پڑھی تھی، اور پھر آپ نے فرمایا تھا کہ ان دونوں وقتوں کے درمیان وقت ہے، لیکن جبکہ دونوں کو ایک وقت میں جمع کردیا تو ان کے مابین وقت ہونا محال ہے۔

وقد دل على ذلک ايضا ما فی حديث ابی موسی، وذلک انه قال فی ما اخبر عن صلاته صلی الله عليه وسلم فی اليوم الثانی ، ثم اخر الظهر حتی كان قريبا من العصر فاخبر انه صلاها فی ذلک اليوم فی قرب دخول وقت العصر لا فی وقت العصر ، فثبت بذلک إذا اجمعوا فی هذه الروايات ان بعد ما يصير ظل كل شیء مثله وقت العصر وانه محال ان يكون وقت الظهر ، واما ما ذكر عنه فی صلوة العصر فلم يختلف عنه انه صلاها فی اليوم الاول فی الوقت الذی ذكرناه عنه ، فثبت بذلک انه اول وقتها ، وذكر عنه انه صلاها فی اليوم الثانی حين صار ظل كل شیء مثليه ، فاحتمل ان يكون هو آخر وقتها الذی خرج ، واحتمل ان يكون هو

ایک مثل کے بعد عصر کا وقت

نیز اس امر پر ابوموسی رضی اللہ عنہ کی روایت بھی دلالت کرتی ہے، ابوموسی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی نماز کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ: آپ ﷺ نے دوسرے روز ظہر کو مؤخر کیا، یہاں تک کہ قریب عصر کے وقت آ گیا۔تو اس روایت میں انہوں نے ظہر کی نماز کو عصر کے وقت کے قریب پڑھا جانا بیان کیا ہے نہ یہ کہ عصر کے وقت میں پڑھی گئی، پس ان حضرات ناقلین کے اتفاق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایک مثل سایہ ہو جانے کے بعد عصر کا وقت ہے، پس اس وقت ظہر کا وقت ہونا محال ہے، اور عصر کے بارے میں آپ سے بلا اختلاف یہ منقول ہے کہ پہلے روز ایک مثل سایہ ہونے پر پڑھی ہے تو ایک مثل کے بعد عصر کا وقت ہونا اس سے ثابت ہو گیا، ہاں دوسرے روز دو مثل سایہ ہونے پر پڑھی تو اس میں دو احتمال ہیں: ایک یہ کہ اس کا اخیر وقت ہو کہ اس کے بعد وقت نکل جاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ایسا وقت ہو کہ اس سے دیر کرنا مناسب نہ ہو اور جو اس کے بعد

الوقت الذی لا ینبغی ان یؤخر الصلوۃ عنه ، وان من صلاها بعده وإن کان قد صلاها فی وقتها مفرط ، وقد دل علیه ما حدثنا ربیع المؤذن نا اسد نا محمد بن المفضل عن الاعمش عن ابی صالح عن ابی هریرۃ قال : قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم : ان للصلوۃ اولا وآخراً ، وان اول وقت العصر حین یدخل وقتها ' وان آخر وقتها حین تصفر الشمس ، ففی هذا ان آخر وقتها حین تصفر الشمس،

غیر ان قوما ذهبوا الی ان آخر وقتها إلی غروب الشمس، واحتجوا بما حدثنا ابن مرزوق نا وهب بن جریر نا شعبة عن سهیل بن ابی صالح عن ابیه عن ابی هریرۃ

نماز پڑھے،اس نے اگر چہ وقت کے اندر تو نماز پڑھی ،لیکن کوتاہی کی ،اوراس پر یہ روایت دلالت کرتی ہے جو ہم سے ربیع مؤذن نے اوران سے اسد نے اوران سے محمد بن المفضل نے بروایت اعمش بواسطہ ابی صالح بذریعہ ابو ہریرہ رضی اللہ بیان کی کہ: آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: نماز کا ایک اول وقت ہوتا ہے،اورایک اخیر،اورعصر کا اول وقت تو وہی ہے جب کہ عصر کا وقت داخل ہوجاتا ہےاوراس کا اخیر وقت وہ ہے کہ آفتاب زرد ہوجائے۔ پس اس روایت سے معلوم ہوگیا کہ آفتاب زرد ہونے پر عصر کا وقت ختم ہوجاتا ہے۔

ایک جماعت قائل ہے کہ عصر کا اخیر وقت غروب شمس پر ہوتا ہے

مگرایک جماعت اس کی قائل ہے کہ عصر کا اخیر وقت غروب شمس پر ہوتا ہے،اوراس حدیث سے استدلال کیا ہے جو ہم سے ابن مرزوق نے بیان کی اوران سے وہب بن جریر نے اوران سے شعبہ نے اورشعبہ نے سہیل سے اورانہوں نے اپنے والد ابوصالح سے اور انہوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ: جس شخص نے قبل طلوع شمس کے نماز فجر کی ایک رکعت پالی اس نے فجر پالی،اورجس نے قبل غروب آفتاب کے عصر کی

مرفوعا : من ادرک رکعة من صلوة الصبح قبل طلوع الشمس فقد ادرک الصبح ' ومن ادرک رکعة من العصر قبل ان تغرب الشمس فقد ادرک العصر ' انتهى ، ما قد ذکر في الطحاوى،

وقال محمد بعد ذکر هذا الاثر : (هذا قول ابى حنيفة فى وقت العصر) اشارة الى ما يشهد به ظاهر حديث ابى هريرة ، فانه يدل على بقاء وقت الظهر الى المثل حيث جواز الظهر عند کون الظل بقدر المثل وعلى ان وقت العصر يدخل حين يصير ظل کل شىء مثليه ' حيث اخبر عن وقت العصر ' بانه إذا صار ظل کل شىء مثليه ، والذى يقتضيه النظر انه ليس غرض ابى هريرة من هذا الكلام بيان اوائل اوقات الصلوة ' ولا بيان اواخر ، فانه لو حمل على الاول لم يصح کلامه في الظهر،

ایک رکعت پائی اس نے نماز عصر کی پالی (طحاوی کا بیان ختم ہوا)۔

اور امام محمد رحمہ اللہ نے اس اثر کو ذکر کر کے فرمایا: (امام ابوحنیفہ کا وقت عصر میں یہی قول ہے) یہ اشارہ اس امر کی طرف ہے جو ظاہر حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ سے سمجھا جاتا ہے، کیونکہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ظہر کا وقت ایک مثل کے بعد بھی باقی رہتا ہے، کیونکہ اس میں ظہر کی نماز کو ایک مثل کے بعد جائز رکھا گیا ہے، اور اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ عصر کا وقت دو مثل سایہ ہونے پر داخل ہوتا ہے، کیونکہ انہوں نے عصر کے وقت کو یہ بتلایا کہ جبکہ دو مثل سایہ ہو جائے، مگر نظر عقلی اس بات کو متقضی ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ کو اس کلام سے اوقات کا اول و آخر بتانا مقصود نہیں ہے، کیونکہ پہلی صورت میں ان کا بیان ظہر کے بارے میں صحیح نہیں ہوگا، کیونکہ اس کا اول وقت زوال آفتاب سے شروع ہوتا ہے، اور دوسری صورت میں ان کا بیان عصر کے بارے میں صحیح نہ ہوگا، کیونکہ دو مثل پر

فان اول وقته عند دلوک الشمس، ولو حمل على الثانى لم يصح كلامه فى العصر، فان صيرورة الظل مثلين ليس آخر وقت العصر ، وقال محمد فى "مؤطاه" بعد هذا القول : (واما فى قولنا : فانا نقول : إذا زاد الظل على المثل فصار مثل الشىء وزيادة من حين زالت الشمس فقد دخل وقت العصر) وبه قال ابويوسف والحسن وزفر والشافعى واحمد والطحاوى وغيرهم ' وهو رواية الحسن عن ابى حنيفة على ما فى عامة الكتب ' ورواية محمد عنه على ما فى المبسوط كذا فى رواية حلية المحلى شرح منية المصلى لمحمد بن اميرحاج الحلبى ،

وفى غرر الاذكار وهو الماخوذ به ، وفى البرهان شرح مواهب الرحمن : هو الاظهر وفى الفيض الكرخى : عليه عمل الناس اليوم وبه يفتى ، كذا فى الدر المختار،

اس کا وقت ختم نہیں ہوجاتا، اور امام محمد رحمہ اللہ نے اس کے بعد ''موطا'' میں فرمایا کہ: (ہمارا قول یہ ہے کہ جب کہ سایہ ایک مثل سے کچھ زیادہ ہوجائے تو عصر کا وقت داخل ہوجاتا ہے) اور اسی کے قائل ہیں، امام ابو یوسف اور حسن اور زفر اور امام شافعی اور امام محمد اور طحاوی وغیرہ (رحمہم اللہ) اور یہی امام حسن نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے (بنا بر عامہ کتب) اور یہی امام محمد رحمہ اللہ نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے ''مبسوط'' میں نقل کیا ہے۔(حلية المحلى شرح منية المصلى میں اسی طرح ذکر کیا ہے)

اور ''غرر الاذکار'' میں ہے کہ: یہ قول ماخوذ بہ ہے، اور ''برہان شرح مواہب الرحمان'' میں ہے کہ: یہ قول اظہر ہے، اور اور ''فیض کرخی'' میں ہے کہ: اس قول پر لوگوں کا آج کل عمل ہے اور اسی پر فتویٰ دیا جاتا ہے۔(درمختار)

....

والاستناد لهم باحاديث : منها احاديث تعجيل التى ستاتى ان شاء الله تعالى ،

ومنها حديث جابر المروى فى سنن النسائى وغيره : انه صلى الله عليه وسلم صلى العصر حين صار ظل كل شىء مثله ،

وفى الباب آثار كثيرة واخبار كثيرة تدل على ذلک مبسوطة فى موضعها ،

وقال محمد فى موطاه : واما ابوحنيفة فانه قال لا يدخل وقت العصر حتى يصير الظل مثليه ، أى سوى فىء الزوال فى بلدة هو يوجد فيها ، واستدلاله باحاديث،

منها حديث على بن شيبان قدمنا على رسول الله صلى الله عليه وسلم المدينة

چند احادیث

اوران لوگوں کا استدلال چند احادیث سے ہے۔منجملہ ان کے وہ حدیثیں ہیں جن میں عصر کی نماز جلدی پڑھنے کا تذکرہ ہے، اور یہ حدیثیں آگے آتی ہیں ان شاءاللہ۔اور منجملہ ان احادیث کے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جو''نسائی''میں مروی ہے کہ:

آنحضرت ﷺ نے نماز عصر اس وقت پڑھی کہ ہر شئی کا سایہ اس کے برابر ہوگیا۔

اوراس بارے میں بہت سی احادیث وآثار ہیں جو اپنے مواضع میں مذکور ہیں۔اور امام محمد رحمہ اللہ نے''مؤطا''میں فرمایا کہ: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: عصر کا وقت اس وقت تک داخل نہیں ہوتا کہ ہر شئی کا سایہ دومثل ہوجائے، یعنی سایہ اصلی کے علاوہ ان شہروں میں جہاں پایا جائے۔اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا استدلال بھی چند حدیثوں سے ہے، منجملہ ان کے علی بن شیبان کی روایت ہے:

فرماتے ہیں کہ: ہم آنحضرت ﷺ کی خدمت میں مدینہ میں حاضر ہوئے تو آنحضرت ﷺ عصر کو مؤخر کرکے پڑھتے تھے، مگر جب تک کہ آفتاب کی روشنی سفید

فكان يؤخر العصر ما دامت الشمس بيضاء نقية ، رواه ابوداؤد وابن ماجة ،

وهذا يدل على انه كان يصلى عند المثلين ،

ومنها حديث جابر صلى بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم حين صار ظل كل شيء مثليه ، رواه ابن ابى شيبة بسند لا بأس به ، هكذا ذكره العينى فى عمدة القارى شرح صحيح البخارى،

وفيه انهما يدلان على جواز الصلوة عند المثلين لا على انه لا يدخل وقت العصر إلا عندذلک ،

ومنها اثر ابى هريرة المذكور فى الكتاب المؤطا وقدم ماله وما عليه ،

اورصاف رہے۔(رواہ ابوداؤدوابن ماجہ)

اور یہ حدیث اس امر پردلالت کرتی ہے کہ آپ دومثل پر عصر پڑھتے تھے۔اورمن جملہ ان احادیث کے جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ:

آنحضرت ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی جب کہ سایہ دومثل ہوگیا۔

(ابوبکر بن ابی شیبہ نے اسے ایسی سند سے روایت کیا جس میں کچھ مضائقہ نہیں)

یہ علامہ عینی رحمہ اللہ نے ''عمدۃ القاری شرح بخاری'' میں ذکر کیا ہے، مگر ان استدلالوں میں یہ شبہ ہے کہ یہ دونوں حدیثیں صرف یہ بتلاتی ہیں کہ مثلین پر عصر کی نماز جائز ہے، ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جب تک سایہ دومثل نہ ہو عصر کا وقت داخل نہیں ہوتا۔ اور منجملہ ان کے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا وہ اثر ہے جو''مؤطا'' میں مذکور ہے جسے ہم مع مالہ وماعلیہ کے ذکر کرچکے ہیں۔

والانصاف فی هذا المقام ان احاديث المثل صريحة صحيحة ، واخبار المثلين انما ذكر فی توجيهه احاديث استنبط منها هذا الامر، والامر المستنبط لا يعارض الصريح ، ولقد اطال الكلام فی هذا المبحث صاحب البحر الرائق فيه ' وفی رسالة مستقلة فلم يأت بما يفيد المدعی ويثبت الدعوی فتفطن ،

فمسئلة صلوة العصر عند مصير الظل مثله قد كثرت فيها الاحاديث الصحيحة واعتمدها الائمة وتوارث العمل بها فی الاعصار والامصار، وقد ذكر ائمتنا كثيرا من تلک الاحاديث التی استدل بها القائلون بان وقت العصر عند مصير الظل مثله ولنذكر بعضا مما ذكروه ،

ایک مثل کی روایتیں صریح اور صحیح ہیں

اوراس مقام پر انصاف کی بات یہ ہے کہ ایک مثل کی روایتیں صریح اور صحیح ہیں اور دو مثل کی جتنی روایتیں ہیں ان سے دو مثل کا حکم استنباط کے طور پر سمجھا جاتا ہے،اورامر مستنبط' امر صریح سے معارضہ نہیں کرسکتا، اوراس بحث کو صاحب بحر الرائق نے ''بحر الرائق'' اور ایک رسالہ مستقلہ میں نہایت طویل بیان کیا ہے،لیکن پھر بھی کوئی ایسی بات بیان نہیں کی جو مفید مدعا ہواور دعویٰ ثابت کرسکتے' فتامل ،

ایک مثل پر وقت عصر کی احادیث

پس ایک مثل پر عصر کا وقت ہوجانے میں احادیث کثیرہ صحیحہ وارد ہیں اورائمۂ دین نے اسی کو معتمد سمجھا اوراسی پر تمام شہروں میں تمام زمانوں میں مسلمانوں کا عمل لگا تار چلا آتا ہے،اورہمارے ائمہ نے ایسی بہت سی حدیثیں بیان کی ہیں جن سے ایک مثل پر عصر کا وقت ماننے والوں نے استدلال کیا ہےان میں سے بعض حدیثیں ہمیں بھی بیان کردینا چاہئے۔

فمن ذلک حديث عائشة رضی الله عنها الذی رواه البخاری ومسلم وبقية اصحاب السنن :

وهو ان النبی صلی الله عليه وسلم كان يصلی العصر والشمس فی حجرتها لم يظهر الفیء من حجرتها ،

وهو مروی بروايات لا حاجة الی الاطالة بذكرها ، قال النووی فی شرح مسلم ومعناها كلها التبكير بالعصر فی اول وقتها وهو حين يصير ظل كل شیء مثله ، وكانت الحجرة ضيقة العرصة قصيرة الجدار بحيث يكون طول جدارها اقل من مساحة العرصة بشیء يسير' فاذا صار الجدار مثله دخل وقت العصر وتكون الشمس بعيد فی اواخر العرصه لم تقع الفیء فی الجدار الشرقی ، وكل الروايات

پس منجملہ ان کے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے جسے ''بخاری'' و''مسلم'' اور بقیہ اصحاب سنن نے روایت کیا ہے وہ یہ کہ:

نبی ﷺ عصر کی نماز ایسے وقت پڑھتے تھے کہ دھوپ ان کے حجرے میں ہوتی تھی اور سایہ ان کے حجرے سے خارج نہیں ہوتا تھا۔

یہ حدیث بہت سے طریقوں سے مروی ہے جن کو بیان کرکے کلام کو طویل کرنے کی حاجت نہیں، علامہ نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں فرمایا ہے کہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ: عصر کو جلدی سے اول وقت پر پڑھتے تھے، اور وہ یہی کہ جب ہر شئی کا سایہ اس کے برابر ہو جائے، اور حجرہ چھوٹا تھا دیواریں بھی چھوٹی تھیں اس طرح کہ دیوار کا طول صحن کی مسافت سے کچھ تھوڑا سا کم تھا، پس جبکہ دیوار کا سایہ اس کے برابر ہو گیا تو عصر کا وقت داخل ہو گیا اور ابھی صحن کے آخری کناروں پر دھوپ باقی ہو گی اور

محمولة على ما ذكرناه ، قال الزرقانی فی شرح المؤطا : وحديث عائشة رضی الله عنها يشعر بمواظبة النبی صلی الله عليه وسلم علی صلوة العصر فی اول الوقت ،

وروی مسلم فی صحيحه : من رواية سليمان بن بريدة عن ابيه : ان النبی صلی الله عليه وسلم كان يصلی العصر والشمس مرتفعة بيضاء نقية ،

وروی مسلم ايضا عن انس بن مالک رضی الله عنه : ان رسول الله صلی الله عليه وسلم كا ن يصلی العصر والشمس مرتفعة حية فيذهب الذاهب إلی العوالی والشمس مرتفعة ، ورواه ايضا كثير من اصحاب السنن،

قال الزرقانی : والعوالی مختلفة المسافة ، فاقربها الی المدينة ما كان علی ميلين

مشرقی دیوار پر سایہ نہیں پڑے گا۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تمام روایتیں اس معنی پر محمول ہیں۔علامہ زرقانی رحمہ اللہ نے ''شرح مؤطا'' میں فرمایا ہے کہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث اس بات پر دال ہے کہ آنحضرت ﷺ عصر کی نماز اول وقت پڑھنے پر مواظبت فرماتے تھے۔

اور''مسلم'' نے اپنی صحیح میں بریدہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ: آنحضرت ﷺ عصر کی نماز ایسے وقت پر پڑھتے تھے کہ آفتاب بلند اور سفید وصاف ہوتا تھا۔

اور مسلم نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ: آنحضرت ﷺ عصر کی نماز ایسے وقت پڑھتے تھے کہ آفتاب بلند اور زندہ ہوتا تھا، اور کوئی جانے والا عوالی (یعنی مدینہ کی اطراف کی بستیوں تک) چلا جاتا اور آفتاب بلند رہتا۔اور اس روایت کو بہت سے اصحاب سنن نے روایت کیا ہے۔

علامہ زرقانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: عوالی کی مسافت مختلف تھی جو قریب قریب تھیں وہ

أو ثلاثة ، ومنها ما يكون على ثمانية اميال،

ومثل حديث انس هذا مروى عند الطبرانی من حديث جابر وعند الدار قطنی من حديث محمد بن جارية وعند ابی يعلی من حديث البراء بن عازب ،

وروی مسلم عن انس رضی الله عنه قال : صلی لنا رسول الله صلی الله عليه وسلم العصر، فلمّا انصرف اتاه رجل من بنی سلمة ، فقال : يا رسول الله ! انا نريد ان ننحر جزورا لنا ونحب ان تحضرها قال : نعم فانطلق وانطلقنا معه فوجدنا الجزور لم تنحر فنحرت ، ثم قطعت ثم طبخ منها ثم اكلنا قبل ان تغيب الشمس،

وفی رواية لمسلم ايضا عن رافع بن خديج رضی الله عنه قال : كنا نصلی

مدینہ سے دو تین میل تھیں اور بعض آٹھ میل دور تھیں۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کی طرح ''طبرانی'' نے جابر رضی اللہ عنہ سے اور ''دار قطنی'' نے محمد بن جاریہ رضی اللہ عنہ سے اور ابو یعلی نے براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے حدیثیں روایت کی ہیں۔

نیز ''مسلم'' نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے ہمیں عصر کی نماز پڑھائی، جب فارغ ہوئے تو آپ کے پاس بنی سلمہ میں سے ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا کہ: یارسول اللہ! میں ایک اونٹ ذبح کرنا چاہتا ہوں اور میری تمنا یہ ہے کہ آپ بھی تشریف لے چلیں، آپ نے فرمایا: اچھا، آپ تشریف لے گئے اور ہم بھی ساتھ گئے، جاکر دیکھا کہ اونٹ ابھی ذبح نہیں ہوا، اب ذبح کیا گیا اور ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے اور اس میں سے کچھ گوشت پکایا گیا اور ہم نے آفتاب غروب ہونے سے پہلے کھالیا۔

اور ''مسلم'' کی ایک روایت میں رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ: ہم

العصر مع رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم تنحر الجزور فتقسم عشر قسم ثم نطبخ فنأكل لحما نضيجا قبل ان تغيب الشمس ،

وروى الامام مالک فی المؤطا والبخاری فی صحيحه حديث انكار ابی مسعود الانصاری على المغيرة بن شعبة فی تاخيره صلاة العصر لما كان اميرا على الكوفة ،

ورواه ابن خزيمة والطبرانی وفيه : فينصرف الرجل من الصلوة فيأتی ذا الحليفة قبل غروب الشمس،

وروى الامام مالک فی المؤطا : ان عمر بن الخطاب رضی الله تعالى عنه كتب الى عماله : ان يصلوا العصر والشمس مرتفعة بيضاء نقية قدر مايسير الراكب فرسخين أو ثلاثة قبل غروب الشمس ،

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عصر کی نماز پڑھتے تھے اور پھر اونٹ ذبح کر کے دس حصے کرتے اور پھر گوشت پکاتے اور پکا ہوا گوشت غروب آفتاب سے پہلے کھا لیتے۔

اور امام مالک رحمہ اللہ نے اور بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں وہ روایت ذکر کی ہے جس میں ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کا انکار مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ پر منقول ہے، جبکہ مغیرہ رضی اللہ عنہ نے کوفہ پر امیر ہونے کی حالت میں عصر کی نماز میں دیر کی تھی۔

اور ''ابن خزیمہ'' اور ''طبرانی'' نے اس حدیث کو روایت کیا ہے، اور اس میں یہ ہے کہ: عصر سے فارغ ہو کر کوئی شخص غروب شمس سے پہلے ذوالحلیفہ تک چلا جاتا۔

اور امام مالک رحمہ اللہ نے ''مؤطا'' میں روایت کیا کہ: حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے عمال کو لکھ بھیجا تھا کہ: عصر ایسے وقت پڑھا کریں کہ آفتاب بلند اور سفید اور صاف ہو، اور کوئی سوار اس کے بعد تین فرسخ تک غروب سے پہلے جا سکے۔

قال النووی فی شرح مسلم : والمراد بهذه الاحاديث المبادرة بصلاة العصر اول وقتها ' لانه لا يمكن ان يذهب بعد صلوة العصر ميلين او ثلاثة ' والشمس لم تتغير إلا إذا صلى العصر حين كان ظل الشیء مثله ، ثم قال وفی هذه الاحاديث دليل لمذهب جمهور العلماء ان وقت العصر يدخل إذا صار ظل كل شیء مثله ،

وقال الامام الترمذی فی جامعه : ان تعجيل صلاة العصر هو الذی اختاره اهل العلم من اصحاب النبی صلی الله عليه وسلم منهم عمر بن الخطاب وعبدالله بن مسعود وعائشة وانس رضی الله تعالی عنهم' وغير واحد من التابعين،

إذا علمت ذلک تعلم ان الحكم بالمنع من صلوة العصر وقت مصير الظل مثله جماعة أو فرادی مخالف لهذه الاحاديث فلا يرتفع به الخلاف بل لا ينفذ لا سيما

علامہ نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں فرمایا ہے کہ: ان تمام احادیث سے مقصود یہ ہے کہ نماز عصر اول وقت پر پڑھی جائے، کیونکہ اگر نماز عصر ایک مثل پر نہ پڑھی جائے گی تو یہ ممکن نہ ہوگا کہ کوئی شخص تغیر آفتاب سے پہلے دو تین میل چلا جائے، پھر یہ بھی فرمایا کہ ان احادیث میں جمہور علماء کے مذہب کی دلیل ہے کہ عصر کا وقت ایک مثل سایہ ہونے پر داخل ہوجاتا ہے۔

اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے ''جامع ترمذی'' میں فرمایا کہ: نماز عصر جلدی پڑھنے کو بہت سے اہل علم صحابہ رضی اللہ عنہم پسند کرتے ہیں۔ منجملہ ان کے حضرت عمر اور عبداللہ بن مسعود اور عائشہ اور انس رضی اللہ عنہم ہیں، اور بہت سے تابعین بھی یہی فرماتے ہیں۔

جب کہ یہ معلوم ہوگیا تو تم یہ بھی سمجھ جاؤ گے کہ ایک مثل سایہ ہونے پر عصر کی نماز بجماعت یا تنہا تنہا پڑھنے سے منع کرنے کا حکم کرنا ان احادیث مذکورہ کے خلاف ہے، بس

وعمل الناس فی الاعصار والامصار بدخول وقت العصر عند مصیر الظل مثله ' فاذا لم یکن هو الراجح یکون عمل الناس فی الاعصار والامصار جاریا علی مرجوح مع توفر وجود العلماء فی کل عصر وفی کل مصر وهذا لا یعقل ،

وایضا القول بالعصر الثانی وان کان ظاهر الروایة عن الامام الاعظم رضی الله تعالی عنه ، لکن له قول آخر موافق للائمة الثلاثة وهو القول بالعصر الاول واختاره کثیر من اصحابنا الآخذین عنه ورجحه کثیرون منهم ' کما فی الدر المختار ، قال وعلیه عمل الناس وبه یفتی ' والذی حمل الناس فی الاعصار والامصار علی العمل بالعصر الاول ان احادیثه کثیرة صحیحة وفی العمل به رفق بالناس ' وفی العصر

اس حکم سے خلاف نہیں اٹھے گا بلکہ یہ حکم خود نافذ نہ ہوگا، بالخصوص جبکہ لوگوں کا تمام شہروں میں تمام زمانوں میں اسی پر عمل ہے کہ ایک مثل سایہ ہونے پر عصر کی نماز کا وقت سمجھتے ہیں تو اگر یہ قول راجح نہ مانا جائے تو لازم ہوگا کہ تمام لوگوں کا عمل قول مرجوح پر ہو، حالانکہ ہر زمانہ میں اور ہر شہر میں بکثرت علماء موجود تھے اور یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

امام صاحب کا ایک قول بھی مثل اول کے موافق ہے

نیز یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اگر چہ دو مثل پر عصر کا وقت داخل ہونے کی روایت امام اعظم رحمہ اللہ سے ظاہر روایت ہے، لیکن ان کا دوسرا قول ائمہ ثلاثہ کے قول کے موافق بھی ہے، وہ یہی کہ ایک مثل پر عصر کا وقت ہوجاتا ہے، اور اسی قول کو ان کے اکثر شاگردوں نے اختیار کیا ہے، اور بہت لوگوں نے اسے ترجیح دی ہے.................. جیسے ''درمختار'' میں کہا کہ: اس قول پر لوگوں کا عمل ہے اور اسی پر فتویٰ دیا جاتا ہے۔ اور تمام لوگوں کے اس قول پر عمل کرنے کا باعث یہ ہے کہ اس کی روایتیں بہت ہیں اور صحیح ہیں اور اس میں لوگوں کو

الثانی اختلاف کثیر بین العلماء فی المذاهب ، فمن العلماء من یقول یکره التاخیر الیه ' ومنهم من یقول یحرم التاخیر الیه ' ومنهم من یقول یخرج به وقت العصر ،

وقولهم ان ظاهر الروایة مرجح مقید عندهم بما اذا لم یصحح مقابله ، وقد صحح القول بالعصر الاول کثیرون منهم وقالوا وبه یفتی ،

ومقید ایضا بما إذا لم یکن عمل الناس علی خلافه وهنا عمل الناس علی خلاف العصر الثانی ، وکذلک قولهم یقدم قوله علی قول الصاحبین قیده اهل مذهبه بما إذا لم یکن عمل الناس علی قولهما ، والا فیقدم قولهما علی قوله کما قالوا ' اھ،

آسانی ہے،اوردومثل کی روایت میں علمائے مذاہب کا بہت اختلاف ہے،بعض علماء دومثل تک تاخیر کومکروہ کہتے ہیں،اوربعض حرام کہتے ہیں،اوربعض کہتے ہیں کہ دومثل پرعصر کا وقت نکل جاتا ہے۔

ظاہرروایت کب راجح ہوتی ہے؟

اورفقہاء کا یہ قول کہ''ظاہرروایت راجح ہوتی ہے''ان کے نزدیک اس صورت میں ہے کہ ظاہرروایت کے مقابل قول کی تصحیح نہ کی گئی ہو،حالانکہ ایک مثل کے قول کی تصحیح بہت سے فقہاء نے کی ہے،اوراسی کے قائل ہیں اوراسی پرفتویٰ دیاجاتا ہے۔

نیز قولِ مذکور میں یہ بھی قید ہے کہ ظاہرروایت کے خلاف مسلمانوں کا عمل نہ ہو، اوریہاں تومسلمانوں کاعمل دومثل کی روایت کے خلاف پرہے،اسی طرح فقہاء کے اس قول کوکہ''امام اعظم رحمہ اللہ کا قول صاحبین رحمہما اللہ کے قول پرمقدم ہے''اس قید سے مقید کیا گیا ہے کہ جبکہ مسلمانوں کا عمل صاحبین رحمہما اللہ کے قول پرنہ ہو،ورنہ صاحبین رحمہما اللہ کا قول امام کے قول پرمقدم ہوگا جیسے کہ فقہاء نے وقت عشاء کے بارے میں کہا ہے،یعنی

وفى وقت العشاء ان قول الامام يدخل وقت العشاء بمغيب الشفق الابيض ، وله ادلة قوية فى ذلک ، وقال الصاحبان : يدخل وقت العشاء بمغيب الشفق الاحمر، فقدموا قولهما على قوله ، وقالوا: ان عمل الناس على قولهما ، وقالوا بمثل ذلک فى المزارعة فانه لا يقول بهما ، وقال بها الصاحبان فقدموا قولهما على قوله ، وعللوا ذلک بان عمل الناس عليه ، وقال كثير منهم بمثل ذلک فى صلوة العصر،

واما ترجيح العلامة ابن نجيم للقول بالعصر الثانى فانه مخالف لعمل الناس، وكلامه متناقض حيث اعترف بانه يقدم قولهما إذا كان عمل الناس عليه فكيف يرجح قول الامام وعمل الناس على خلافه ،

وفى شرح العلامة العينى وهو من اكابرعلماء الحنفية على صحيح البخارى

امام اعظم رحمہ اللہ کے پاس اس قول پر قوی دلیلیں ہیں، اور صاحبین رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ: شفقِ سرخ کے غائب ہونے پر عشاء کا وقت ہوتا، تو اس مسئلہ میں بھی صاحبین رحمہما اللہ کے قول کو امام کے قول پر مقدم کیا ہے، اور یوں کہا کہ اس پر مسلمانوں کا عمل ہے، اسی طرح مزارعت کے بارے میں بھی کہ صاحبین رحمہما اللہ جواز کے قائل ہیں اور امام صاحب رحمہ اللہ جواز کے قائل نہیں، صاحبین رحمہما اللہ کے قول کو مقدم کیا، اور وجہ یہی بیان کی کہ اس پر لوگوں کا عمل ہے، اسی طرح بہت لوگوں نے عصر کے وقت کے بارے میں بھی کہا ہے۔

رہی یہ بات کہ علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے دو مثل کی روایت کو ترجیح دی ہے تو ان کی یہ ترجیح مسلمانوں کے عمل کے خلاف ہے، اور پھر ان کے کلام میں تناقض بھی ہے، کیونکہ انہوں نے خود اقرار کیا ہے کہ صاحبین رحمہما اللہ کا قول جبکہ لوگوں کا اس پر عمل ہو مقدم ہوتا ہے، پھر وہ کس طرح امام کے قول کو ترجیح دیتے ہیں، حالانکہ عمل اس کے خلاف پر ہے۔

اور علامہ عینی رحمہ اللہ نے جو اکابر حنفیہ میں سے ہیں' شرح بخاری میں علامہ نووی رحمہ

اعتراض على النووى حيث قال فى شرح مسلم : وقال ابو حنيفة لا يدخل أى وقت العصر حتى يصير ظل كل شىء مثليه ، فتعقبه العلامة العينى فى شرحه المذكور بان الحنفية لم يقولوا بذلك ، وانما هو رواية اسد بن عمرو وحده عن ابى حنيفة ، وروى الحسن عنه : ان اول وقت العصر إذا صار ظل كل شىء مثله ' وهو قول ابى يوسف ومحمد وزفر واختاره الطحاوى ، فهذا الكلام من الامام العينى اقل ما يدل عليه انه يرجح القول بان وقت العصر اذا صار ظل كل شىء مثله ، وانا اقول : ورواية العصر الاول قول الصاحبين ، ورواية عن الامام ايضا وهو قول زفر والائمة الثلا ثة وبه يفتى وهو الاظهر ، وبه نأخذ وعليه العمل، واستظهر صاحب رد المحتار ان الكلمتين الاخيرتين مساويتان للفظ الفتوى وانت خبير بان لفظ الفتوى مرجح

اللہ پر اعتراض کیا ہے کہ: انہوں نے کہہ دیا کہ ''امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جب تک سایہ دومثل نہ ہو عصر کا وقت داخل نہیں ہوتا'' تو علامہ عینی رحمہ اللہ نے شرح مذکور میں اس پر اعتراض یہ کیا کہ حنفیہ اس کے قائل نہیں، بلکہ صرف اسد بن عمرو رحمہ اللہ نے یہ امام صاحب رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، اور حسن رحمہ اللہ نے امام صاحب رحمہ اللہ سے روایت کیا کہ ایک مثل سایہ ہونے پر عصر کا اول وقت ہو جاتا ہے، اور یہی امام ابو یوسف وامام محمد وزفر رحمہم اللہ کا قول ہے، اور اسی کو امام طحاوی رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے، پس علامہ عینی رحمہ اللہ کا یہ کلام کم از کم ایک مثل کی روایت کو ترجیح دیتا ہے، اور میں کہتا ہوں کہ ایک مثل پر عصر کا وقت ہو جانا صاحبین رحمہما اللہ کا قول ہے، اور امام صاحب رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت ہے اور یہی امام زفر اور ائمۂ ثلاثہ رحمہم اللہ کا قول ہے اور اسی پر فتویٰ ہے اور یہی اظہر ہے اور اسی کو ہم اختیار کرتے ہیں اور اسی پر عمل ہے۔ اور صاحب ردالمحتار نے بتلایا کہ: پچھلے دونوں لفظ فتویٰ کے برابر ہیں، اور تم جانتے ہو کہ لفظ فتویٰ اور دوسرے الفاظ سے راجح ہوتا ہے جیسا

علی غیرہ من الفاظ التصحیح کما فی رسم المفتی ، والمسئلة مبسوطة فی معتمدات المذهب' وحیث کان قولهما مصرحا بانه به یفتی وبه نأخذه وعلیه عمل الناس یکون هو المفتی به فی المذهب ،

وفی المواهب اللطیفة شرح مسند ابی حنیفة رضی الله عنه للشیخ عابد السندی ما نصه ، وقد الف الشیخ بن نجیم صاحب البحر الرائق رسالة لتائید مذهب الامام فی هذه المسئلة واستدل علی مطلوبه بادلة متعددة ، واجاب عنها الشیخ ابوالحسن السندی فی حاشیة فتح القدیر لابن همام ، لکن لما رأیت رجوع الامام الی قول الجمهور ما وسعنی ذکر شیء من الادلة ، والجواب عنها ،

واما للاختصار مع انه روی فی المسئلة المذکورة عن الامام روایات متعددة ،

کہ ''رسم المفتی'' میں بیان کیا گیا ہے، اور یہ مسئلہ کتبِ معتمدہ میں مبسوط طور پر بیان کیا گیا ہے، اور جبکہ صاحبین رحمہما اللہ کے قول کے متعلق تصریح ہو کہ وہ مفتی بہ اور ماخوذ ہے اور اس پر لوگوں کا عمل ہے تو مذہب میں وہی مفتی بہ ہوگا۔

اور ''مواہب لطیفہ شرح مسند ابوحنیفہ'' میں جو شیخ عابد سندھی رحمہ اللہ کی ہے یہ لکھا ہے کہ: شیخ ابن نجیم صاحب بحرالرائق رحمہ اللہ نے امام اعظم رحمہ اللہ کی اس مسئلہ میں تائید کے واسطے ایک رسالہ لکھا ہے، اور اپنے مطلوب پر متعدد دلیلیں بیان کی ہیں، اور ان دلیلوں کے جواب شیخ ابوالحسن سندھی رحمہ اللہ نے علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ کی ''فتح القدیر'' کے حاشیہ میں دیئے ہیں، لیکن جب میں نے دیکھا کہ امام اعظم رحمہ اللہ نے جمہور کے قول کی طرف رجوع کرلیا ہے تو مجھے ان دلائل اور جوابوں کے ذکر کرنے کی گنجائش نہ معلوم ہوئی۔

امام صاحب سے متعدد روایات اور صاحبین کے قول کی طرف رجوع

امام اعظم رحمہ اللہ سے اس مسئلہ میں متعدد روایتیں ہیں، منجملہ ان کے مثلین کی روایت

فمنها رواية صيرورة الظل مثلين ، ومنها رواية المثل الى ان قال ، وذكر فی خزانة الروايات ناقلا عن ملتقى البحار: ان اباحنيفة رحمه الله قد رجع فی خروج وقت الظهر ودخول وقت العصر الى قولهما ،

وممن نقل ايضا رجوع الامام الى قول صاحبيه صاحب الفتاوى الشافی وصاحب الانيس وصاحب الجوهر النير شرح تنوير الابصار،

وذكر ايضا فی زيادات الهندوانی على مستدرك الشيبانی فی باب ما يحل اكله ومالا يحل وقال : قد صح رجوع ابی حنيفة عن............ له لا يحل اكل لحم الخيل وخروج وقت الظهر ودخول وقت العصر وعن اشياء عددها .... نقل الرجوع ايضا صاحب الصراط القويم ....

ہے، اورمنجملہ ان کے ایک مثل کی روایت ہے (یہاں تک کہ کہا) اور ''خزانۃ الروایات'' میں ''ملتقی البحار'' سے نقل کر کے ذکر کیا ہے کہ: ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے خروج وقت ظہر اور دخول وقت عصر کے بارے میں صاحبین رحمہما اللہ کے قول کی طرف رجوع کیا ہے۔

اورمنجملہ ان لوگوں کے جنہوں نے امام رحمہ اللہ کا رجوع نقل کیا ہے صاحب فتاویٰ شافی اور صاحب کتاب انیس اور صاحب الجوہرالنیر شرح تنویرالابصار ہیں۔

نیز یہ رجوع ''زیادات ہندوانی علی مستدرک الشیبانی'' کے ''باب ما يحل اكله ومالا يحل ''میں بھی مذکور ہے، اور کہا ہے کہ: امام صاحب رحمہ اللہ کا گھوڑے کے گوشت کھانے کے بارے میں اور خروج وقت ظہر اور دخول وقت عصر کے بارے میں اپنے قول سے رجوع ثابت ہے، اور یہ بھی چند چیزوں سے جن کو شمار کر دیا ہے رجوع کرنا بیان کیا ہے، اور صاحب صراط قویم نے بھی امام رحمہ اللہ کا رجوع نقل کیا ہے۔

كان هذا القدر مقررا فى رجوع الامام .... الى ذلک قول اهل المذهب إذا كان الامام فى جانب وصاحباه فى جانب فالمفتى بالخيار ان شاء افتى بقول الصاحبين وكان الرجوع الى قول الجمهور واجبا ،

واما قول صاحب البحر لا نفتى ولا نعمل إلا بقول الامام الاعظم وان افتى المفتون بخلافه ، فذلک محله فيما لم تختلف الرواية فى تلک المسئلة عن الامام ولم ينقل عنه الرجوع والا فمتى اختلفت الروايات عنه وكانت احداهما مما يتمسک به صاحباه ويرويانه عن الامام فمن افتى بقولهما فانما افتى بقول الامام لانهما انما يرويان من قول الامام لا برأى لهما مجرد عن قول الامام فتنبه ،

اور جب اس قدر نقول سے امام رحمہ اللہ کا رجوع ثابت ہو گیا، نیز اس کے ساتھ اہل مذہب کا یہ قول بھی ہے کہ: جب امام رحمہ اللہ ایک جانب ہوں اور صاحبین رحمہما اللہ ایک جانب ہوں تو مفتی کو اختیار رہے چاہے جس قول پر فتویٰ دے، تو اب جمہور کے قول کی طرف رجوع کرنا واجب ہے۔

رہا صاحب بحر الرائق کا یہ کہنا کہ: ’’ہم تو نہ فتویٰ دیں گے اور نہ عمل کریں گے مگر امام رحمہ اللہ کے قول پر خواہ اور مفتی اس کے خلاف پر فتویٰ دے دیں‘‘ تو اس قول کا محل وہ صورت ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ سے اس قول میں روایت مختلف نہ ہو اور رجوع منقول نہ ہو، ورنہ جبکہ خود امام صاحب رحمہ اللہ سے روایات مختلفہ موجود ہوں اور ان میں سے ایک روایت سے صاحبین رحمہما اللہ نے تمسک کیا ہو اور اسے روایت بھی امام صاحب رحمہ اللہ سے کرتے ہوں تو جو شخص صاحبین رحمہما اللہ کے قول پر فتویٰ دیتا ہے وہ امام رحمہ اللہ ہی کی روایت اور ان ہی کے قول پر فتویٰ دیتا ہے، کیونکہ صاحبین، امام رحمہم اللہ کا قول ہی روایت کرتے ہیں صرف اپنی رائے سے نہیں کہتے۔

والحاصل انه علی تقدیر عدم رجوع الامام الاعظم رضی الله تعالی عنه عن القول بالعصر الثانی فالروایة الاخری عنه بالعصر الاول لها مرجحات کثیرة ، لا سیما وقد اخد بها اکثر اصحابه الآخذین عنه بلا واسطة کأبی یوسف ومحمد وزفر والحسن بن زیاد فهم اعرف الناس باقواله من غیرهم ، فترجیحهم یقدم علی ترجیح غیرهم لا سیما ، وذلک هو الذی اختاره جماهیر علماء المسلمین وهو الارفق بالمؤمنین وعلیه عمل اکثر امصار الاسلام علی ممر اللیالی والایام ، فالواجب علی من یتعاطی الفتوی النظر الی کثرة المرجحات مع مراعاة ما هو الاصلح للاسلام والمسلمین فانه من اعظم المرجحات ، ولیحذر من الفتویٰ بما یوجب التفرق

حاصل یہ ہے کہ دو مثل کی روایت سے اگر امام رحمہ اللہ کا رجوع بھی نہ ہوتا جب بھی امام رحمہ اللہ کی دوسری روایت (ایک مثل کی) کے لئے مرجحات کثیرہ ہیں، بالخصوص یہ بات کہ اس روایت کو ان کے اکثر شاگردوں جیسے امام ابو یوسف امام محمد امام زفر امام حسن بن زیاد رحمہم اللہ نے اختیار کیا ہے، اور چونکہ یہ حضرات امام صاحب رحمہ اللہ کے بلا واسطہ شاگرد ہیں، اس لئے یہ امام رحمہ اللہ کے اقوال سے غیروں سے زیادہ واقف ہیں تو ان کا ایک مثل کی روایت کو ترجیح دینا غیروں کی ترجیح سے مقدم ہوگا، بالخصوص جبکہ اس کو جماہیر علماء مسلمین نے اختیار کیا اور اس میں مسلمانوں کے لئے آسانی بھی ہے اور تمام زمانوں میں مسلمانوں کے اکثر شہروں میں اسی پر عمل ہے، پس جو شخص فتویٰ دینا چاہے اس پر واجب ہے کہ کثرت ترجیحات کے ساتھ اس کا بھی لحاظ کرے کہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے کون سی بات مناسب ہے، کیونکہ رعایت مناسب بھی بہت بڑی مرجح چیز ہے، اور ایسا فتویٰ دینے سے بچے جس میں افتراق پیدا ہو جبکہ ایسا قول صحیح موجود ہے جس سے اتفاق

وعدم اتفاق الكلمة مع وجود قول صحيح يوجب الاتحاد والاتفاق ،

فقد اتضح وظهر الجواب عن سوال السائل و علم انه لا يجوز منع من اراد الصلوة فى العصر الاول،

هذا ما ظهر لى فى هذه القضية ، والعلم امانة فى اعناق العلماء وليعرض ذلك على العلماء من اهل الهند وغيرهم ليميزوا الخطاء من الصواب وفوق كل ذى علم عليم ، والله سبحانه وتعالى اعلم ، وصلى الله على سيدنا محمد وعلى آله واصحابه وسلم،

واتحاد قائم ہوسکتا ہے۔

اب سوال سائل کا جواب واضح اور ظاہر ہوگیا اور معلوم ہوگیا کہ جو شخص ایک مثل پر نماز پڑھنا چاہے اسے منع کرنا جائز نہیں۔

یہ وہ بات ہے جو مجھے معلوم ہوئی اور علم علماء کے پاس امانت ہے اور علمائے ہند وغیرہم کے سامنے بھی اس جواب کو پیش کرنا چاہیۓ تا کہ وہ خطا وثواب کو ممیّز کردیں۔وفوق کل ذى علم عليم ، والله سبحانه اعلم ، وصلى الله على سيدنا محمد وعلى آله واصحابه وسلم ، تمت۔

یہ رسالہ سید احمد دحلان مفتی مکہ معظّمہ کے رسالے اور'' التعليق الممجد على مؤطا الامام محمد '' کا خلاصہ اور لب لباب ہے،جس کو زیادہ تفصیل مطلوب ہو وہ سید صاحب موصوف کے اصلی رسالے کو نیز''التعليق الممجد '' وغیرہما کو ملاحظ فرمائے۔کتبہ:عبد من عباد اللہ خادم الطلبہ :القاضی رحمت اللہ غفر اللہ لہ ولوالدیہ واساتذتہ،راندیرؔ ضلع سورت

رمضان المبارک ۱۳۳۵ھ

ازالة الأوهام عن مسائل الاحکام

اس رسالہ میں مؤلف رحمہ اللہ نے مسلک حنفی میں ایک مثل پر وقت عصر کی تحقیق اور جمعہ کی دوسری اذان کا جواب مشروع ہونے پر بڑی قوت استدلال اور اکابر علماء کی تائیدی دستخط سے اپنے موقف کو ثابت کیا ہے، اور موصوف پر کئے جانے والے اعتراضات کے جوابات بھی دیئے ہیں۔

حضرت مولانا قاضی رحمت اللہ صاحب لاجپوری' راندیری

ترتیب' وعنوانات

مرغوب احمد لاجپوری

عرض محشی وتعارف کتاب

حضرت مولانا قاضی رحمت اللہ صاحب لاجپوری ثم راندیری رحمہ اللہ نے جمعہ کی دوسری اذان کا جواب زبان سے دینا کیسا ہے؟ اس موضوع پر ایک رسالہ ''العطر العنبری فی حکم اجابة الاذان المنبری '' اور عصر کے ابتدائی وقت کے سلسلہ میں ایک رسالہ ''کحل البصر فی ذکر وقت العصر'' تحریر فرمایا تھا، جب یہ دونوں رسالے شائع ہوئے تو بعض اہل علم کی طرف سے ان پر اشکالات کئے گئے، موصوف نے یہ رسالہ ان اشکالات کے جوابات کے لئے تحریر فرمایا۔

دوران تحریر موصوف میں قدرے شدت بھی آ گئی، اور ایسا ہو جانا ایک فطری عمل ہے، جب کسی کے تعاقب میں کوئی اہل علم تحریر لکھتا ہے اور مصنف کو اس سے موافقت نہ ہو تو جواب دیتے وقت کہیں نہ کہیں اختیار سے یا بے اختیاری میں کچھ شدت آ ہی جاتی ہے۔ اور بعض مواقع پر ایسی شدت نامناسب بھی ہوتی ہے مگر ہر جگہ اسے نامناسب نہیں کہا جا سکتا۔

بہر حال ان رسائل کے جواب میں یہ رسالہ لکھا گیا، اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ ان تینوں رسالوں کو ایک ساتھ ہی شائع کر دیا جائے۔ یقیناً اہل علم کو ان رسائل سے اختلاف ہو سکتا ہے، اور ان کی رائے میں دوسرے حضرات کا مسلک ممکن ہے کہ زیادہ درست اور مفتی بہ ہو، مگر مصنف کی اپنی تحقیق اور اس پر دلائل ہیں، راقم چونکہ حضرت مؤلف کے جملہ رسائل کو شائع کرنا چاہتا تھا، اس لئے ان بقیہ تین رسائل کو بھی شائع کر رہا ہے۔

اللہ تعالی ان کو شرف قبولیت سے نوازے اور مؤلف مرحوم، راقم اور ان کی طباعت کے جملہ معاونین کے لئے ذخیرۂ آخرت اور ذریعۂ نجات بنائے، آمین۔

مرغوب احمد لاجپوری

عرض مؤلف وسبب تالیف

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ، اما بعد !

اضعف عباد اللہ القاضی رحمت اللہ الحنفی مذھبا والقادری مشربا والراندیری متوطنا : خیرخواہ اسلام والمسلمین عرض کرتا ہے کہ: ظلم وجہل اور جبلی انا سے اہل ادیان میں ہمیشہ کج روی پیدا ہوتی رہی ہے، اور بمصداق ''لکل فرعون موسی '' جہاں بدعتی اور فساق نے منہ دکھایا وہیں قامع البدعت ومحی سنت نے ان کا منہ کالا کر کے حق کو ظاہر فرما دیا ہے۔ یہ دین اسلام جس کی حفاظت کا وعدہ محکم ہے، اور جس کے اصولِ مستحکم اہل تحریف کی دست برد سے بتوفیق خداوندی سالم ہیں، اس میں فرقۂ ناجیہ اہل سنت والجماعت نے اعتقادیات دینی کی حفاظت کے لئے جو اصول کتاب وسنت کے دلائل قاہرہ اور عقلِ صحیح کے براہین باہرہ سے منضبط کر کے مدون کر دیئے ہیں، ان میں سے کوئی اصل ایسی نہیں ہے کہ ہوا سے متزلزل ہو سکے۔ دیکھئے! جب میرا رسالہ ''کحل البصر فی ذکر وقت العصر '' اور دیگر رسالہ ''العطر العنبری فی حکم اجابت اذان المنبری '' طبع ہو کر دست بدست تقسیم ہونے لگا، اس وقت بعض الناس نے زبان درازی کرنی شروع کی، اور کسی نے کہا کہ: اس میں قاضی نے مولوی عبدالحئ صاحب لکھنوی رحمہ اللہ کی پیروی کی ہے، مگر اس میں عبدالحی صاحب لکھنوی کی کیا غلطی ہے، باوجود اس کے کہ یہ بعض الناس علامہ لکھنوی رحمہ اللہ کے شاگرد کے درجہ کی بھی لیاقت اور علمیت نہیں رکھتے ہیں، بلکہ ان کے مقابلہ میں بمنزلۂ طفل مکتب کے ہیں، چھوٹا منہ بڑی باتیں کرنے لگے اور: ع

''خطائے بزرگاں گرفت خطاست''

کو پس انداز کر کے ان کے قول کو غلط بتلانے لگے، لہذا اب ناظرین پر تمکین کو دکھاتا ہوں

کہ قول بعض الناس کا غلط ہے یا علامہ لکھنوی رحمہ اللہ کا؟ چنانچہ اسی واسطے قول علامہ لکھنوی رحمہ اللہ کے ثبوت کے لئے اقوال رسول اللہ ﷺ اور اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور اقوال ائمۂ مجتہدین وعلمائے متقدمین ومتاخرین رحمہم اللہ کتب معتبرہ متداولہ سے اس رسالہ عجالہ نافعہ میں نقل کرکے ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں تاکہ ظاہر ہو جاوے کہ علامہ لکھنوی رحمہ اللہ کی غلطی نہیں ہے، بلکہ قول بعض الناس ہی کا غلط اور دروغ بے فروغ ہے۔

اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ: یہ رسالہ اغلاط کی فہرست ہے، اس کا رد ایسا لکھوں گا کہ لوگوں میں ایک مضحکہ ہو جائے گا، اور حدیث نبوی ''من ضحک ضحک'' کا کچھ خیال نہ کیا، اسی بنا پر خدا نے چاہا تو اب بعض الناس کا مضحکہ ہوگا۔

اور کبھی یوں فرمانے لگے کہ: اس رسالہ میں زہری کے تابعی ہونے سے نفی کی گئی ہے، قاضی نے یہ کتنی بڑی غلطی کی ہے کہ ادنی طالب علم بھی ایسی غلطی نہ کرے گا، مگر اتنی توفیق نہ ہوئی کہ مجھ سے اصل مسودہ طلب کرکے ملاحظہ فرماتے، اگر میرے اصل مسودہ کو اب بھی ملاحظہ فرمائیں تو معاً اپنی غلطی و بہتان کے قائل ہو جائیں، مگر ''المعترض کالاعمیٰ'' مشہور نزدیک و دور ہے، پھر کیوں یہ انصاف نظر آوے؟ اگر بعض الناس میرے اصل مسودہ کو ملاحظہ فرماتے تو اس میں یہ عبارت پاتے کہ ''زہری نہ صحابی ہیں اور نہ کبارِ تابعی'' الغرض نفی کمال کی ہے نہ اصل تابعی ہونے کی۔ باوجود اس کے اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے فرض بھی کریں کہ رسالہ میں ''زہری تابعی نہیں ہیں'' لکھا ہے تو کیا اہل انصاف حضرات اتنا خیال نہ کریں گے کہ جس شخص نے مدت مدید اور عرصۂ بعید سے کتب احادیث کی خدمت جاری رکھی ہو، پھر وہ ایسی ادنی غلطی کا دیدہ و دانستہ کیونکر مرتکب ہو سکتا ہے؟ تو یہ خطا قلم ناسخ وناقل سے ہے یا اس جگہ نفی کمال کی ہو جیسا کہ فرمانِ نبوی ہے: ''لا صلوة لجار المسجد فی

بیته ''اسی طرح ''لا صلوۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب ''اسی طرح ''لا ایمان لمن لا امانۃ لہ ''ان اقوال کے ماسوااور بھی بہت سے اقوال ہیں کہ علماءِ متبحرین ومحققین نے ان کی تاویل نفی کمال کے ساتھ کی ہے، لیکن یہ انصاف کی باتیں تو ان حضرات کے پیش نظر رہتی ہیں کہ جن کے دل میں بغض وعناد قرار گزیں نہ ہو، پس جن کے دلوں میں بغض وعناد کا زنگ چھا گیا ہووہ بمصداق ع

آنچہ در دیگ است از چمچہ بروں آید

کے ظہور پذیر ہوتا ہے، پس بغض وعناد کا زہر جس طرح ابالا گیا' ابال دیا، کیونکہ بعض الناس کو ایسا نادر موقعہ پھر کب ملتا، بس اسی کو غنیمت سمجھا، لیکن'' تعز من تشاء وتذل من تشاء '' کا کچھ خیال نہ کیا۔

اور کبھی فرمانے لگے کہ: قاضی اپنے رسالوں کے نام عمدہ عمدہ تلاش کر کے رکھتا ہے تا کہ لوگوں میں رسالوں کا اعتبار ہو جاوے، مگر جب وہ رسالوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں جن جن کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں، ان میں دیکھتے ہیں تو وہ عبارت ندارد' 'ھذا بھتان عظیم وافتراء مبین '' ہے، اس کے رد اور جواب میں علی رؤس الاشہاد لکھتا ہوں کہ اگر تم صرف ایک عبارت ہی ایسی ثابت کر دو کہ میں نے جس کتاب کا حوالہ دیا ہو اس کتاب میں یہ عبارت نہ ہو تو میں دس روپئے انعام دوں گا، ورنہ توبہ کر کے'' لعنت اللہ علی المتہمین الکاذبین '' کہہ دو۔

اور کبھی بعض الناس اپنے معتقدین کے سامنے یوں درفشانی فرماتے ہیں کہ: قاضی نے اپنے رسالوں میں وہابیت کے اقوال نقل کر کے لوگوں کو وہابیت کی تعمیل بتائی ہے، معاذ اللہ واللہ المستعان علی ما تصفون' کیوں اس قدر دروغ گوئی پر کمر باندی ہے؟ بندۂ خدا

کچھ تو خوف خدا کرو، کل مرنے کے بعد جواب دہی کا وقت آنے والا ہے، مگر میں بحکم ﴿ فاصبر وما صبرک إلا بالله ولا تکن فی ضیق مما یمکرون﴾ صبر کرتا ہوں، اور اتنا لکھتا ہوں کہ میرے رسالوں میں ان شاء اللہ ایک قول بھی حنفیت کے خلاف اور وہابیت کے موافق ثابت نہیں کرسکو گے، اور اگر حنفیت کے خلاف کوئی قول نکال دو تو اس پر بھی دس روپئے انعام پاؤ گے، اور بحکم ''ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین ''نیز ساتھ ہی ''وادعوا شھدائکم ان کنتم صادقین ''خوب ہی سعی بلیغ سے کام لو، اور مجھ سے انعام لو، مگر بمصداق قولہ تعالی : ﴿وان تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارة ﴾ پر عمل کرکے ایسے ناشائستہ حرکات سے باز آ ؤ، حسبنا الله ونعم الوکیل ، وافوض امری الی الله ان الله بصیر بالعباد۔

مقدمہ

اے مسلمانو! آگاہ ہوجاؤ کہ ہم سب پر حضرت رسول کریم ﷺ کی اتباع واجب ولازم ہے بحکم ﴿ان کنتم تحبون الله فاتبعونی یحببکم الله ﴾، علامہ ابن عابدین حنفی المذہب رحمہ اللہ ''رد المحتار ''(۵۰/۱) میں تحریر فرماتے ہیں کہ: جب حدیث صحیح ہو اور مذہب کے خلاف ہو تو حدیث پر عمل کیا جاوے، یہی اس کا مذہب ہوگا اور حدیث پر عمل کرنے سے حنفیت سے خارج نہ ہوگا، کیونکہ یہ صحیح طور پر ثابت ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب حدیث صحیح ملے تو وہی ہمارا مذہب ہے، حکایت کیا اس کو ابن عبد البر نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور دیگر ائمہ سے، انتہی۔

اور وہ عبارت یہ ہے:

(قلت) : قد یجاب بأن الإمام لما امر اصحابه بأن يأخذوا من اقواله بما يتجه لهم منها عليه الدليل صار ما قالوه قولا له لابتنائه على قواعده التى اسسها لهم ' فلم يكن مرجوعا عنه من كل وجه ' فيكون مذهبه ايضا، ونظير هذا ما نقله العلامة بيرى فى اول شرحه على الاشباه عن شرح الهداية لابن الشحنة ' ونصه إذا صح الحديث وكان على خلاف المذهب عمل بالحديث ويكون ذلک مذهبه ' ولا يخرج مقلده عن كونه حنفيا بالعمل به ، فقد صح عنه انه قال : إذا صح الحديث فهو مذهبى ، وقد حكى ذلک ابن عبد البر عن ابى حنيفة وغيره من الائمة ، اه ، ونقله ايضا الامام الشعرانى عن الائمة الاربعة،

اسی طرح ہمارے مذہب حنفی کے اصول فقہ کی کتابوں میں تصریح ہے کہ اگر قیاس کے مقابلہ میں حدیث ضعیف ہی ہو تب بھی قیاس پر عمل کرنے سے حدیث پر عمل کرنا اولیٰ ہے،

چنانچہ ’’نورالانوار‘‘ میں موجود ہے، اور’’ فتاویٰ تنقیح الحامدیہ‘‘ (۳۳۵/۲) میں ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ کے شاگردوں میں سے کسی ایک کے قول کو اخذ کرنا یقیناً بمنزلۂ اخذ قول ابی حنیفہ ہے، اور وہ عبارت یہ ہے:

ومتی اخذ بقول واحد منهم یعلم قطعا انه یکون آخذاً بقول ابی حنیفة ، فانه روی عن جمیع اصحاب ابی حنیفة من الکبار کابی یوسف ومحمد وزفر والحسن انهم قالوا ما قلنا فی مسئلة قولا الا وهو روایتنا عن ابی حنیفة ، واقسموا علیه ایمانا غلاظا فلم یتحقق اذاً فی الفقه بحمد الله تعالی جواب ولا مذهب الا له کیفما کان وما نسبا لی غیره الا بطریق المجاز للموافقة وهو کقول القائل قولی قوله ومذهبی مذهبه۔

اوراسی طرح ’’شامی‘‘ (۴۰۷/۳) میں ہے:

واما اذا حکم الحنفی بما ذهب الیه ابو یوسف أومحمد أو نحوهما من اصحاب الامام غیر خارجة من مذهبه ' فقد نقلوا عنهم انهم ما قالوا قولا الا هو مروی عن الامام کما اوضحت ذلک فی شرح منظومتی فی رسم المفتی۔

پس جبکہ ضروری باتیں اس مقدمہ میں درج ہوچکیں تو بنابریں چند مسائل مختلف فیہ بحوالہ کتب متداولہ نقل کرکے بطور سوال وجواب سلیس اردو زبان میں تحریر کرکے ناظرین کے پیش کرتا ہوں، اور امید رکھتا ہوں کہ اس میں اگر سہو وخطا سے کچھ نقص پاویں تو اس کو دامن عفو میں چھپا کر اصلاح فرمائیں۔

بپوش گر بخطائے رسی وطعن مزن   کہ ہیچ فرد بشر خالی از خطا نہ بود

ایک مثل پر وقت عصر کی روایت امام اعظم رحمہ اللہ سے ثابت ہے یا نہیں؟
اور اس روایت پر علماء حنفیہ محققین نے فتویٰ دیا ہے یا نہیں؟
اور اس روایت پر عمل کرنے والا مذہب حنفی رہے گا یا نہیں؟

سوال:......عصر کی نماز کا وقت ایک مثل سایہ پر ہونے کی روایت جناب امام اعظم رحمہ اللہ سے ثابت ہے یا نہیں؟ اور اس روایت پر علماء حنفیہ محققین نے فتویٰ دیا ہے یا نہیں؟ اور اس روایت پر عمل کرنے سے عامل اس روایت کا مذہب حنفی میں داخل ہے یا مذہب حنفی سے خارج ؟ بینوا توجروا۔

الجواب:...... اقول وبه نستعين: ایک سایہ پر سوائے سایۂ اصلی کے امام صاحب رحمہ اللہ کی روایت سے عصر کا وقت ہونا ثابت ہے، اور اس روایت پر علماءِ کرام حنفیہ نے فتویٰ بھی دیا ہے، مگر چند علماء اس کے خلاف ہیں ''درمختار'' میں ہے:

وعنه مثله وهو قولهما وزفر وائمة الثلاثة ' قال الامام الطحاوی : وبه نأخذ ، وفی غرر الاذكار وهو الماخوذ به وفی البرهان وهو الاظهر لبيان جبرئيل عليه السلام ' وهو نص فی الباب ، وفی الفيض وعليه عمل الناس اليوم وبه يفتى۔

یعنی جناب امام اعظم صاحب رحمہ اللہ سے ایک مثل کی روایت ہے، حسن نے امام صاحب رحمہ اللہ سے روایت کی ہے کہ جب ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہو گیا سوائے سایۂ اصلی کے تو ظہر کا وقت ختم ہو گیا، اور یہی قول صاحبین رحمہما اللہ کا ہے، اور امام زفر اور نیز تینوں اماموں کا یعنی امام شافعی اور امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔ اور امام طحاوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: اسی قول کو ہم لیتے ہیں، اور ''غرر اذکار'' میں ہے کہ: یہی قول لیا

گیا ہے، یعنی اسی پر عمل ہے اور ''برهان'' میں ہے کہ یہی ظاہر تر ہے جبرئیل علیہ السلام کے بیان کرنے سے، اور قول جبرئیل کا دربارۂ مواقیتِ نماز نص صریح ہے، اور ''فیض'' میں ہے کہ: آج لوگوں کا عمل اسی پر ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے، اسی طرح ''عنایہ حاشیہ ہدایہ'' میں ہے، اور نیز حاشیہ کنز میں ''متخلص'' اور ''فتح المعین'' سے منقول ہے: والفتویٰ فی الحرمین وغیرهما فی هذا الزمان علی قولهما، اور ''کنز'' کے بین السطور ''طحطاوی'' سے منقول ہے:

وقول آخر: إذا صار ظل كل شيء مثله وبه يفتي وروى الحسن بن زياد عنه اذا صار ظل كل شيء مثله سوى فيء الزوال خرج وقت الظهر ودخل وقت العصر وبه اخذ ابويوسف ومحمد وزفر والشافعي رحمهم الله۔

یعنی حسن بن زیاد رحمہ اللہ امام صاحب رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ: جب ہر شیء کا سایہ اس کے مثل ہو جائے سوائے سایۂ اصلی کے تو ظہر کا وقت نکل جاتا ہے اور عصر کا وقت داخل ہو جاتا ہے، اور اسی کو ابو یوسف و محمد و زفر و شافعی رحمہم اللہ نے لیا ہے۔

اور اسی طرح ''شرح وقایہ'' میں ہے:

وفي رواية اخرىٰ عنه وهو قول ابي يوسف ومحمد والشافعي اذا صار ظل كل شيء مثله سوى فيء الزوال ۔

اور اسی طرح ''عمدۃ الرعایہ'' میں ہے: واكثر الاحاديث الصحيحة دالة على ان بالمثل يخرج الظهر ويدخل العصر فمن ثم قال الطحاوي : وبه نأخذ ، وقال في غرر الاذكار : هو الماخوذ به وفي البرهان هو الاظهر لبيان جبرئيل وفي فيض الكرخي : عليه عمل الناس اليوم وبه يفتي۔

اوراسی طرح ''کفایہ حاشیہ ہدایہ'' میں ہے:

وقالا : إذا صار ظل كل شيء مثله خرج وقت الظهر ودخل وقت العصر وهو رواية عن ابى حنيفة رحمه الله۔

اسی طرح علامہ استاذ زماں، الحافظ المتقن المحدث شاہ ولی اللہ صاحب طاب اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ نے ''محلی شرح مؤطاامام مالک'' میں تحریر فرمایا ہے:

اعلم انه قال الجمهور إذا صار ظل كل شيء مثله بعد ظل نصف النهار خرج وقت الظهر ودخل وقت العصر، وقال ابوحنيفة في المشهور عنه : انه لا يخرج الظهر بمصير ظل المثل ولا يدخل ، بل يكون اول وقت العصر بمصير ظل كل شيء مثليه ' قال القرطبي : خالفه الناس كلهم حتى اصحابه ، وروى عن ابى حنيفة ايضا ان وقت الظهر الى المثل كما قالت الثلثة الباقية والجمهور ، وفي البدائع : هو الصحيح والاصل ، وفي الدر المختار : هو قولهما وزفر ، وقال الطحاوى : وبه نأخذ ، وفي غرر الاذكار : وهو المأخوذ به ، وفي البرهان : وهو الاظهر لبيان جبرئيل وهو نص في الباب ، وفي الفيض : وعليه عمل الناس اليوم وبه يفتى ، انتهى

یعنی ''محلی شرح مؤطا'' میں جناب خاتم المحدثین سراج السالکین استاذ الہند شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں: جان تو کہ جمہور علماء نے کہا ہے کہ: جب ہر شیء کا سایہ سوائے سایۂ اصلی کے اس کے مثل ہوجائے تو ظہر کا وقت نکل جاتا ہے اور عصر کا وقت داخل ہوجاتا ہے، اور مشہور روایت میں ابوحنیفہ سے مروی ہے کہ: عصر کا وقت داخل نہیں ہوتا ہے اور نہ ظہر کا وقت نکلتا ہے ایک مثل سایہ ہونے پر، بلکہ عصر کا وقت ہر شی کا سایہ دومثل ہونے پر ہوتا ہے، قرطبی نے فرمایا ہے کہ: امام صاحب رحمہ اللہ کے اس قول کی تمام علماء نے مخالفت کی ہے، یہاں تک کہ امام صاحب کے شاگردوں نے بھی

مخالفت کی ہے۔اور جناب ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ: ظہر کا وقت ایک مثل تک ہے جیسا کہ تینوں امام اور جمہور علماء نے فرمایا ہے۔اور ''بدائع'' میں ہے کہ: یہی صحیح اور اصل ہے،اور''درمختار'' میں ہے کہ: یہی مأخوذ بہ ہے،اور''برہان'' میں ہے کہ یہی اظہر ہے بوجہ بیان فرمانے جبرئیل علیہ السلام کے،اور یہ اس باب میں نص ہے،اور''فیض'' میں ہے کہ لوگوں کا عمل آج اسی پر ہے اور نیز اسی پر فتویٰ ہے،اور''غایۃ البیان'' میں ہے کہ: ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اسی کو لیا ہے،اور امام صاحب سے یہی مشہور ہے اور''ینابیع'' میں ہے کہ ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے یہی صحیح ہے،اب شاہ صاحب کی عبارت کا ترجمہ ختم ہوا۔

اور دونوں سوال اول اور دوم کا جواب ہو چکا ہے،اور''تعلیق الممجد''میں بھی اسی طرح مولوی عبدالحی مرحوم رحمہ اللہ نے تصریح کی ہے:

قوله : فقد دخل العصر' به قال ابويوسف والحسن والزفر والشافعي واحمد والطحاوي وغيرهم ' وهو رواية الحسن عن ابى حنيفة على ما فى عامة الكتب ، ورواية محمد عنه على مافى المبسوط كذا فى حلية المحلى شرح منية المصلى لمحمد بن امير حاج الحلبى وفى غرر الاذكار، وهو الماخوذ به ، وفى البرهان شرح مواهب الرحمن : هو الاظهر، وفى الفيض الكرخى : عليه عمل الناس اليوم وبه يفتى كذا فى در المختار، والاسناد لهم احاديث التعجيل ومنها احاديث الجابر المروى فى سنن النسائى وغيره : انه صلى الله عليه وسلم صلى العصر حين صار ظل كل شيء مثله۔

اسی طرح ''فتاویٰ رشیدیہ'' کے صفحہ:۹۸ ر میں مولانا سے مروی ہے۔

سوال:......نماز عصر اگر ایک مثل پر پڑھ لی جائے تو جائز ہو جاوے گی یا قابل اعادہ ہوگی؟

جواب:...... چونکہ ایک مثل کا مذہب قوی ہے،لہذا اگر ایک مثل پر عصر پڑھی جائے تو ادا

ہوجائے گی، اعادہ نہ کی جائے گی۔

اور صفحہ:۱۰۱/اور:۱۰۲/''فتاویٰ رشیدیہ'' میں ہے کہ:

مشفق مہربان میاں عزیز الدین صاحب سلمہ، از: عبدالرحمٰن عفی عنہ، بعد سلام مسنون!

واضح ہو کہ میں بیماریٔ متعلقین اور معالجۂ چشم خود کی فکر میں چند ماہ سے تھا، اس وجہ سے خط و کتابت بند ہے، اب بھی میں پرہیز میں ہوں، جو مسئلہ محصل اور کم غور کا ہوتا ہے اس کا جواب لکھتا ہوں اور زائد خط و کتابت نہیں کرسکتا ہوں، کیونکہ حکیم صاحب کی طرف سے کام کرنا منع ہے۔

تمہارے مسئلوں کا جواب یہ ہے کہ: نماز پڑھنے میں گھنٹے کا اعتبار نہیں، بعد زوال شمس سایہ اصلی کو چھوڑ کے ایک مثل کے اندر اندر جمعہ یا ظہر پڑھ لینی چاہیئے اور سوائے سایۂ اصلی کے ایک مثل کے بعد بروایت مفتی بہ وقت نماز عصر ہوجاتا ہے، اور رجوع امام صاحب رحمہ اللہ کا حال پھر پوچھنا، عصر کی نماز بعد ایک مثل کے ہوجاتی ہے اعادہ کی حاجت نہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہوا کہ جو بعض الناس گمان کرتے ہیں کہ عصر مغرب کے درمیان ڈیڑھ گھنٹہ کا فاصلہ چاہیئے یہ قول باطل ہے، کیونکہ اوپر بیان ہوچکا کہ نماز پڑھنے میں گھنٹہ کا اعتبار نہیں ہے، اب افسوس صد افسوس ان کٹ ملاؤں پر اور ان لوگوں پر ہے کہ اتنے اکابر علماء احناف محققین اور فضلاءِ کرام سالکین مثلاً شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ جو کہ استاذ الہند مانے جاتے ہیں، اور جناب علامہ مولانا رئیس المحدثین السالکین رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ اور علامہ مولوی عبدالحی مرحوم لکھنوی رحمہ اللہ جو کہ پشت پناہ مذہب حنفی کے مانے گئے ہیں' ان کے فتووں کو نظر انداز کر کے ان کے خلاف پر کمر باندھتے ہیں، اور ضد اور عار کر کے نار قبول کر کے بھولے بھالے عوام کالانعام کو اغوا کر کے ''ضلوا

فاضلوا'' کاعلم سر پر اٹھا کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بناتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ دوسایہ بغیر عصر کا وقت نہیں ہوتا، اور مذہب ضعیف پر عمل کر کے غیروں سے بھی عمل کراتے ہیں، اور قوی مذہب جو کہ ایک سایہ کے بعد وقت عصر کا ہونے پر احادیث صحیحہ اور روایت قویہ موجود ہیں، اس کو چھوڑ کر مسائل ضعیفہ پر عمل کرنا اور کرانا کتنی بڑی خطا اور برائی فی الدین ہے، نعوذ بالله منهم۔

اور تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ: امام ابو یوسف یا امام محمد یا صاحبین رحمہم اللہ کے قول پر کوئی عمل کرے یا فتویٰ دیوے تو وہ عمل کرنے والا حنفیت سے خارج نہیں ہوتا ہے، کیونکہ کتب فقہ میں اس کی تصریح موجود ہے کہ جناب امام اعظم صاحب رحمہ اللہ سے جس قول میں دو روایتیں موجود ہوں ان میں سے ایک روایت کو صاحبین رحمہما اللہ عمل میں لا کر ترجیح دیتے ہیں، بلکہ مذہب حنفی مرکب ان تینوں صاحبوں سے (یعنی امام اعظم امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ سے) ہے، چنانچہ ''شامی'' وغیرہ کتب فقہ میں اس کی تصریح موجود ہے۔ ''شامی'' کی عبارت یہ ہے:

وفی آخر الحاوی القدسی : وإذا أخذ بقول واحد منهم یعلم قطعا انه یکون به اخذا بقول ابی حنیفة ، فانه روی عن جمیع اصحابه الکبار کابی یوسف ومحمد وزفر والحسن' انهم قالوا : ما قلنا فی مسئلة قولا الا وهو روایتنا عن ابی حنیفة واقسموا علیه ایمانا غلاظا ' فلم یتحقق إذا فی الفقه جواب ولا مذهب الا له کیف ما کان وما نسب إلی غیره إلا بطریق المجاز للموافقة ، الخ۔

اور اس سے زائد خلاصہ ہم آگے بیان کر چکے ہیں، پس اس سے ثابت ہوا کہ مذہب حنفی بڑا وسیع مذہب ہے، اور اس میں وہ وسعت ہے کہ دوسرے مذہب میں نہیں، مگر بعض متعصبین ''بدنام کنندہ نکونامے چند'' وبدنام کنندہ مذہب حنفی امام صاحب رحمہ اللہ کے اقوال

مرجوعہ اور احادیث ضعیفہ کو مقابل میں اقوال قویہ اور احادیث صحیحہ کی حجت پکڑ کے امام صاحب رحمہ اللہ کی طرف نسبت کرتے ہیں باجودیکہ امام صاحب رحمہ اللہ خود تصریح فرماچکے ہیں: '' إذا صح الحديث فهو مذهبی '' چنانچہ '' شامی '' کی جلداول میں ہے:

ونظير ما نقله العلامة بيرى فى اول شرحه على الاشباه عن شرح الهداية لابن الشحنة ونصه : إذا صح الحديث وكان على خلاف المذهب عمل بالحديث ' ويكون ذلک مذهبه ولا يخرج مقلده عن كونه حنفيا بالعمل به ' فقد صح عنه انه قال : إذا صح الحديث فهو مذهبى ، وقد حكى ذلک ابن عبدالبر عن ابى حنيفة وغيره من الائمة ' اھ ، ونقله ايضا الامام الشعرانى عن الائمة الاربعة ' اھ ، ولا يخفى ان ذلک لمن كان اهلا للنظر فى النصوص ومعرفة محكمها من منسوخها فاذا نظر اهل المذهب فى الدليل وعملوا به صح نسبته إلى المذهب ' لكونه صادرا باذن صاحب المذهب إذ لا شک انه لو علم ضعف دليله رجع عنه إلى الدليل الاقوى۔

یعنی شرح ہدایہ میں ہے کہ: جب حدیث صحیح ہو اور وہ مذہب کے خلاف ہو تو بھی حدیث صحیح پر عمل کیا جاوے گا، اور وہ حدیث صحیح امام صاحب رحمہ اللہ کا مذہب ہوگا، اور امام صاحب رحمہ اللہ کا مقلد حنفی مذہب سے خارج نہیں گنا جاوے گا' حدیث صحیح پر عمل کرنے سے، کیونکہ امام صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: جب حدیث صحیح ہو تو وہ میرا مذہب ہے، چنانچہ اس کی بھی تصریح گزرچکی۔

امام صاحب رحمہ اللہ نے عصر کے بارے میں دوسایہ سے رجوع فرمایا؟

سوال:...... کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ومفتیان شرع متین زادکم اللہ تعالیٰ شرفا وتعظیما لدیہ! اس مسئلہ میں کہ جناب امام اعظم رحمہ اللہ نے عصر کے بارے میں دوسایہ سے ایک سایہ کی

طرف رجوع فرمایا ہے یانہیں؟ بینوا توجروا۔

جواب:……اقول وبہ نستعین: گوامام اعظم رحمہ اللہ نے عصر کے بارے میں دوسایہ سے ایک سایہ کی طرف رجوع فرمایا کہ ان کے نزدیک بقول مشہور عصر کا وقت سوائے سایہ اصلی کے دوچند سایہ ہونے پر تھا، مگر آپ نے اس قول سے رجوع کیا ہے اور سوائے سایۂ اصلی کے ایک سایہ پر عصر کا وقت ہونے کو اختیار فرمایا ہے، چنانچہ مولانا مولوی عبدالحی لکھنوی مرحوم رحمہ اللہ نے اپنے ''مجموعہ فتاویٰ'' کی جلد اول میں تصریح فرمائی ہے۔اور نیز علامہ سید احمد دحلان مرحوم مفتی مکہ معظّمہ نے اپنے رسالہ میں رجوع کرنے کو خوب زور وشور سے ثابت کیا ہے، اس کو بعینہ اس جگہ نقل کرتا ہوں:

ما قولكم ايها العلماء ! فى ان رجوع الامام ابى حنيفة عن تقدير وقت العصر بالمثلين ثابت ام لا ؟ بينوا توجروا ،

هو المصوب : نعم هو ثابت بتصريح جمع من الفقهاء ' ولهذا ولكون دلائل المثل اقوى افتى جمع من الحنفية بقول ابى يوسف ومحمد من ان انتهاء وقت الظهر صيرورة الظل مثله ، فقد ذكر فى خزانة الروايات عن ملتقى البحار : ان اباحنيفة قد رجع فى خروج وقت العصر إلى قولهما انتهى ، وفى المواهب اللطيفة شرح مسند ابى حنيفة فى هذه المسئلة للشيخ عابد السندى ، قد الف الشيخ ابن نجيم صاحب البحر رسالة لتائيد مذهب ابى حنيفة فى هذه المسئلة واستدل على مطلوبه بادلة متعددة ، واجاب منها ابوالحسن السندى فى حاشية فتح القدير لابن الهمام ، لكن لما رأيت رجوع ابى حنيفة إلى قول الجمهور ما وسعنى ذكر شىء من الادلة والجواب عنها وما للاختصار مع انه روى فى المسئلة روايات متعددة عن

الامام : فمنها رواية صيرورة الظل مثلين ومنها رواية المثل انتهى، وفى رسالة النصر فى ذكر وقت صلوة العصر للسيد احمد دحلان مفتى الشافعية بمكة المعظمة ممن نقل ايضا رجوع الامام الى قول صاحبيه صاحب الفتاوى الشامى وصاحب الكتاب الانيس وصاحب الجوهر المنير شرح تنوير الابصار وذكره ايضا فى زيادات الهندوانى على مستدرك الشيبانى فى باب ما يحل اكله ومالا يحل اكله ، قال : وقد صح رجوع ابى حنيفة عن قوله لا يحل أكل لحوم الخيل وخروج وقت الظهر وممن نقل الرجوع ايضا صاحب الصراط القويم،

یعنی عصر کے وقت میں دوسایہ سے ایک سایہ کی طرف امام صاحب رحمہ اللہ کا رجوع فرمانا ثابت ہے، اور بوجہ اقویٰ ہونے دلائل ایک مثل کے بعد عصر کا وقت ہونے کا ایک جماعت حنفیہ نے فتویٰ دیا ہے امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے قول پر کہ ظہر کا وقت ایک مثل ہونے پر ختم ہو جاتا ہے، پھر ''خزانۃ الروایات'' میں ذکر کیا گیا ہے'' ملتقی البحار '' سے کہ: امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے وقت ظہر کے نکلنے اور عصر کے وقت کے داخل ہونے میں صاحبین رحمہما اللہ کے قول کی طرف رجوع کیا ہے، اسی طرح آخر تک صاحبین رحمہما اللہ کے قول کی طرف امام صاحب رحمہ اللہ کا رجوع کرنا علامہ لکھنوی مرحوم رحمہ اللہ نے اپنے ''مجموعہ فتاویٰ'' کی پہلی جلد میں ثابت کیا ہے۔

کتبہ عبد من عباد اللہ خادم الطلبہ :

القاضی رحمت اللہ

جمعہ کی دوسری اذان کا جواب مشروع ہے یا نہیں؟

سوال:......ما قولكم دام فضلكم ايها العلماء العظام والفقهاء الكرام زادكم الله تعالیٰ شرفا وتعظيما لديه !اس مسئلہ میں کہ جمعہ کے روز قبل خطبہ منبر کے سامنے جواذان دی جاتی ہے اس اذان کا جواب لسانی اورقولی جواب اقامت کی طرح دینا مشروع ہے یا نہیں؟بينوا بيانا شافعا توجروا اجركم الله تعالى اجرا وافيا،

جواب:......صورتِ مسئولہ میں یہ مسئلہ بظاہر درمیان امام اعظم وصاحبین رحمہم اللہ مختلف فیہ ہے،لیکن علماء محققین اورفقہاء مدققین نے تصریح فرماتے ہوئے عمدہ طور پر تطبیق وتوفیق دے کر بیان فرمایاہے کہ کسی قسم کا اختلاف نہیں رہا،اور بالاتفاق اذان مذکور کے اجابت کی مشروعیت مذہب حنفی میں ثابت ہوچکی ہے،جیسا کہ’’عمدۃ الرعایۃ‘‘ کی جلد اول:۲۴۴؍ میں ہے:

واما الكلام فانما يكره منه قبل شروع الخطبة الدنيوى لا الدينى كالاذكار والتسبيح وبعد الشروع فيها يكره مطلقا هذا هو الاصح كما فى النهاية وغيره ، فلا تكره اجابت الاذان الذى يؤذن بين يدى الخطيب ، وقد ثبت ذلك عن فعل معاوية فى صحيح البخارى ولا دعاء الوسيلة الماثورة بعد ذلك الاذان هذا عند ابى حنيفة ، وإذا نزل قبل ان يكبر لان الكراهة للاخلال بالاستماع ولا استماع ههنا

اوراسی طرح’’تعليق الممجد‘‘ ۱۳۵؍ میں ہے:

وفى النهاية والبناية وغيرهما اختلف المشائخ على قوله فقال بعضهم : يكره كلام الناس اما التسبيح وغيره فلا يكره ، وقال بعضهم : يكره ذلك كله ، والاول اصح ، انتهى ، وفى الكفاية وغيره نقلا عن العون : المراد بالكلام المتنازع فيه هو

الاجابة الاذان المنبرى فكره عنده لا عندهما ، واما غيره من الكلام فيكره اجماعا انتهى ، قلت : بهذا يظهر ضعف ما فى الدر المختار نقلا من النهر الفائق ينبغى ان لا يجيب بلسانه اتفاقا فى الاذان بين يدى الخطيب وان يجيب اتفاقا فى الاذان الاول يوم الجمعة ، انتهى ، وجه الضعف اما اولا : فلانه لا وجه لعدم الاجابة عندهما ، لانه لا يكره الكلام الدينى عندهما قبل الشروع فى الخطبة بل لا يكره الكلام مطلقا عندهما قبله على ما نقله جماعة بخلاف ما ينقله صاحب العون وغيره ، واما ثانيا : فلانه لا وجه لعدم الاجابة على مذهبه ايضا على ما هو الاصح وهو على المنبر وقال: يا ايها الناس انى سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم على هذا المجلس حين اذن المؤذن يقول مثل ما سمعتم منى مقالتى ، فاذا ثبت الاجابة عن صاحب الشرع وصاحبه فما معنى الكراهة ،

اسی طرح ''مراقی الفلاح'' ۳۳۱ ؍ میں ہے:

وفى البحر عن العناية والنهاية : اختلف المشائخ على قول الامام فى الكلام قبل الخطبة فقيل : انما يكره ما كان من جنس كلام الناس ، اما التسبيح ونحوه فلا ، وقيل : ذلک مکروه ، والاول اصح ، ومن ثمه قال فى البرهان : وخروجه قاطع للكلام أى كلام الناس عند الامام ، الخ ، فعلم بهذا ويشهد له ما اخرجه البخارى ان معاوية اجاب المؤذن بين يديه ، فلما قضى التاذين قال : يا ايها الناس ! انى سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم على هذا المجلس حين اذن المؤذن يقول مثل ما سمعتم من مقالتى،

اسی طرح ''سعایہ'' میں ہے:

وسئلت عن اجابة هذا الاذان هل يكره عند ابى حنيفة بناء على مذهبه انه إذا

صعد الامام كره الكلام مطلقا دينيا كان أو دنيويا الى ان يقضى الصلوة كما صرحوا به ام لا ؟ فاجيب بان الكراهة لمطلق الكلام مرجوحة كما قال فى النهاية : اختلف المشائخ على قول ابى حنيفة ، ففى الكفاية وشرح البرجندى للنقاية عن العون : المراد بالكلام المتنازع هو اجابت الاذان فيكره عنده لا عندهما ، واما غيره من الكلام فيكره اجماعا انتهى، وفى ردالمحتار فى باب الجمعة بعد ذكر كراهة الترقية المتعارفة فى زماننا : ما نصه الظاهر ان مثل هذا يقال فى تلقين المرقى الاذان للمؤذن ، والظاهر ان الكراهة للمؤذن ، لان سنة الاذان الذى بين يدى الخطيب يحصل باذان المرقى فيكون المؤذن مجيبا لاذان المرقى واجابة الاذان حٍ مكروهة انتهى، وفى الدر المختار عن النهر الفائق : ينبغى ان لا يجيب بلسانه اتفاقا فى الاذان بين يدى الخطيب وان يجيب اتفاقا فى اذان الاول يوم الجمعة ، انتهى، وقد كنت مضطربا فى هذه المسئلة من سابق الزمان مستيقنا عدم كراهة الاجابة لذلك الاذان مذعنا ببنأ هذه التصريحات على القول المرجوع للامام النعمان الى ان اطلعت على الحديث الذى رواه البخارى كما ذكرته فانه صريح فى ان معاوية قد اجاب المؤذن على المنبر قبل شروعه فى الخطبة ، وقال : يا ايها الناس ! انى سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم على هذا المجلس يقول مثل ما سمعتم منى مقالتى ، فاذا كان قد ثبت من الشارع ومن يسلك مسلكه هذا الفعل فهل للقول بالكراهة صحة ، فالهمنى الله تعالىٰ بصريح الالهام لا كوهم من الاوهام ان ما ذكره فى النهر بحثا غير صحيح على مذهب الامام ، ولو صحت رواية كراهة مطلق الكلام عنه لقلنا بعدم كراهة الكلام الدينى فالاجابة لوروده فى الحديث فكيف وقد قالوا الاصح عنده عدم كراهة الكلام الدينى فقط ، والعجب انه ادعى الاتفاق على

ذلک ولا وجه لكراهتها على مذهب ابى يوسف ومحمد فتدبر ، الخ ،

اسی طرح ''طحطاوی'' کی جلداول:۱۸۹/مطبوعہ مصر میں ہے:

(قوله فى اذان بين يدى الخطيب) مراعاة لقول الامام بكراهة الكلام مطلقا إذا صعد الخطيب المنبر، لكن سياتى فى الجمعة ان الاصح جواز الاذكار عنده قبل شروعه فى الخطبة فلا مانع من الاجابة ،

اسی طرح ''طحطاوی'' جلداول:۳۴۷/میں ہے:

(قوله ولا كلام) اى من جنس كلام الناس ، اما التسبيح ونحوه فلا يكره وهو الاصح كما فى النهاية والعناية ، ومحل الخلاف قبل الشروع ، اما بعده فالكلام مكروه تحريما باقسامه كما فى البدائع ، قاله فى البحر والنهر،

اسی طرح ''شامی'' کی جلداول مطبوعہ مصر:۶۰۵/میں ہے:

قوله ولا كلام اى من جنس كلام الناس اما التسبيح ونحوه فلا يكره وهو الاصح كما فى النهاية والعناية ، ومحل الخلاف قبل الشروع ، اما بعده فالكلام مكروه تحريما باقسامه ،كما فى البدائع قاله فى البحر والنهر،

اسی طرح ''غایۃ الاوطار'' جلداول:۱۸۵میں ہے:(م) عدم اجابت لسانی کی یہ وجہ ہے کہ جب خطیب منبر پر چڑھے تو امام کے نزدیک مطلقاً کلام مکروہ ہے،لیکن باب الجمعہ میں آوے گا کہ صحیح تر قول یہ ہے کہ امام کے نزدیک اذکار جائز ہیں خطبہ شروع ہونے سے پہلے تو کون مانع ہے اجابت کا؟

اسی طرح ''عینی'' حاشیہ ہدایہ کی جلدثانی:۱۰۱/میں ہے:

واختلفوا على قوله فقال بعضهم : يكره كلام الناس ، واما التسبيح واشباهه فلا يكره ، وقال بعضهم : يكره ذلك ، والاول اصح۔

اور یہ بھی ''عینی'' کی عبارت ہے:

ش: لم يتعرض احد من الشراح لحال هذا الحديث غير ان الا نزارى قال روى خواهر زاده فى مبسوطه عن عبدالله بن عمر عن النبى صلى الله عليه وسلم انه قال: إذا خرج الامام فلا صلوة ولا كلام ، قلت : هذا غريب مرفوعا ، ولهذا قال البيهقى: رفعه وهم فاحش ، انما هو من كلام الزهرى ، رواه مالك فى المؤطا عن الزهرى قال : خروجه يقطع الصلوة وكلامه يقطع الكلام۔

اگر کوئی کہے کہ اذان منبری کا جواب دینا کلام دینی ہے مگر اس میں امتداد کلام کا احتمال ہے تو جس طرح امتداد صلوۃ کے خوف سے صلوۃ مکروہ ہے اسی طرح جواب دینا بھی مکروہ ہونا چاہیئے، تو اس کا جواب علامہ عینی نے اپنی شرح ہدایہ جلد ثانی کے ۱۰۱۰ر میں تحریر فرمایا ہے:

(م) بخلاف الصلوة فانها قد تمتد، (ش) أى قد تطول فيفضى الى الاخلال ولا يمكن قطعها بخلاف الكلام ، لانه يمكن قطعه متى شاء۔

اس میں ان لوگوں کا رد ہے جو کہ بخوف امتداد کلام جواب نہ دینے کو احتیاط بتلاتے ہیں، اوراسی طرح کلام دینی کا حکم ''کفایہ حاشیہ ہدایہ'' کے :۳۷ر میں ہے:

قوله : وإذا خرج الامام يوم الجمعة ترك الناس الصلوة والكلام ، والمراد من الصلوة صلوة التطوع ، واما الفائتة فيجوز وقت الخطبة من غير الكراهة ، ثم اختلف المشائخ على قول ابى حنيفة قال بعضهم : انما يكره كلام الذى هو من ~~كلام الناس ، اما التسبيح واشباهه فلا ، وقال بعضهم : كل ذلك يكره والاول~~ اصح كذا فى المبسوط شيخ الاسلام ، وقال فى العيون : المراد من الكلام اجابة المؤذن أما غيره من الكلام فيكره اجماعا،

اسی طرح ''عنایہ'' کے ۳۷ میں ہے:

قوله وإذا خرج الامام يوم الجمعة يعنى لاجل الخطبة ترک الناس الصلوة والكلام حتى يفرغ من خطبته ، يريد به ما سوى التسبيح ونحوه على الاصح ،

اسی طرح ''شرح الیاس'' کے صفحہ:٦٦ ر میں ہے:

إذا خرج الامام من الحجرة حرم الصلوة والكلام حتى يتم الخطبة ، المراد من الصلوة التطوع ، اما الفائتة فيجوز وقت الخطبة من غير كراهية ، واختلف المشائخ على قول ابى حنيفة ، فقال بعضهم : يكره كلام الناس دون التسبيح ، وقيل : يكره الكل ، والاول اصح،

اسی طرح ''بحرالرائق'' کی جلد ثانی:١٦٨ ر میں ہے:

وفى النهاية : اختلف المشائخ على قول ابى حنيفة ، قال بعضهم : انما كان يكره من كلام الناس، واما التسبيح ونحوه فلا ، وقال بعضهم : كل ذلک مكروه والاول اصح،

اسی طرح ''جامع الرموز'' کی جلد اول: ١١٨ ر میں ہے۔ پس بنا بر روایات منقولہ و نیز حدیث صحیح معاویہ کے جو اوپر ''بخاری شریف'' سے منقول ہے اور بنا بر حدیث صحیح ''إذا سمعتم النداء فقولوا مثل ما يقول المؤذن رواه الجماعة الا ابن ماجة '' کے اجابت یعنی اذان منبری کا جواب دینا ثابت ہے، پس جو بعض الناس حدیث معاویہ کو ضعیف اور مضطرب کہتے ہیں ان کا قول باطل اور غلط ہے، بلکہ مردود ہے اس اجابت کی نفی میں جو حدیث ابن عمر کی ''إذا خرج الامام فلا صلوة ولا كلام ''منقول فی الھدایہ ہے، اس کو تخریج ہدایہ ''نصب الرایہ'' میں ''فلم اجده '' لکھا ہے، اور ''بیہقی'' سے نقل کیا ہے کہ جس

نے اس کو مرفوع کہا وہم کیا ہے اور وہ باطل ہے، چنانچہ اوپر بھی اسی کی تصریح ''عینی شرح ہدایہ'' سے گذر چکی ہے۔

اور ''عینی شرح بخاری'' کی جلد ثالث :۳۱۱/ میں ہے:

وقالت الحنفية : يحرم الكلام من ابتداء خروج الامام وورد فيه حديث ضعيف

اور:۲۹۳/ میں ہے: وفيه اباحة الكلام قبل الشروع فى الخطبة ،

اور ''فتح الباری'' کی جلد ثانی:۳۳۹/ میں ہے:

والجواب عن حديث ابن عمر بانه ضعيف ، فيه ايوب بن نهيک وهو منكر الحديث ، قاله ابوزرعة وابوحاتم والاحاديث الصحيحة لا تعارض بمثله۔

پس جس طرح قوله تعالى ﴿وإذا قرأ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلكم ترحمون﴾ وارد ہونے پر بھی قبل شروع کرنے امام کے اقامت کا جواب دیا جاتا ہے، اسی طرح قبل شروع خطبہ کے اذان منبری کی اجابت بدلائل صحیحہ لاریب فیہ کے مصداق ثابت ہے، واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ: عبد من عباد اللہ خادم الطلبہ

القاضی رحمت اللہ

تصدیقات مع مواہیر دستخط حضرات علماء کرام اجمیر شریف

الجواب صحیح

فقیر معین الدین کان اللہ لہ

خادم دار العلوم معینیہ عثمانیہ اجمیر

الجواب صحیح

حامد حسن مدرس

دار العلوم اجمیر شریف

الجواب حق

عبد الحئ عفی عنہ

لابأس باجابت الاذان المذكور

فقیر عبد الکریم غفر لہ الرحیم

الجواب صحيح ، فان ذكر الله المنان باجابت الاذان خير من الرؤية الى وجه الامام المستمع للاذان ومجيبه كيف، وعبارة الكتب الفقه وحديث البخارى قد دلت على اجازة الاجابة كما نقلها المجيب اللبيب هذا، وانا العبد المسكين :

محمد نور الدين الاجميرى عفا عنه البارى

بے شک عبارات منقولہ سے اذان خطبہ کی اجابت جائز ثابت ہوتی ہے، واللہ اعلم وعلمہ اتم

کتبہ: احقر امتیاز احمد انصاری

مدرس مدرسہ معینیہ عثمانیہ درگاہ معلیٰ اجمیر شریف

کراہت اجابت کی کوئی معتد بہ وجہ معلوم نہیں ہوتی، بلکہ حدیث بخاری سے جواز ثابت ہو چکا ہے، علاوہ ازیں جبکہ اجابت اقامت بلا کراہت جائز ہے، تو پھر اذان خطبہ کی اجابت میں کونسی قباحت ہے، حالانکہ جس طرح اجابت اقامت قبل شروع قرأت امام ہوتی ہے علی ھذا اجابت مذکورہ بھی قبل شروع خطبہ ہوتی ہے، پھر ترجیح بلا مرجح چہ معنی دارد، اگرچہ قبلہ استاذی مدظلہ العالی کے استدلالات قویہ سے جواز اجابت ظاہر وباہر ہے، محتاج بیان نہیں، وللہ در المستدل ،تاہم ناچیز بھی کتاب ''منتقی'' کی:۹۸؍ سے حدیث سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی نقل کرتا ہے:

وعن سلمان الفارسی قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : لا يغتسل رجل يوم الجمعة ' ويتطهر بما استطاع من طهر ' ويدهن دهنه ' ويمس من طيب بيته' ثم يروح الى المسجد ' ولا يفرق بين اثنين ' ثم يصلى ما كتب الله له ' ثم ينصت للامام إذا تكلم إلا غفر الله له ما بين الجمعة الى الجمعة الاخرىٰ، رواه احمد والبخارى ، وفيه دليل على جواز الكلام قبل تكلم الامام۔

حدیث مرقومہ بالا میں (تکلم) سے مراد خطبہ ہے، یعنی خطبہ پڑھنے کے وقت چپ رہے، اسی طرح ''اشعۃ اللمعات شرح مشکوۃ'' میں ہے، بہرکیف جبکہ عدم اجابت کی کوئی معتد بہ وجہ پائی نہیں جاتی فلہٰذا اذان مذکور کے وقت حصولِ ثواب سے محروم نہ رہنا چاہئے، اور کسی کے اغوا میں آکر پہلو تہی کو ہرگز راہ نہ دینا چاہئے'' درکارِ خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست'' واللہ اعلم وعلمہ اتم۔ کتبہ:

احقر امیر احمد غفر اللہ الصمد باسنوی

مدرس مدرسہ اشرفیہ راندیر، گجرات

تصدیقات حضراتِ علماء کرام ٹونک

از: عدالت شرع شریف صدر ریاست اسلام ٹونک

الجواب واللہ موفق للسداد والصواب :......سوال وجواب معائنہ کئے گئے، واقعی قاضی محمد رحمت اللہ صاحب نے جو جواب بعدم کراہۃ الاجابت بنا بر قول اصح لکھا ہے صحیح ہے۔

برکات احمد عفی عنہ محمد حسین عفی عنہ عبد الرحیم عفی عنہ

انوار الحسن عفی عنہ عبد الحفیظ عفا اللہ عنہ سید احمد مجتبی

خادمِ شرع خلیل الرحمٰن عفی عنہ

تصدیقات حضراتِ علماء کرام رامپور

علماء حنفیہ کے نزدیک اذان منبریہ کا جواب قولی مشروع ومندوب ہے: إذا خرج الامام فلا صلوۃ ولا کلام ''اس کے منافی نہیں ہے، کیونکہ مراد کلام سے دنیوی ہے نہ دینی، واللہ تعالیٰ اعلم۔ محمد معز الدین عفی عنہ

مدرس سوم، مدرسیہ عالیہ ریاست، رامپور

تحقیق مجیب مصیب صحیح ہے
محمد منور علی غفرلہ

جواب حسب تحقیق بالا صحیح ہے، واللہ اعلم
احمد امین عفی عنہ

الجواب بھذا التفصیل والتحقیق ھو الجواب
محمد فضل حق اصلح اللہ حالہ

صح الجواب
نظیر الدین عفی عنہ

تصدیقات حضرات علماء کرام لکھنؤ علی گڑھ

واقعی اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جس وقت سے امام منبر پر جائے کلام وصلوۃ دونوں ممنوع ہیں، اوراس قول کے موافق حدیثیں موجود ہیں، جس کی تفصیل میرے نانا جناب مولانا مولوی عبدالحی صاحب رحمہ اللہ کے ہدایہ کے حاشیہ میں موجود ہے، لیکن صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک نماز تو ممنوع ہے، جبکہ امام منبر پر چڑھے، لیکن کلام دینی مثل اجابت اذان ثانی ممنوع نہیں ہے، جیسا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے، اورحق قول ثانی ہے، وتحقیق ذلک فی السعایۃ ۔حررہ الفقیر :

محمد ایوب غفرلہ الذنوب لکھنوی

جواب صحیح ہے، کیونکہ حدیث نبوی اجابت اذان میں علی العموم وارد ہے، مع ھذا جس اذان کا سائل نے ذکر کیا ہے وہ اذان زمانہ رسول اللہ ﷺ میں کہی جاتی تھی اور مثل اذان پنج گانہ نماز کے اذان جمعہ بھی ایک اذان ہے، لہذا حکم نبوی اجابت اذان میں بلا ریب داخل ہے، واللہ اعلم۔

محمد منیر خان عفی عنہ
مدرس مدرسیہ عربیہ برنپورہ بنارس شہر

الجواب صحيح والمجيب نجيح من قال سوی ذلک فقد قال محالا ، حررہ :
راجی الی رحمة الله ربه القوی۔عبدالتواب غزنوی ثم العلی گڈھی

الجواب صحیح — الجواب حق

محمد عبدالصمد عفی عنہ،علیگڈھ — محمد عبدالمتین عفی عنہ

تصدیقات حضرات علماء کرام کانپور

جمعہ کی اذان ثانی کا جواب دینا مستحسن ہے،حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے روز منبر پر بیٹھ کر اذان ثانی کا جواب دیا ہے،اور پھر فرمایا کہ: جناب نبی کریم ﷺ کو بھی ایسے ہی جواب دیتے میں نے سنا ہے۔اس حدیث کوامام بخاری رحمہ اللہ نے جلداول: ۱۲۹ر میں روایت فرمایا ہے۔نیز جلداول:۸۶ر میں بھی یہ روایت ہے۔

امام نسائی رحمہ اللہ نے بھی یحی ابن کثیر اور عبداللہ بن المبارک رحمہما اللہ سے روایت فرمایا ہے:

کتاب ''نہایہ'' میں ہے: واما الكلام فانما يكره منه قبل شروع الخطبة الدنيوية لا الدينى كالاذكار والتسبيح وبعد الشروع فيها يكره مطلقا هذا هو الاصح،

اور ''عمدۃ الرعایۃ'' میں ہے:

فلا تكره اجابة الاذان الذى يؤذن بين يدى الخطيب وقد ثبت ذلک من فعل معاوية فى صحيح البخارى ولا دعاء الوسيلة المذكورة بعد ذلک الاذان ، هذا عند ابى حنيفة وعندهما فلا باس بالكلام اى الدنيوى إذا خرج الامام قبل ان يشرع فى الخطبة وإذا نزل قبل ان يكبر ، لان الكراهة للاخلال بالاستماع ولا استماع ههنا بخلاف الصلوة ، فانها قد تمتد كذا فى النهاية وجامع الرموز ، والله اعلم

بالصواب واليه المرجع ومآب،

کتبہ: محمد عبدالرزاق عفی عنہ

المدرس مدرسہ امدادالعلوم فی الکانفور، مدرسہ جامع العلوم واقع جامع مسجد کانپور۔

الجواب صحیح	صح الجواب
غلام یحیٰ	نورالحسن عفی عنہ

تصدیقات حضرات علماء کرام دہلی

حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک وقت خروج امام سے انصات یعنی خاموشی ضروری ہے، اوردلیل ان کی "إذا خرج الامام" الخ ہے، یہ حدیث مرفوعاً وموقوفاً مروی ہے، اگرچہ اس کی اسناد میں کلام ہے، لیکن "بخاری" کی روایت:

"ثم راح فلم يفرق بين اثنين فصلى ما كتب له ، ثم إذا خرج الامام انصت غفرله مابينه وبين الجمعة الاخرىٰ" (بخاری)

اس کی مؤید ہے کہ اس میں بھی وقت خروج امام سے انصات کا ارشاد موجود ہے، تاہم متاخرین حنفیہ نے بوجہ حدیث معاویہ اجابت اذان منبری کی اجازت دی ہے، لیکن نماز شروع کرنے کی بالاتفاق بین الائمہ اجازت نہیں ہے، اور خاکسار کے خیال میں اجابت اذان منبری کے علاوہ دیگر اذکار سے انصات اولیٰ واقدم ہے، واللہ اعلم۔

محمد کفایت اللہ غفرلہ، مدرس مدرسہ امینیہ دہلی

روایات فقہ اور عمل حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ جواب اذان جو بوقت خطبہ دی جاتی ہے بلاکراہت جائز ہے اور یہی مختار ہے۔

محمد عبداللطیف سیفی عنہ عنہ
مفتی مدرسہ فتحپوری دہلی

المجیب مصیب | الجواب صحیح
محمد عبدالقادر عفی عنہ، مدرس مدرسہ فتحپوری دہلی | بندہ محمد اسماعیل، مدرس مدرسہ فتحپوری دہلی
الجواب صحیح | الجواب صحیح
سلطان محمود گجراتی، مدرس مدرسہ فتحپوری دہلی | نیاز احمد، مدرس مدرسہ فتحپوری دہلی

ومن الواجب الانصات مطلقا عند الخطبة ولا يجب قبله ويستحسن جواب الاذان المنبرى لمن حضر قولا ومن لم يحضر فعليه المشى الى الصلوة ، وجواب الاذان المنبرى واجب بعموم الحديث القولى وفعل معاوية وحديث عائشة مضمونه لا يمنعه عن الذكر الا بول أو غائط أو جنابته ، فانه ذكر ايضا ليس بكلام الدنيا انما الممنوع هو الكلام الدنيوى ، وحديث" لا صلوة ولا كلام " يحتمله فاذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال ، بل هو مرجح لمضمون الحديث انما المساجد بنيت لذكر الله، فقط والله اعلم بالصواب۔ حررہ: بندہ محمد مطیع اللہ عفی عنہ القریشی

صدر مدرس مدرسہ اشرفیہ راندیر ضلع سورت

۶ رمحرم الحرام ۱۳۳۹ھ

حاصل کلام وخیر المرام یہ ہے کہ اذان منبری کا جواب مکروہ نہیں ہے، بلکہ مکروہ کہنے والے کا قول مکروہ ہے،اور قوله" إذا خرج الامام "الخ کا حدیث ہونا ثابت نہیں جیسا کہ علامہ زیلعی رحمہ اللہ نے تخریجِ ہدایہ میں اس کے متعلق "لم اجده "تحریر فرمایا اور فرمایا کہ: یہ زہری رحمہ اللہ کا قول ہے، اور زہری نہ صحابی ہیں نہ کبار تابعی۔ علاوہ ازیں ہم ان کے مقلد نہیں، بلکہ حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کے مقلد ہیں، اور بنا بر قول اصح امام صاحب کے نزدیک بعد خروج امام کلام دینی مثل تسبیح اوراذکار کے قبل شروع خطبہ مکروہ نہیں ہے، اوراسی اصح قول کے موافق امام اعظم اور صاحبین رحمہم اللہ متفق ہیں، خروج امام کے بعد اور قبل

شروع خطبہ کلام دینی اور تسبیح واذکار کا جواز اور مستحسن ہونا بالاتفاق ثابت ہے، چنانچہ کتب حنفیہ مذکورہ فی الفتاویٰ سے ظاہر وباہر ہے، اور بعض لوگ تین صحابہ یعنی (حضرت علی اور حضرت ابن عباس اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم) سے ممانعت ثابت کرتے ہیں، یہ ان کی غلط فہمی ہے، کیونکہ مراد وہاں ممانعت کلام دنیوی کی ہے نہ کلام دینی کی۔ اوراس سے ان جہلاء کا رد ہوگیا کہ جو عوام کو دھوکہ دینے کا پیشہ اختیار کرکے یہ کہتے ہیں کہ رسالہ عنبری میں جتنے اقوال اور روایات فقہیہ درج ہیں اور جن جن کتابوں کا حوالہ دیا ہے وہ سب بے اصل ہیں، فلاں مولوی صاحب اس طرح فرماتے ہیں یہ تہمت اب عمدہ طور پر متہم کے منہ پر ماری جاوے گی، کیونکہ جہلاء کی تہمت اتنے علماء ابرار مصححین کے مقابل میں کیا وقعت رکھتی ہے، چنانچہ دیوبند کے مدرس اعلی اہل اللہ سراپا نور حضرت مولانا مولوی انور شاہ صاحب اجابت اذان منبری کو ترجیح دے کر عدم کراہت کے قائل ہو چکے ہیں، اس کے گواہ جناب مولوی محمد حسین صاحب اور جناب حافظ سلیمان صاحب نائب قاضی موجود ہیں، جس کو شک ہو وہ ان دونوں صاحبوں سے تحقیق کرلے۔

دیگر اجمیر شریف اور ٹونک اور لکھنو اور علی گڈھ اور کانپور اور دہلی کے علماءِ کرام کی تصدیقات اس رسالہ میں موجود ہیں، اب دیکھتے ہیں کہ دروغ بے فروغ باتیں بنانے والے کیا تراشتے ہیں، ’’فبای حدیث بعدہ یؤمنون‘‘ ہاں اپنی عاقبت بگاڑنے والا شخص کوتاہ فہمی سے یہ احتمال پیش کرسکتا ہے کہ خدا جانے علماءِ مذکور نے واقعی دستخط کئے ہیں یا قاضی نے اپنی جانب سے علماء کے نام درج کرلئے ہیں، تو اس کے اندفاع کے لئے بطور رفع تشکیک بالا حضرات علماء کرام سے بذریعہ تحریر دریافت کرلیا جائے۔

دہلی کے علماء نامدار میں سے جناب مولوی کفایت اللہ صاحب مدرس اعلی مدرسہ امینیہ

میرے فتویٰ کے تحت میں امام صاحب کا قول تحریر فرمانے کے بعد بایں طور تحریر فرماتے ہیں ''تاہم متاخرین حنفیہ نے بوجہ حدیث معاویہ اجابت اذان منبری کی اجازت دی ہے'' الخ،

بحمد اللہ مولانا نے تائید کرتے ہوئے بایں طور تصریح فرمائی کہ بوجہ حدیث معاویہ کے متاخرین حنفیہ نے اجابت اذان منبری کی اجازت دی ہے، پس اس میں ان لوگوں کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ قاضی رحمت اللہ اس مسئلہ کو ترویج دے کر دوسروں کو غیر مقلدوں کے ساتھ ملانا چاہتا ہے اور یہ مسئلہ غیر مقلدوں کا ہے، یہ لکھنا سراسر غلط اور تہمت ہے، لعنة الله على المتهمين۔

اور مولانا کی عبارت سے یہ بھی واضح ہوا کہ اجابت اذان سے مولانا موصوف انصات کو اولی نہیں فرماتے جیسے کہ دیگر اذکار سے انصات ان کے نزدیک اولیٰ ہے، اور جب تمام علماء کرام نے اجابت اذان منبری کی تصدیق کی، اور تمام کتب حنفیہ متداولہ معتبرہ سے صراحۃً اظہر من الشّمس ثابت کیا گیا کہ اجابت اذان منبری غیر مکروہ بلکہ مستحسن ہے، اور جو لوگ مکروہ کہتے ہیں ان کا قول مردود اور ضعیف ہے، اور مکروہ کہنے والوں کی دلیل '' إذا خرج الامام '' الخ ، ہے اور اس کا غیر حدیث ہونا، بلکہ قول زہری صغار من التابعین کا ہونا مکرر گذر چکا ہے، لہذا یہ حدیث حجت نہیں ہوسکتی۔

اسی طرح قائلین کراہت کی دلیل ''درمختار'' کی عبارت '' وينبغي '' الخ، ہے، اور صاحب درمختار اس عبارت کو ''نہر الفائق'' سے نقل کرتے ہیں، اور ان دونوں کتابوں سے فتویٰ دینا ''شامی'' وغیرہ کتب فقہ میں ممنوع لکھا ہے، چنانچہ اس کی تصریح ''شامی'' کی جلد اول: ۵۲ر میں موجود ہے، پس بنا بریں منکرین اجابت کی طرف سے سوائے تعصب اور ہٹ دھرمی کے کوئی بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتی۔ اجابت اذان منبری حق ہے والحق

يعلوا ولا يعلى، فما ذا بعد الحق إلا الضلال۔

بعض بے علم جاہل مطلق اثناء تقریر میں بطور فوقیت بیان کرتے ہیں کہ قاضی رحمت اللہ عصر کی نماز ایک سایہ کے بعد پڑھوا کر لوگوں کو غیر مقلد بنانا چاہتا ہے یہ بھی تہمت ہے، ''بل هو بهتان عظيم'' اتنا بھی خیال نہ کیا کہ جب ایک سایہ پر عصر کی نماز پڑھنا غیر مقلدوں کا کام ہے، اور امام صاحب رحمہ اللہ سے بھی ایک سایہ پر عصر کا وقت ہونے کی ایک روایت موجود ہے تو اس بنا پر امام صاحب رحمہ اللہ بھی غیر مقلد ہوئے، اسی طرح صاحبین اور حسن بن زیاد اور امام زفر رحمہم اللہ وغیرہم اور جمہور علماء کے نزدیک عصر کا وقت ایک سایہ کے بعد ہے، تو یہ سب حضرات بھی غیر مقلد ہوئے، الغرض اس تہمت سے یہ حضرات بھی نہ بچے، شیخ الہند شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کو ترجیح دیتے ہوئے اس پر فتویٰ دیا ہے، چنانچہ ان کی شرح مؤطا میں موجود ہے بناءً علیہ حضرت موصوف بھی غیر مقلد ٹھہرے، نعوذ بالله من هذا الاعتقاد المضل۔

کتب فقہ حنفیہ میں صراحۃً موجود ہے کہ اگر کوئی عالم امام محمد یا امام ابو یوسف یا حسن بن زیاد یا امام زفر رحمہم اللہ کے قول پر عمل کرے یا فتویٰ دے تو وہ مذہب حنفی سے خارج نہیں ہوتا ہے، بلکہ وہ حنفی المذہب ہے، چنانچہ اس کی تصریح ''شامی'' اور ''فتاویٰ تنقیح حامدیہ'' میں موجود ہے، اور اوپر اس کی تصریح اس کے موقع پر دو تین مرتبہ گذر چکی ہے، هذا ما ظهر لی ، والله اعلم وعلمه اتم ، وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين۔

تنبیہ:......مولوی مہدی حسن صاحب کے رسالے بتاریخ: ۳۰/ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ مطابق تاریخ ۱۴/۱۹/۲۰/عیسوی کو پوسٹ کی معرفت مجھے پہنچے اور ان کا جواب عنقریب لکھوں گا، انشاء الله المستعان۔

استفتاء

بسم الله الرحمن الرحيم

ما قولكم دام فضلكم ايها العلماء العظام والفقهاء الكرام زادكم الله تعالى شرفا وتعظيما لديه ! اندریں صورت کہ جمعہ کے روز اذانِ منبری کا جواب دینا بحکم ''إذا سمعتم النداء فقولوا مثل ما يقول المؤذن إلا حي على الصلوة وحي على الفلاح '' کے یا نہ جواب دینا بحکم ''إذا خرج الامام فلا صلاة ولا كلام '' کے، بینوا توجروا۔

وبه نستعين' الجواب البسيط بغير افراط وتفريط :...... صورتِ مسئولہ میں معلوم ہو کہ حدیث'' إذا سمعتم النداء فقولوا مثل يقول المؤذن '' الخ، کو تمام جماعت محدثین نے سوائے ''ابن ماجہ'' کے نقل کی ہے، اور یہ حدیث بلا ریب صحیح اور مرفوع ہے، لہذا اس پر عمل کرنا امر ضروری ہے، اور حدیث ''إذا خرج الامام فلا صلاة ولا كلام '' نہ حدیث مرفوع ہے صحیح ہے، جیسا کہ علامہ لکھنوی اور علامہ زیلعی اور حافظ ابن حجر رحمہم اللہ نے ''فتح الباری'' میں تصریح کردی ہے، علامہ لکھنوی اور علامہ زیلعی کی یہ عبارت ہے:

حديث:'' إذا خرج الامام فلا صلوة ولا كلام '' لم اجده ، وقد قال البيهقى : رفعه وهم ، وانما هو من كلام الزهرى۔

یعنی یہ حدیث کہ ''جب امام نکلے تو نہ نماز ہے نہ کلام'' میں نے اسے نہیں پایا، اور بیہقی نے فرمایا کہ: اس کو مرفوع بیان کرنا وہم ہے، بلکہ یہ کلام زہری رحمہ اللہ کا ہے۔

اسی طرح علامہ عینی رحمہ اللہ نے شرح ہدایہ میں جلد ثانی کے: ۱۰۱۰ر میں تصریح تام فرمائی ہے:

م...... ولابى حنيفة قوله عليه السلام : إذا خرج الامام فلا صلوة ولا كلام ،

ش...... لم یتعرض احد من الشراح لحال هذا الحدیث غیر ان الا ترازی ، قال: روی خواهز زاده فی مبسوطه عن عبدالله بن عمر : عن النبی صلی الله علیه وسلم انه قال : إذا خرج الامام فلا صلاة ولا کلام ، قلت : هذا غریب مرفوعا ، ولهذا قال البیهقی : رفعه وهم فاحش ، انما هو من کلام الزهری ، رواه مالک فی المؤطا عن الزهری قال : خروجه یقطع الصلاۃ وکلامه یقطع الکلام۔

اسی طرح حافظ رحمہ اللہ نے ’’فتح الباری‘‘ جلد ثانی کے صفحہ:۳۳۹ر میں تصریح فرمائی ہے اور وہ عبارت یہ ہے:

والجواب عن حدیث ابن عمر بانه ضعیف ، فیه ایوب بن نهیک ، وهو منکر الحدیث ، قاله ابوزرعة وابوحاتم : والاحادیث الصحیحة لا تعارض بمثله۔

یعنی حدیث ابن عمر کی جو کہ اوپر گذری ہے عینی وغیرہ سے وہ ضعیف ہے، کیونکہ اس حدیث میں راوی ایوب بن نہیک ہے، اور یہ منکر الحدیث ہے، کہا ہے اس کو ابوزرعہ اور ابوحاتم نے، اور ایسی حدیث معارض احادیث صحیحہ کے نہیں ہوسکتی ہے، علاوہ اس کے طحطاوی نے ’’مراقی الفلاح‘‘ میں :۳۳۱ر جلد اول سے تصریح بحدیث معاویہ کے کی ہے، اور وہ عبارت یہ ہے:

فعلم بهذا انه لا خلاف بینهم فی جواز غیر الدنیوی علی الاصح ، ویحمل الکلام والوارد فی الاثر علی الدنیوی ویشهد له ما اخرجه البخاری ان معاویة اجاب المؤذن بین یدیه ، فلما قضی التاذین قال یا ایها الناس ! انی سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم علی هذا المجلس حین اذن المؤذن یقول ما سمعت من مقالتی‘ اھ،

اسی طرح علامہ لکھنوی رحمہ اللہ نے ’’تعلیق الممجد‘‘ میں تصریح کی ہے بعد ذکر کرنے قول زہری مذکور کے:

بهذا يأخذ ابويوسف ومحمد ومالک والجمهور، وقال ابوحنيفة : يجب الانصات بخروج الامام كذا فى المرقاة ، وفى النهاية والبناية وغيرهما : اختلف المشائخ على قوله ، فقال بعضهم : يكره كلام الناس ، اما التسبيح وغيره فلا يكره، وقال بعضهم : يكره ذلک كله والاول اصح ، انتهى، قلت : بهذا يظهر ضعف ما فى الدر المختار نقلاعن الفائق : ينبغى ان لا يجيب بلسانه اتفاقا فى الاذان بين يدى الخطيب وان يجيب اتفاقا فى الاذان الاول يوم الجمعة ، انتهى، وجه الضعف اما اولا: فلانه لا وجه لعدم الاجابة عندهما ، لانه لا يكره عندهما الكلام الدينى قبل الشروع فى الخطبة ، بل لا يكره الكلام مطلقا عندهما قبله على ما نقله جماعة ، بخلاف ما ينقله صاحب العون وغيره ، واما ثانيا : فلانه لا وجه لعدم الاجابة على مذهبه ايضا على ما هو الاصح انه لا يكره الكلام مطلقا بل الكلام الدنيوى ، وقد ثبت فى صحيح البخارى : ان معاوية رضى الله تعالىٰ عنه اجاب الاذان وهو على المنبر وقال : يا ايها الناس ! انى سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم على هذا المجلس حين اذن المؤذن يقول مثل ما سمعتم منى مقالتى ، وإذا ثبت الاجابة عن صاحب الشرع وصاحبه فما معنى الكراهة ،

اورعینی شرح ہدایہ کے:۱۰۱۰/میں ہے:

واختلفوا على قوله فقال بعضهم : يكره كلام الناس ، اما التسبيح واشباهه فلا يكره ، وقال بعضهم : يكره كل ذلک والاول اصح،

اسی طرح ’’کفایہ شرح ہدایہ‘‘ کے صفحہ:۳۷/میں ہے:

ثم اختلف المشائخ على قول ابى حنيفة ، قال بعضهم : انما يكره الكلام الذى هو من كلام الناس اما التسبيح واشباهه فلا ، وقال بعضهم : كل ذلک يكره

والاول اصح،

اسی طرح ''عنایہ شرح ہدایہ'' کے صفحہ: ۳۷/

قوله : وإذا خرج الامام يوم الجمعة يعنى لاجل الخطبة (ترک الناس الصلاة والكلام حتى يفرغ من خطبته) يريد به ما سوى التسبيح ونحوه على الاصح ،

اسی طرح ''شرح الیاس'' کے صفحہ: ۶۶/ میں ہے:

إذا خرج الامام من الحجرة حرم الصلاة ولاكلام حتى يتم الخطبة ، المراد من الصلوة التطوع ، اما الفائتة فيجوز وقت الخطبة من غير كراهة ، الخ ، واختلف المشائخ على قول ابى حنيفة ، فقال بعضهم : يكره كلام الناس دون التسبيح ونحوه، وقيل : يكره الكل والاول اصح،

اسی طرح ''بحرالرائق'' کی جلد ثانی صفحہ: ۱۶۸/ میں ہے:

وفى النهاية : اختلف المشائخ على قول ابى حنيفة ، قال بعضهم : انما كان يكره من كلام الناس ، اما التسبيح ونحوه فلا ، وقال بعضهم : كل ذلک مكروه والاول اصح،

اسی طرح ''جامع الرموز'' ۱۱۸/ جلد اول میں ہے: قوله والكلام أى كلام الدنيا مباحا والأخرة كالقرآن والتسبيح والصلاة على النبى صلى الله عليه وسلم،

اگر کوئی کہے کہ کلام مشابہ نماز کے ممتد ہونے میں ہے تو جس طرح نماز مکروہ ہے خروج امام کے بعد بخوف ممتد ہونے کے، اسی طرح کلام بھی بعد خروج امام کے بخوف ممتد ہونے کے مکروہ ہے؟

جواب اس کا یہ ہے کہ نماز شروع کرنے کے بعد قبل تمام کرنے کے ساقط اور قطع نہیں کرسکتے، بخلاف کلام کے کہ جب چاہیں تب قطع کرسکتے ہیں، چنانچہ ''عینی شرح ہدایہ'' میں

۱۰۱/کے اخیر میں ہے:

م...... بخلاف الصلاة ، لانها قد تمتد ،

ش...... ای قد تطول فيفضى الى الاخلال ولا يمكن قطعها بخلاف الكلام ، لانه يمكن قطعه متى شاء،

دیگر واضح ہو کہ صاحب درمختار نے گو کہ جواب دینے اذان منبری کا مکروہ لکھا ہے، باوجود اس کے محشی اس کے ''طحطاوی'' اور'' شامی'' اور''غایۃ الاوطار'' کے مصنف سب مخالف ہیں، چنانچہ ''طحطاوی'' مطبوعہ مصر کی جلد اول صفحہ:۱۸۹/میں ہے:

(قوله فى الاذان بين يدى الخطيب) مراعاة لقول الامام بكراهة الكلام مطلقا إذا صعد الخطيب المنبر ، لكن سيأتى فى الجمعة ان الاصح جواز الاذكار عنده قبل شروعه فى الخطبة فلا مانع من الاجابة،

اسی طرح ''طحطاوی'' کے صفحہ:۳۴۷/میں ہے:

قوله ولا كلام اى من جنس كلام الناس ، اما التسبيح ونحوه فلا يكره ، وهو الاصح كما فى النهاية والعناية ، ومحل الخلاف قبل الشروع ، اما بعده فالكلام مكروه تحريما باقسامه ، كما فى البدائع قاله فى البحر والنهر،

اسی طرح '' شامی'' مطبوعہ مصر جلد اول کے صفحہ:۶۰۵/میں ہے:

قوله : ولا كلام أى من جنس كلام الناس، اما التسبيح ونحوه فلا يكره ، وهو الاصح كما فى النهاية والعناية،

اسی طرح ''غایۃ الاوطار ترجمہ درمختار'' جلد اول کے صفحہ:۱۸۵/میں ہے:

(م)......عدم اجابت لسانی کی یہ وجہ ہے کہ جب خطیب منبر پر چڑھے تو امام کے نزدیک مطلقا کلام مکروہ ہے، لیکن باب الجمعہ میں آوے گا کہ صحیح تر قول یہ ہے کہ امام کے نزدیک

اذکار جائز ہیں، خطبہ شروع ہونے سے پہلے تو اب کون مانع ہے اجابت کا۔

اور ''عینی شرح بخاری'' جلد ثالث کے صفحہ:۲۹۳ر میں ہے' حدیث بخاری کی روایت کر کے فرماتے ہیں:'' وفيه اباحة الكلام قبل الشروع في الخطبة ''

اوراسی طرح ''عینی شرح بخاری'' کے صفحہ:۳۱۱ر میں ہے:

وقالت الحنفية : يحرم الكلام من ابتداء خروج الامام ، وورد فيه حديث ضعيف۔

دیکھو علامہ عینی رحمہ اللہ حنفی مذہب کے ہوتے ہوئے خود بھی فرماتے ہیں کہ: امام صاحب کی دلیل حدیث ضعیف ہے، اور اوپر کی عبارتوں سے ان کی حدیث کا ضعف ثابت ہو چکا ہے، اور ''فتح الباری'' جلد ثانی کے:۳۴۲ر میں مذکور ہے:

(قوله باب الانصات يوم الجمعة والامام يخطب) اشار بهذا الرد على من جعل وجوب الانصات من خروج الامام ، لان قوله في الحديث : والامام يخطب جملة حالية ،

پس ان عبارتوں سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اجابت اذان منبری کو مکروہ کہنے والے غلطی پر ہیں، دھوکا آپ بھی کھاتے ہیں اور غیروں کو بھی دھوکا دے کر غلطی پر آمادہ کرتے ہیں، اور کوئی حدیث صحیح مرفوع غیر مأوّل اجابت اذان منبری کے مکروہ ہونے پر یا قبل خطبہ شروع ہونے کے کلام دینی کرنے کی کراہیت پر ثابت نہیں ہے، تو اب احادیث صحیحہ مرفوعہ صاحبین کی قبول کردہ بیان کرتا ہوں:

عن ابی هريرة رضی الله عنه ان النبی صلی الله عليه وسلم قال : إذا قلت لصاحبک يوم الجمعة انصت والامام يخطب فقد لغوت ، رواه الجماعة إلا ابن ماجة ،

یعنی جب تو امام کے خطبہ پڑھنے کی حالت میں اپنے ساتھی سے کہے کہ: خاموش رہ تو

تو نے لغو کام کیا۔اس حدیث کو جماعت نے روایت کیا ہے سوائے ''ابن ماجہ'' کے۔

وعن علی رضی الله عنه فی حدیث له قال : من دنا من الامام فلغا ، ولم یسمع ولم ینصت کان علیه کفل من الوزر، ومن قال صه فقد لغا ' ومن لغا فلا جمعة له ' ثم قال : هکذا سمعت نبیکم صلی الله علیه وسلم، رواه احمد وابوداؤد،

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: جو شخص امام سے قریب ہو اور لغو کام کرے اور خطبہ نہ سنے نہ خاموش رہے تو اس پر ایک حصہ گناہ ہے، اور جو شخص دوسرے کو کہے خاموش رہ اس نے بھی لغو کیا، اور جس نے لغو کام کیا اس کا جمعہ نہیں ہوا، پھر فرمایا کہ میں نے تمہارے نبی ﷺ سے ایسے ہی سنا ہے۔اس کو احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

وعن ابن عباس رضی الله عنهما قال : قال رسول الله صلی الله علیه وسلم : من تکلم یوم الجمعة والامام یخطب فهو کمثل الحمار یحمل اسفارا ، والذی یقول انصت لیس له جمعة ، رواه احمد۔

اور روایت کیا ہے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ: فرمایا رسول خدا ﷺ نے جو کلام کرے جمعہ کے روز جس وقت کہ امام خطبہ پڑھتا ہو تو وہ آدمی مثل گدھے کے ہے بوجھ اٹھاتا ہے، اور جو کہے کسی کو چپ رہ تو اس کے واسطے جمعہ نہیں ہے، روایت کیا اس کو احمد نے'

وعن ابی الدرداء قال : جلس النبی صلی الله علیه وسلم یوما علی المنبر، فخطب الناس وتلا آیة وإلی جنبی ابی بن کعب ، فقلت : یا ابی متی نزلت هذه الآیة ؟ فابی ان یکلمنی ، ثم سألته ، فابی ان یکلمنی حتی نزل رسول الله صلی الله علیه وسلم ، فقال لی ابی مالک : من جمعتک الا ما لغیت ، فلمّا انصرف رسول الله صلی الله علیه وسلم جئته فاخبرته ، فقال : صدق ابی ، فاذا سمعت امامک یتکلم فانصت حتی یفرغ ، رواه احمد، منتقی،

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ایک روز آنحضرت ﷺ منبر پر بیٹھے پھر خطبہ شروع فرمایا اور ایک آیت پڑھی، میرے پہلو میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بیٹھے تھے، میں نے ان سے کہا کہ: اے ابی! یہ آیت کب اتری ہے؟ انہوں نے کلام نہ کیا، پھر میں نے دریافت کیا، پھر انہوں نے کلام نہیں کیا، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ منبر سے اترے، پھر مجھے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: آج جمعہ سے آپ کو سوائے اس لغو کے کچھ حاصل نہ ہوگا، جب رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ماجرا بیان کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ابی نے سچ کہا جب تم امام کو کلام کرتے یعنی خطبہ پڑھتے سنا کرو تو خاموش رہا کرو، یہاں تک کہ امام فارغ ہوجاوے۔ اسے امام احمد رحمہ اللہ نے روایت کیا ''منتقی'' میں اسی طرح ہے۔

پس اوپر کی عبارتوں سے یہ بات ثابت ہوئی کہ امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک کلام دینی مکروہ نہیں ہے، اور امام صاحب اور صاحبین رحمہم اللہ ہر تین صاحب متفق ہیں کلام دینی کے جواز پر بلا کراہت، اور جن فقہاء نے اس اتفاق کی توضیح کی ہے وہ عمدہ تطبیق دی ہے جس سے اختلاف درمیان امام صاحب اور صاحبین رحمہم اللہ کے رفع ہوگیا ہے اور یہی اصح ہے، باوجود اس کے اگر بعض علماء کی نقل کے موافق کلام دینی اور دنیوی دونوں کو امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک ممنوع کہا جائے تو علامہ شامی رحمہ اللہ کے فرمانے کے موافق صاحبین رحمہما اللہ کا قول معتمد اور مرجح شمار کیا جائے گا، کیونکہ امام صاحب رحمہ اللہ سے قول ''إذا صح الحديث فهو مذهبي'' یعنی امام صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ: جب حدیث صحیح ہو تو وہ میرا مذہب ہے، اور اظہر من الشمس ہے صاحبین کی ادلہ احادیث صحیحہ مرفوعہ سے ثابت مبرہن اور مخالف ان کے صحیح نہیں ہے، پس صاحبین رحمہما اللہ کے قول پر

مسئلہ ہذا میں عمل کرنا عین مذہب حنفی ہے، چنانچہ عبارت شامی کی جلد اول صفحہ:۵۰ر میں موجود ہے:

وانظر الی ما نقله العلامة بیری فی اول شرحه علی الاشباه عن شرح الهداية لابن الشحنة ونصه : إذا صح الحديث فهو مذهبی ، وقد حکیٰ ذلک ابن عبدالبر عن ابی حنيفة وغيره من الائمة ، اه ، ونقله ايضا الامام الشعرانی عن الائمة الاربعة، اه ، هذا ما ظهر لی والله اعلم بالخفی والجلی، کتبه : عبد من عبادالله خادم الطلبة :

القاضی رحمت الله عفی عنه

لا ريب ان المجيب الفاضل الاديب قد اصاب فی تحقيق هذه المسئلة ان التسبيح والتهليل فی وقت الخطبة غير مكروه ' كما فی فتح القدير وقاضی خان ، فجواب الاذان قبل شروع الخطبة ليس من كلام الدنيوی والسكوت لازم فی اثناء الخطبة يسمع الحاضرون ، وعند الفقير المسكين لابأس بجواب الاذان قبل الخطبة ، والله اعلم بالصواب وعنده ام الكتاب ،حرره الراجی بفضل رب العالمين: محمد سيف الدين ابن مولانا نظام الدين

خادم المدرسة النظامية صانها الله عن الآفات والبلية

الجواب صحيح :لا شک انه يكره الكلام مطلقا دينيا كان أو دنيويا وقت الخطبة اتفاقا ، واما قبل الشروع فی الخطبة بعد صعوده علی المنبر فيكره الكلام الدنيوی اتفاقا ، واما الكلام الدينی كالتسبيح والتهليل فلايكره عندهما والاصح انه لا يكره عنده ايضا ، فعلی هذا لا يكره اجابة الاذان الثانی مالم يشرع الامام فی الخطبة،

وحید حسین، مدرس امینیہ دہلی

جواب اذان کی بابت جو تحریر فرمایا ہے یہ عاجز اس سے متفق ہے۔
میں چاہتا ہوں کہ سوال میں اس امر کا بھی اضافہ کروں کہ وقت سماع اذان جو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: جو شخص اذان کو سنے تو یہ دعا پڑھے۔

اللھم رب ھذہ الدعوۃ التامۃ ، والصلوۃ القائمۃ ، آت محمد ن الوسیلۃ والفضیلۃ ، وابعثہ مقاما محمودا الذی وعدتہ ، إلا حلت لہ الشفاعۃ یوم القیامۃ، کیا یہ دعا اذان خطبہ کے وقت بھی پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:......اس حدیث میں کوئی استثناء نہیں ہے، اذان عام ہے اذان خطبہ ہو یا دوسرے وقتوں کی اذان ہو اس دعا کو اذان خطبہ کے وقت پڑھنا چاہئے، یہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے، اور اس کی صحت پر اتفاق ہے۔ بخاری اور اکثر محدثین اس کو نقل کرتے ہیں اور حدیث مرفوع متصل ہے۔

اشعار

ہوتے ہوئے مصطفیٰ کی گفتار — مت دیکھ کسی کا فعل و کردار
مانا کہ کوئی وہ مقتدا تھا — رہبر سوئے راہ مصطفیٰ تھا
کشاف حقائق ہدیٰ تھا — زینت وہ رمز پر ضیا تھا
یا صوفی دہر بے ریا تھا — اسرار نکو میں دلربا تھا
آخر اسی در کا ایک گدا تھا — احمد سے ملا جو کچھ ملا تھا
کیا تجھ سے کہوں حدیث کیا ہے — در دانۂ درج مصطفیٰ ہے
جب اصل ملے تو نقل کیا ہے — یاں وہم وگماں کو دخل کیا ہے
بس اور تو مجھ سے کر نہ کل کل — خورشید کے آگے کیا ہے مشعل

اکثر حضرات نے اس حدیث کے اوپر عمل درآمد ترک کر رکھا ہے، اور اکثر خطیب بھی اس کے ترک کے مرتکب ہوتے ہیں، اذان کے ختم ہوتے ہی وہ خطبہ شروع کر دیتے ہیں، ان کو مناسب ہے کہ اول اس دعا کو پڑھ کر خطبہ شروع کریں۔ حدیث: ''من احيا سنة من سنتی فعمل بها الناس كان له مثل اجر من عمل بها '' کا مصداق بنے۔

بعض حضرات یہ خیال کرتے ہیں کہ ''ہدایہ'' وغیرہ میں جو یہ عبارت نقل کی ہے:

إذا خرج الامام فلا صلوة ولا كلام ، وقالا : لا باس إذا خرج الامام قبل ان يخطب وإذا فرغ قبل ان يشتغل بالصلوة ، صاحب ہدایہ نے: ''إذا خرج الامام فلا صلوة ولا كلام '' کو حدیث مرفوع قرار دیا ہے، یعنی نبی کریم ﷺ کا قول قرار دیا ہے ''فتح القدیر'' نے تحریر فرمایا ہے کہ: صاحب ہدایہ کا حدیث کو مرفوع قرار دینا وہم ہے، معروف یہ ہے کہ وہ کلام زہری کا ہے، امام مالک رحمہ اللہ نے جو'' مؤطا'' میں تحریر فرمایا ہے کہ: ''خروجه يقطع الصلوة و كلامه يقطع الكلام '' امام مالک رحمہ اللہ کے کلام میں تصریح ہے کہ امام کا کلام کرنا یعنی خطبہ شروع کرنا کلام کو منقطع کرتا ہے نفس خروج سے کلام قطع نہیں ہوتا۔

ایک دوسری دلیل ''عالمگیری'' نے نقل کی ہے کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وقت خروج امام کے کلام الناس اور تسبیح اور تشمیت العاطس اور رد سلام بھی جائز نہیں۔ یہ عبارت ''عالمگیری'' کی ان حضرات کی تائید کرتی ہے جو نفس خروج امام سے ذکر اللہ کو بھی ناجائز قرار دیتے ہیں، اور رد سلام کو بھی ناجائز رکھتے ہیں، اگر بالفرض ''إذا خرج الامام '' کو حدیث مرفوع بھی تسلیم کریں تب بھی یہ حدیث ''بخاری'' کی حدیث کا مقابلہ نہیں کر سکتی کہ جس میں دعاء مذکور کے پڑھنے کی ترغیب دی گئی ہے، واضح ہو کہ خروج امام خطبہ کے حکم میں

نہیں جیسا کہ ظاہر ہے اور سکوت وقت خطبہ کے ضروری ہے نہ کہ قبل خطبہ کے۔ اور فقہاء نے تحریر فرمایا ہے کہ: دعاءِ مذکور خطیب اور حاضرین پڑھیں اور ''لا کـــلام'' کو کلام دنیوی کے ساتھ مقید کردیا ہے، جواب اذان اور دعاءِ مذکور اس نفی کے تحت میں نہیں آتی۔ اور امام صاحب رحمہ اللہ کی فقاہت بھی اس کو جائز نہیں رکھتی کہ ''لا کـلام'' سے نبی کریم ﷺ کی حدیث جو دعا کی بابت مروی ہے، اور جواب اذان جو بطریق ''صحیح بخاری'' میں منقول ہے اس کو رد کیا جاوے۔ ''شرح وقایہ'' کے حاشیہ پر'' إذا خـرج الامـام'' کے تحت میں تحریر فرمایا ہے کہ: جواب اذان اور دعاء مذکور اس میں داخل نہیں ہے۔ میں فقہاء کے اقوال کو نقل کر کے طول دینا نہیں چاہتا۔ اور آنحضرت ﷺ کے ارشاد کو اس کی بابت کافی سمجھتا ہوں۔ کچھ عرصہ ہوا اس عاجز نے جامع مسجد میں اعلان کردیا تھا کہ اذان خطبہ کا جواب اور دعاء مذکور کو جو لوگوں نے ترک کر رکھا ہے یہ سنت نبوی ﷺ اور فقہاء احناف کے خلاف ہے، اس پر عمل درآمد کرنا چاہئے۔، فقط والسلام علی من اتبع الهدیٰ۔

احمد عفا علی، مدرس مدرسہ اسلامیہ میرٹھ محلّہ اندرکوٹ

من اجاب بهذا الجواب فقد اصاب	من اجاب اصاب ومن شک فیه فهو مردود
یوسف علی غفرلہ	عبدالسلام عفی عنہ
مدرس مدرسہ اسلامیہ شہر میرٹھ، اندرکوٹ	مدرس مدرسیہ اسلامیہ اندرکوٹ میرٹھ
دلائل الجواب صحیحة ومخالفة الکتاب قبیحة	الجواب حق والحق احق بالقبول ولو انکر الفضول الجهول
محمد عبدالکریم عفا عنہ مدرس مدرسیہ اسلامیہ	ظفر احمد گل۔ گلزار احمد

الجواب بهذا التفصیل والتحقیق هو الجواب، ودونه علیه قول الشادی ومن الفوائد خالی : محمد عبدالله عفی عنه، مدرس مدرسه محمدیه راندیر

نور العینین فی سنیة الخطبتین فی العیدین

عیدین میں خطبے دو ہیں یا ایک، اس مسئلہ پر اس رسالہ میں تفصیلی بحث کی گئی ہے کہ:
احادیث وآثار سے ثابت ہے کہ عیدین کے خطبے بھی جمعہ کی طرح دو سنت ہیں۔

الشیخ العلامة ابی خلیل محمد بن حسین الانصاری الیمانی
حضرت مولانا قاضی رحمت اللہ صاحب لاجپوری

ترتیب وحواشی

مرغوب احمد لاجپوری

عرض مرتب

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله رب العالمين ، والصلوة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين ، وعلى اله واصحابه اجمعين ، اما بعد !

نماز جمعہ سے پہلے کے خطبے دوسنت ہیں،اسی طرح عید کے خطبہ کی سنیت کیا ہے؟ کیا عید کے خطبہ میں حضرت نبی کریم ﷺ بلا فصل ایک ہی مرتبہ کھڑے ہوکراور درمیان میں جلسہ کئے بغیر خطبہ پڑھا کرتے تھے یا دو خطبے پڑھتے تھے؟۔ایک جماعت کا کہنا ہے کہ: عید کے خطبے میں جمعہ کی طرح بیٹھنا اور دو مرتبہ خطبہ پڑھنا سنت نہیں، جبکہ جمہور اور امت کا تعامل یہی ہے کہ عید کے خطبے بھی جمعہ کی طرح دو ہیں۔اس مختصر رسالہ میں اسی مسئلہ پر قدرے تفصیلی کلام کیا گیا ہے،اوراحادیث اور آثار صحابہ سے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ عید کے خطبے بھی دو ہیں۔

بھوپال میں مقیم یمن کے ایک عظیم محدث شیخ محسن الانصاری الیمنی رحمہ اللہ نے سائل کے ایک سوال کے جواب میں بزبان عربی یہ تفصیلی تحریر لکھی ، اس کے بعد حضرت مولانا قاضی سید رحمت اللہ صاحب رحمہ اللہ نے ایک فتوی اردو میں تحریر فرمایا،اوران دونوں کو حضرت مولانا احمد اشرف صاحب راندیری رحمہ اللہ نے شائع فرمایا،اب جبکہ حضرت مولانا قاضی سید رحمت اللہ صاحب رحمہ اللہ کے رسائل کو از سر نو جدید ترتیب سے شائع کیا جارہا ہے تو اسے بھی شامل اشاعت کیا گیا۔

اللہ تعالی اس رسالہ کو بھی قبول فرما کر ذخیرۂ آخرت اور ذریۂ نجات بنائے، آمین۔

مرغوب احمد لاجپوری

الحمد لله رب العلمين ، والصلوة والسلام على نبيه سيدنا محمد خاتم النبيين والمرسلين ، وعلى آله الطيبين الطاهرين المكرمين ، ومن تبعهم باحسان إلى يوم الدين ، بعد!

فيقول الحقير الفقير الجانى أبومحمد حسين بن محسن الانصارى السعدى الخزرجى اليمانى : وقع السوال من بعض الفضلاء ، هل يسن فى صلوة العيدين خطبتين كالجمعة ؟ فان بعضهم زعم أنه لم يثبت فى سنية ذلک ما يصلح أن يكون حجة ، فبينوا ذلک من كتب أئمة الحديث جزاكم الله خيرا ،

فاقول : وبالله استعين طالبا لاصابة الصواب فى الجواب:...... اخرج ابن ماجة من حديث جابر رضي الله عنه قال : خرج رسول الله ﷺ يوم فطر او أضحى فخطب قائما ثم قعد ثم قام ،

وفى اسناده : اسماعيل بن مسلم وهو ضعيف ، واخرج الامام الشافعى فى مسنده من حديث عبيدالله بن عبد الله تابعى ، قال الحافظ بن حجر فى" فتح البارى" فى" باب صلوة الكسوف": فان قول التابعى من السنة كذا الصحيح انه مرسل، انتهى،

وقال فى كتاب الحج : فى" باب التهجير بالرواح إلى عرفة " وهى مسئلة خلاف عند اهل الحديث والاصول، وجمهورهم على ما قاله ابن عبدالبر : انه مسند لأن المراد بالسنة سنة رسول الله ﷺ، وهى طريقة البخارى ومسلم ، ويقويه قول سالم لابن شهاب اذ قال له : أفعل ذلک رسول الله ﷺ ؟ فقال : وهل تتبعون فى ذلک إلا سنته ، انتهى،

وإلى مثل ذلک جنح الحافظ ابن حجر فى شرح النخبة : واقره الشيخ

ابوالحسن السندی وغیره فی حواشیهم علیها، یعنی ان قول التابعی من السنة کذا فی حکم المرفوع ، فعلی القول بانه مسند فهو حجة فی سنیة خطبتین للعیدین من غیر احتیاج إلی العاضد، وعلی القول بانه مرسل فقد اعتضد بمجیئه من وجه اٰخر موصولا ، وهو حدیث جابر الذی اخرجه ابن ماجة وإن کان ضعیفا،

والحدیث المرسل حجة عند ابی حنیفة ومالک رحمهما الله تعالی کما هو مصرح فی الفیة العراقی وغیره،١٢ /قاضی عفی عنه ،

قال الحافظ بن حجر فی" فتح الباری" وفی" باب مسح الرأس" بعد کلام ما لفظه اخرج الشافعی من حدیث عطاء ان رسول الله ﷺ توضأ وحسر العمامة ومسح رأسه ، وهو مرسل لکنه اعتضد بمجیئه من وجه اٰخر موصولا اخرجه ابوداؤد ، ومن حدیث انس رضی الله عنه وفی اسناده معقل لا یعرف ، فقد اعتضد کل من المرسل والموصول بالأخر، وحصلت القوة من الصورة المجموعة ، وهذا مثال لما ذکره الشافعی من ان المرسل یعتضد بمرسل اٰخر أو ضعیف أو مسند ، انتهی،

وفی الالفیة وشرحها للحافظ السخاوی : ان المرسل ان صح مخرجه یجیء من وجه اٰخر صحیح أو ضعیف یعتضد به أو بمرسل اٰخر یخرجه من لیس یروی عن رجال المرسل الاول ، انتهی،

وفی المنج السوی لشیخ الاسلام السید عبدالرحمن بن سلیمان ما لفظه قال النووی : الضعیف عند تعدد الطرق یرتقی عن الضعیف إلی الحسن لغیره ، ویصیر مقبولا معمولا به حینئذ،

قال السخاوی : ولا یقتضی ذلک الاحتجاج بالضعیف ، فان الاحتجاج انما هو بالصورة المجموعة کالمرسل حیث اعتضد بمرسل اٰخر، ولو ضعیفا ، کما قاله

الشافعی والجمهور، انتهی،

وفی” حجة الله البالغة ‘‘ للعلامة احمد بن عبدالرحیم ‘ الشهیر بشاه ولی الله الدهلوی ما لفظه : والمرسل إذاقترن بقرینة مثل ان یعتضد بموقوف صحابی أو مسنده الضعیف أو مرسل غیره والشیوخ مغایرة ، أو قول اکثر اهل العلم أو قیاس صحیح صح الاستدلال به ، وکان نازلا عن المسند وإلا فلا ، وکذا الحدیث الذی یرویه قاصر الضبط غیر متهم أو مجهول الحال المختار انه یقبل،

وقال السید العلامة محمد بن ابراهیم الوزیر فی” تنقیح الانظار مع شرحه تلقیح الافکار‘‘ للسید محمد بن اسماعیل الامیر : وقد یروی الراوی عن المجروح متقویا وهو معتمدا فی العمل علی عموم أو قیاس أو علی ما هو الاصل وهو الاباحة أو الحظر علی حسب رأیه ، ولو لم یکن معه إلا الحدیث الضعیف الذی رواه لم یستجزا العمل به ، وان جاز ان یرویه فعمل الراوی بالحدیث الضعیف لا یدل علی انه مستند إلیه إلا انه یشکل علی هذا قولهم العمل علی وفق الحدیث الضعیف یدل علی قوته ‘ أو علی ان له اصلا اقصی ما فی الباب ان تجویز کون هذا ضعیفا الناظر فیه اذا لتویز مستبعد ضعیف ، انتهی،

وقال شیخ الاسلام زکریا فی شرح اللباب فی الاصول : والاصح ان المرسل لا یقبل إلا إن کان من مرسل کبار التابعین ، وعضده کون مرسله لا یروی إلا من عدل أو عضده قول صحابی أو فعله أو فعل الاکثر أو مسند أو مرسل اٰخر أو انتشار أو قیاس أو عمل اهل العصر علی وفقه أونحوها ، والمجموع حجة ان لم یحتج بالعاضد وحده وإلا فهما دلیلان انتهی،

وفی تخریج احادیث الهدایة للحافظ بن حجر ولابن ماجة :عن جابر ﷺ ’’خرج

النبيﷺ يوم فطر أو اضحى فخطب قائما ثم قعد قعدة اخرىٰ ثم قام " وهذا يرد قول النووى انه لم يرد فى تكرير الخطبة يوم العيد شيئ ، وانما عمل فيه بالقياس على الجمعة ، انتهى كلام الحافظ بن الحجر،

فإن قلت : فان اراد الإمام النووى انه لم يرد ولا ضعيفا فغير مسلم ، وان اراد بعدم الورود بقيد الصحة فمسلم لكن العجب من الحافظ بن حجر فى رده على النووى بأنه لم يرد فى تكرير الخطبة فى العيدين شئ ، وذكر انه ورد فى ذلك حديث ، رواه ابن ماجة ، ولم يبين حال رجال اسناد حديث جابر رضي الله عنه وكانه سكت عليه لما هو معلوم انه من الضعيف الملتقى بالقبول كما قاله السيوطى فى شرح "نظم الدرر" المسمى بالبحر الذى زخر فى اصطلاح علم الأثر ما لفظه : المقبول ما تلقاه العلماء بالقبول وإن لم يكن له اسناد صحيح ، فيما ذكره طائفة منهم ابن عبدالبر ومثله بحديث جابر : الدينار أربعة وعشرون قيراطا "

أو اشتهر عند أئمة الحديث بغير نكير ، منهم فيما ذكر الاستاذ ابواسحاق الاسفرائنى وابن نورك كحديث فى الرقة ربع العشر وحديث " لا وصية لوارث".
أووافق اٰية من القراٰن أو بعض اصول الشريعة حيث لم يكن فى سنده كذاب على ما ذكره الحافظ الحصار، انتهى كلام السيوطى،

وقال الحافظ السخاوى فى شرح الفية العراقى : إذا تلقت الامة الضعيف بالقبول يعمل به على الصحيح ' حتى ينزل منزلة المتواتر فى انه ينسخ المقطوع به، وقد قال الشافعى : حديث " لا وصية لوارث " انه لا يثبته اهل العلم بالحديث ، لكن العامة تلقته بالقبول وعملوا حتى جعلوه ناسخا لأية الوصية للوارث ، انتهى،

وقال العلامة ابراهيم بن مرعىٰ الشبرخيتى المالكى فى شرح الاربعين للنووى:

ومحل كونه لا يعمل بالضعيف فى الاحكام مالم يكن تلقاه الناس بالقبول، فان كان كذلك تعين وصار حجة يقبل فى الاحكام وغيرها كما قاله الامام الشافعى ان قلت حديث " لا وصية لوارث " روى بالفاظ مختلفة وقد صحح الترمذى بعض طرقه وحسن بعضها، قال الحافظ فى فتح البارى : ولا يخلو اسناد كل منها عن مقال، لكن مجموعها يقتضى ان للحديث اصلا ، بل جنح الشافعى فى الأم إلى ان هذا الحديث متواتر، فقال : وجدنا اهل الفتيا ومن حفظنا عنهم من اهل العلم بالمغازى من قريش لا يختلفون فى ان النبى ﷺ قال عام الفتح : لا وصية لوارث ...... عمن حفظوه فيه ممن ...... من اهل العلم فكان نقل كافة عن كافة فهو اقوى وأجود،

وقد نازع الفخر الرازى فى كون الحديث متواترا وعلى تسليم ذلك ، فالمشهور من مذهب الشافعى ان القرآن لا ينسخ بالسنة ، قال الحافظ : لكن الحجة فى ذلك اجماع العلماء على مقتضاه كما صرح به الشافعى وغيره ، انتهى،

وعلى هذا فتصحيح الترمذى لبعض طرقه وتحسينه لبعضها لأجل تعدد طرقه ، لأن تعدد الطرق ترقى الحديث إلى درجة الحسن كما فى النخبة وشرحها للحافظ ابن حجر وغيرها من كتب المصطلح ، ولما اعتضد عنده من التلقى ايضاً بالقبول والاجماع وإلا فقد علمت كما قاله الحافظ بن حجر فى فتح البارى : انه لا يخلو اسناد كل منها عن مقال، فعلى هذا فتمثيل اهل الحديث الضعيف بحديث " لا وصية لوارث " بأنه ليس له سند ثابت ، أى باعتبار ان كل سند منه لا يخلو عن مقال إلا باعتبار تعدد طرقه ، والتلقى بالقبول والاجماع على العمل به ، والله اعلم،

ومن هذا الباب أى من الضعيف المتلقى بالقبول حديث " لا زكوة فى مال حتى يحول عليه الحول" اخرجه أبوداؤد واحمد والبيهقى من رواية الحارث و عاصم بن

ضمرة عن علىرضي الله عنه، والدار قطنى من حديث انسرضي الله عنه،

قال الحافظ فى التلخيص : وفيه حسان بن حسان بن سياه البصرى وهو ضعيف وقد تفرد به عن ثابت ، وابن ماجة والدار قطنى والعقيلى فى الضعفاء من حديث عائشة رضى الله عنها ، وفيه حارثة بن ابى الرجال وهو ضعيف، ورواه الدار قطنى والبيهقى من حديث ابن عمر، وفيه اسماعيل بن عياش، وحديثه عن غير اهل الشام ضعيف ، وقد رواه نمير ومعتمر وغيرهما عن شيخه وهو عبيد اللّٰه بن عمر الراوى له عن نافع وقفوه ، وصحح الدار قطنى فى العلل الموقوف وله طرق اخرىٰ تذكر بعد ، انتهى كلام الحافظ فى التلخيص،

ثم قال ايضا حديث ” ليس فى المال المستفاد زكوة حتى يحول عليه الحول“ اخرجه الترمذى والدار قطنى والبيهقى من حديث عبدالرحمن بن زيد بن اسلم عن أبيه عن ابن عمر رضى الله عنهما مثله ، ولفظ الترمذى ” من استفاد مالا فلا زكوة عليه حتى يحول عليه الحول “ وعبدالرحمن ضعيف ، قال الترمذى : والصحيح عن ابن عمر رضى الله عنهما موقوفا ، وكذا قال البيهقى وابن الجوزى وغيرهما ، وروى الدار قطنى فى غرائب مالک من طريق اسحاق بن ابراهيم الحنينى عن مالک عن نافع عن ابن عمر رضى الله عنهما نحوه ، قال الدار قطنى : الحنينى ضعيف والصحيح عن مالک موقوف ، وروى البيهقى عن ابى بكر وعلى وعائشة رضي الله عنهم موقوفا عليهم مثل ما روى عن ابن عمر رضى الله عنهما، قال : والاعتماد فى هذا الباب والذى قبله على الأثار عن ابى بكر وغيرهرضي الله عنهم،

قلت :حديث علىرضي الله عنه لا بأس باسناده ، والآثار تعضده فيصلح للحجة ، والله اعلم،

وقال الحافظ بن حجر فى الافصاح على نكت ابن الصلاح : ومن جملة صفات القبول التى لم يتعرض لها شيخنا الحافظ زين الدين العراقى ان يتفق العلماء على العمل بمدلول حديث ضعيف، فانه يقبل حتى يجب العمل به، وقد صرح بذلك جماعة من أئمة الأصول ، ومن امثلة قول الشافعى وماقلت من انه إذا تغير طعم الماء أو ريحه أو لونه ، يروى عن النبىﷺ من وجه لا يثبت اهل الحديث مثله لكنه قول العامة لا نعلم بينهم فيه اختلافا ، انتهى،

وفى البخارى : وقال الزهرى : ولا باس بالماء مالم يغيره طعم أولون أو ريح ، قال الحافظ فى فتح البارى : وقول الزهرى هذا ورد فيه حديث مرفوع ، قال الشافعى : لا يثبت اهل الحديث مثله ، لكن لا اعلم فى المسئلة خلافا يعنى فى تنجيس الماء إذا تغير أحد اوصافه بالنجاسة ، والحديث المشار إليه اخرجه ابن ماجة من حديث أبيأمامة واسناده ضعيف ‘ وفيه اضطراب ، انتهى،

وقال الشوكانى فى نيل الاوطار : حديث ” الماء لا ينجسه شئ إلا ما غلب على ريحه أو طعمه أو لونه “ اخرجه الدار قطنى من حديث ثوبان ، وفى اسناده راشيد بن سعد وهو متروك ، وعن أبيأمامة عند ابن ماجة والطبرانى وفيه راشيد بن سعد،

ورواه الدار قطنى بلفظ ” أن الماء طهور إلا أن تغير ريحه أو لونه أو طعمه بنجاسة “ تحدث فيه من طريق عطية عن بقية عن أبيه عن ثور عن راشد بن سعد عن أبيأمامة ، وفيه تعقب على من زعم أن راشد ابن سعد مرسلا ، وصحح أبوحاتم ارساله ، وقال الشافعى : لا يثبت أهل الحديث مثله ، وقال الدار قطنى : لا يثبت هذا الحديث ، وقال النووى : اتفق المحدثون على تضعيفه ، قال فى البدر المنير : فتلخص ان الاستثناء المذكور ضعيف فتعين الاحتجاج بالاجماع كما قال الشافعى

والبيهقي وغيرهما ' يعني ان الاجماع على ان المتغير بالنجاسة ريحا أو لونا أو طعما ينجس،

وكذا نقل الاجماع ابن المنذر فقال : اجمع العلماء على ان الماء القليل والكثير إذا وقعت فيه نجاسة فغيرت طعما أو لونا أو ريحا فهو نجس ، انتهى،

وقال الشوكاني في الدراري المضية شرح درر البهية : وقد اتفق اهل الحديث على ضعف هذه الزيادة ، ولكنه قد وقع الاجماع على مضمونها كما نقله ابن المنذر وابن الملقن والمهدي في البحر ، فمن يقول بحجية الاجماع كان الدليل عنده على ما افاده تلك الزيادة فالاستدلال بها بالاجماع انتهى،

قال الحافظ ابن حجر في فتح الباري في كتاب الصيام : وروى البخاري في التاريخ الكبير :

قال : حدثنا مسدد عن عيسى بن يونس حدثنا هشام بن حسان عن محمد بن سيرين عن أبيهريرةﷺ -رفعه - قال: "من ذرعه القيء وهو صائم فليس عليه القضاء ، وان استقاء فليقض"

قال البخاري : لم يصح ، وانما يروى عن عبد الله بن سعيد المقبري عن أبيه عن أبيهريرةرضي الله عنه وعبدالله بن سعيد ضعيف جدا، ورواه الدارمي من طريق عيسى بن يونس ، ونقل عن عيسى انه قال : زعم اهل البصرة ان هشاما وهم فيه ، وقال أبوداؤد وسمعت احمد بن حنبل يقول : ليس من ذا شيء ، ورواه اصحاب السنن الاربعة والحاكم من طريق عيسى بن يونس، وقال الترمذي : غريب لا نعرفه إلا من رواية عيسى بن يونس عن هشام ، وسالت محمدا عنه فقال : لا اراه محفوظا، انتهى،

وقـد اخرجه ابن ماجة والحاكم من طريق حفص بن غياث ايضا عن هشام، وقال الحافظ فى فتح البارى : ولكن العمل عليه عند أهل العلم ، انتهى،

وفـي جـامـع الترمـذى فى باب " ماجاء فيمن ذرعه القئ " حدثنا على بن حجر حـدثـنـا عيسـى بـن يـونـس عن هشام بن حسان عن ابن سيرين عن أبيهريرةﷺ أن النبىﷺ قال : " من ذرعه القئ فليس عليه القضاء ، ومن استقاء عمدا فليقض "،

قال وفى الباب عن أبيالدرداءﷺ وثوبانﷺ وفضالة بن عبيدةﷺ،

قال ابوعيسى : حديث أبيهريرةﷺ حديث غريب لا نعرفه من حديث هشام بن حسـان عن ابن سيرين عن أبيهريرةﷺ عن النبى ﷺ الا من حديث هشام عيسى بن يونس،

وقال محمد : لا اراه محفوظا، قال وقد روى هذا الحديث من غير وجه عن ابى هريرةﷺ " ان الصائم إذا ذرعه القئ فلا قضاء عليه ، وإذا استقاء عمدا فليقض" وبه يقول الشافعى وسفيان الثورى وأحمد واسحاق ، انتهى كلام الترمذى فى جامعه ،

فـكـذا يقال فى حديث جابرﷺ فـى خـطـبتـى الـعيدين انه مما اجمع عليه وتلقى بالقبول بقطع النظر عما ذكرنا فيه من وجه الدلالة السابقة ، وقد خرجنا عن مقصود الـجـواب ، ولـكـن لا يـخـلو عن فائدة ، والحديث شجون فتحصل مما اوردناه من كـلام أئـمة الـحديث والأصول أن حديث جابرﷺ الـمـرفوع المروى فى سنن ابن مـاجة قد اعتضد بمجيئه من طريق اخرى مرسلة على القول بان حديث عبيد الله بن عبـدالـلـه بـن عتبة مـرسـل وحـصـلت القوة من الهيئة المجموعة ، ويكون من قسم الحسن لغيره فيكون حجة للقائلين بسنية الخطبتين للعيدين،

وامـا عـلـى القول بان حديث عبيد الله بن عبدالله بن عتبة مسند كما حققناه عن

الحافظ بن حجر ، وانها طريقة البخارى ومسلم والجمهور فهو حجة فى نفسه كاف فى الاحتجاج به على سنية الخطبتين للعيدين من غير احتياج إلى عاضد ، وكذا إذا قلنا أنه من قسم الضعيف الذى تلقته الأئمة بالقبول كغيره مما سبق ذكره من الاحاديث التى تلقاها علماء الحديث بالقبول والعمل على هذا ، وهذا ما ظهر للحقير اسير القصور والتقصير، فان كان صوابا فمن الله والحمد لله ' وإلا فمنى ومن الشيطان ، واستغفر الله والحمد لله رب العٰلمين ، وحسبنا الله ونعم الوكيل، ولا حول و لا قوة إلا بالله العلى العظيم ، وصلى الله على خير خلقه محمد وآله و اصحابه وسلم اجمعين ، وعلى التابعين ومن تبعهم باحسان إلى يوم الدين،

قال ابوخليل محمد بن حسين الانصارى اليمانى : وكان الفراغ من نقلها يوم الاثنين ثالث محرم الحرام من شهور سنة ١٣٢٧هـ من الهجرة النبوية بالتماس الأخ المكرم السيد محى الدين المعروف بالقاضى رحمة الله رانديرى ، والحمد لله الذى بنعمته تتم الصالحات ، وصلى الله على خير خلقه محمد وآله وصحبه وسلم،

الفائدۃ الجليلۃ

بعضے تیرہ درون ۱؎ ناحق شناس ۲؎ اپنی ہٹ دھرمی سے عامہ اہل سنت و جماعت کو کہ سیدھے سادے مسلمان ہیں اور مزاولت کتبِ حدیث کی نہیں رکھتے، بہکاتے اور طریقۂ مستمرہ نبویہ اور صراط مستقیم الہیہ اور منہج قدیم احمدیہ مرتضویہ سے ہٹاتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنادیں، ۳؎ اور اس کے لئے ایک طفلِ مکتب مجہول النسب کو ابھار کے اور جوش دلا کے ان دنوں ایک فتوی اس سے لکھوانے پر آمادہ کیا کہ عیدین میں فقط ایک ہی خطبہ ثابت ہے اور دو خطبہ پڑھنے کی کوئی حدیث نہیں ہے، اس طفلِ مکتب بدوی نے بھی دیکھا کہ مفت میں ہلدی لگے نہ پھٹکری ۴؎ زمرہ مفتیوں میں داخل اور خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہوتا ہوں، اس ہدیہ غیر مترقبہ کو بدل و جان قبول فرمایا، سبحان اللہ! خیرات کے ٹکڑے' بازار میں ڈکار' ۵؎ یہ نہ سمجھے کہ جو ہانڈی میں ہوگا ڈوئی میں نکل آئے گا۔

۱؎......تیرہ درون: سیاہ دل۔ تیرہ: بے وقوف، احمق۔

۲؎......ناحق شناس: سچائی کو نہ پہچاننے والا، ظالم، بے انصاف۔

۳؎......اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانا: (مثل ہے): سب سے الگ ہو کر رہنا، کسی کی رائے نہ ماننا، کسی کے ساتھ شامل نہ ہونا۔

۴؎......ہلدی لگے نہ پھٹکری:

اردو میں دو طرح کی مثل ہے:

(۱)......''ہلدی لگی نہ پھٹکری' پٹاخ بہو آن پڑی'': بے مشقت ہی کام بن گیا، بلا کوشش مطلب حاصل ہو گیا۔

(۲)......''ہلدی لگے نہ پھٹکری' رنگ بھی چوکھا آئے'': اس جگہ بولتے ہیں جہاں بغیر کچھ کئے خاطر خواہ کام نکل آئے۔

۵؎......''خیرات کے ٹکڑے اور بازار میں ڈکار'': مانگ مانگ کر گذر بسر کرے اور اس پر شیخیاں مارے۔

زبان لاف رسوا می کند ناقص کمالان را

کہ رو بر خاک مالد پر فشانے بستہ بالان را

کمینہ جو کرے دعوی علو جاہِ کامل کا تو یہ جانو کہ نابینا کنارِ بام چلتا ہے

غریب نہ کتب حدیث سے واقف، نہ کتب اصول سے خبر دار، مبتدی محض ہے، چنانچہ تحریر سے اس کی اظہر من الشّمس ہے، حدیث کی تعریف غلط لکھی ہے:" الحدیث ما اضیف إلی النبی قولا أو فعلا أو تقریرا" یعنی حدیث وہ ہے کہ جو حضرت ﷺ کی طرف منسوب ہو از روئے قول یا فعل یا از روئے تقریر کے۔ اور حدیث کی تعریف صحیح یہ ہے کہ:

" الحدیث ما اضیف الی النبی أو الصحابی أو التابعی قولا أو فعلا أو تقریرا "

یعنی حدیث وہ ہے کہ جو نسبت کی جائے حضرت ﷺ کی طرف یا صحابی یا تابعی کی طرف از روئے قول یا فعل یا تقریر کے۔

دیگر حدیث عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ جو کہ منتقی میں منقول ہے اس کے حدیث ہونے سے انکار کرتا ہے، حالانکہ عبید اللہ بن عبد اللہ مذکور تابعی ہے، اور اصول کی تعریف حدیث کے موافق صاف وہ قول حدیث ہے۔ اور جو عبارت اس طفلِ مکتب نے شوکانی کی "نیل الاوطار" سے نقل کی ہے اس میں خود وہ اس قول کو حدیث لکھتا ہے، مگر سچ ہے کہ:

"دروغ گو را حافظہ نہ باشد" [۶]

اور حدیث ابن ماجہ کی نقل کر کے اس کے راویوں میں جس نے جرح کیا ہے، ان کے جرح کو تو بیان کیا اور جنہوں نے توثیق اور تعدیل ان راویوں کی' کی ہے اس کے تحریر سے پہلو تہی کی ہے۔ علاوہ ازیں اس کے کتب اصول کی بھی خبر نہیں کہ جس راوی میں بعض نے

[۶] ...... جھوٹے کا حافظہ نہیں ہوتا۔ یعنی: جھوٹ بولنے والا اپنے بیان کی خود تردید کر دیتا ہے۔

جرح مبہم کیا ہواوراسی کے دوسرے نے تعدیل کی ہوتو وہ جرح مبہم مقبول نہیں ہے، اوراس جرح کوتعدیل وتوثیق پر ترجیح نہیں ہے، ایسے غلط گواور دروغ گوکو جس نے منتہی مشہور کیا اپنے اباطیل کی تائید کے واسطے کیا ہے، اور یہ نہ جانا کہ اگر یہ طفلِ مکتب کتب احادیث وغیرہ کا منتہی تھا تو پھر کیوں چندروز میں مکتب خوانی کے واسطے چل دیا؟ لہذا ایسے دھوکہ کو دفع کرنے کے لئے میرے احباب نے درخواست کی کہ اس بارے میں کوئی استفتاء تحریر کر کے ہندوستان اور راندیر کے اہل علم سے جواب لے کر مہر اور دستخط سے مزین کرا کے چھپوا دیا جائے تو اس میں رفاہ عام ہو، اور عوام الناس ان کے دھوکے سے بچیں، تو یہ سوال اور علماء کے جواب اس جگہ درج کئے جاتے ہیں، وھو ھذا:

سوال :......کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین زادکم اللہ تعالیٰ تعظیما لدیہ! اس صورت میں کہ عیدین میں دو خطبے حدیث شریف سے ثابت ہیں یا نہیں؟ اور دو خطبے پڑھنا عیدین میں منع ہونے پر کوئی حدیث ثابت ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب : اقول وبہ استعین :......صورتِ مسئولہ میں معلوم ہو کہ احادیثِ صحیحہ صریحہ مرفوعہ اور غیر مرفوعہ ہر دو ثابت اور موجود کتب حدیث میں اظہر من الشمس ہیں، پس اس بارے میں احادیث موقوفہ بھی ہیں، تو معلوم ہوا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں حضرت ﷺ کے بعد بھی دو خطبے عیدین کے معمول بہا تھے۔ اور اسی طرح دو خطبے عیدین کے تابعی کے قول سے بھی ثابت ہیں، جس سے ثابت ہوا کہ بعد صحابہ کے زمانۂ تابعین میں بھی دو خطبے عیدین میں ثابت تھے، پس ثابت ہو گیا کہ زمانہ مشہود لہا بالخیر بحدیث "خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم" الخ ، ؎ کے توارث اس کا جاری رہا ہے،

؎......ان الفاظ سے یہ حدیث ثابت نہیں، تفصیل کے لئے دیکھئے: مرغوب الفتاوی ص۴۹۸ ج۱۔

چنانچہ رسالہ ''نور العینین'' میں اس کی تصریح تام خاتم المحد ثین مولانا مولوی محدث شیخ حسین انصاری ادام اللہ فیضہ (رحمہ اللہ) ۸؎ نے کردی ہے، اور ماسوائے اس کے دوسری حدیثیں دوخطبے عیدین میں پڑھنے کی اس جگہ نقل کرتا ہوں، وہ یہ ہیں:

عن سعد بن ابی وقاص رضی الله عنه : عند البزار فی مسنده ان النبی صلی الله علیه وسلم صلی العیدین بغیر اذان ولا اقامة ، وکان یخطب خطبتین قائما یفصل بینهما بجلسة۔

مسند بزار میں سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: نبی ﷺ نماز عید کی پڑھتے تھے بدون اذان اور اقامت کے، اور دوخطبے پڑھتے تھے کھڑے رہ کر، فاصلہ کرتے تھے درمیان دوخطبوں کے ساتھ جلسہ کے۔ (نیل الاوطار ص۱۸۰ ج۳)

اور ''نسائی'' کی ''کتاب العیدین'' میں ہے:

وعن جابر بن سمرة رضی اللہ عنہ قال : رأیت رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم یخطب قائما ' ثم یقعد قعدة لا یتکلم فیها ' ثم قام فخطب خطبة اخری ، الخ،

یعنی ''نسائی شریف'' میں ہے: جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: میں نے دیکھا رسول خدا ﷺ کو خطبہ پڑھتے ہوئے کھڑے رہ کر، پھر بیٹھ جاتے تھے اور کلام نہیں کرتے تھے خطبہ میں، پھر کھڑے ہوتے تھے تو خطبہ پڑھتے دوسرا خطبہ۔

دوسری حدیث ''نسائی شریف'' کی:

وعن سماک قال سألت جابرا رضی اللہ عنہ أکان رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم یخطب قائما ؟ قال : کان رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم یخطب قائما ثم یقعد قعدة ثم یقوم ،

۸؎......شیخ کی وفات ۱۳۲۷ھ میں ہوئی، حالات کے لئے دیکھئے! ''ذکر صالحین'' ص۱۷۴ ج۱۔

اورروایت ہے سماک سے کہا: سوال کیا میں نے جابر رضی اللہ عنہ سے، کیا تھے رسول اللہ ﷺ خطبہ پڑھتے کھڑے کھڑے؟ تو کہا جابر رضی اللہ عنہ نے کہ: خطبہ پڑھتے تھے آنحضرت ﷺ کھڑے رہ کر، پھر بیٹھتے تھے بیٹھنا پھر کھڑے ہوتے۔

اسی طرح تیسری حدیث ''نسائی شریف'' میں ہے بخوف طوالت کے چھوڑ دیتا ہوں اور دو حدیث پر کفایت کرتا ہوں:

وعن جابر رضی اللہ عنہ قال: خرج رسول اللّٰہ صلی الله عليه وسلم يوم فطر أو اضحى فخطب قائما ، ثم قعد قعدة ثم قام ، رواه ابن ماجة ،

یعنی روایت ہے جابر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ: نکلے رسولِ خدا ﷺ دن فطر کے یا دن اضحیٰ کے تو خطبہ پڑھا حضرت ﷺ نے کھڑے رہ کر، پھر بیٹھ گئے بیٹھنا، پھر کھڑے ہوئے یعنی خطبہ ثانی کے واسطے۔

اورنووی رحمہ اللہ نے خلاصہ میں فرمایا ہے: **روى عن ابن مسعود رضى الله عنهما انه قال : السنة أن يخطب فى العيد بخطبتين يفصل بينهما بجلوس ،**

یعنی روایت ہے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے تحقیق کہ انہوں نے فرمایا: سنت ہے خطبہ پڑھنا عیدین میں دو خطبے اور فاصلہ کرنا درمیان دو خطبوں کے ساتھ جلوس کے۔

اوراسی طرح ''منتقی'' میں ہے:

وعن عبيد اللّٰہ بن عبدالله بن عتبة قال : السنة أن يخطب الامام فى العيدين خطبتين يفصل بينها بجلوس ، رواه الشافعى،

یعنی روایت ہے عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ سے کہا کہ: خطبہ پڑھنا امام کا سنت ہے عیدین میں دو خطبے اور فاصلہ کرنا درمیان دو خطبوں کے ساتھ جلسہ کے۔ روایت کیا اس کو

شافعی نے۔

اگرکوئی اعتراض کرے کہ عبید اللہ مذکور تابعی ہیں، اور تابعی کا کہنا ’’السنة‘‘ اس سے مراد سنت رسول اللہ نہیں ہوتی، چنانچہ علامہ شوکانی نے ’’نیل الاوطار‘‘ میں اس کی تصریح کی ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ شوکانی کا قول یہ بعض الناس کا قول ہے، اور جمہور کے قول کے خلاف ہے، خاص کر امام المحدثین علامہ امام البخاری اور امام مسلم کے بھی خلاف ہے، کیونکہ رسالہ ’’نور العینین‘‘ میں اس کی تصریح گزری ہے کہ جمہور محدثین اور بخاری اور مسلم (رحمہم اللہ) کے نزدیک تابعی کا ’’السنة كذا‘‘ کہنا مراد اس سے سنت رسول اللہ ﷺ ہے، دوسروں کی سنت مراد نہیں ہے۔

وجمهورهم على ما قاله ابن البر : انه مسند ، لأن المراد بالسنة ' سنة رسول الله ﷺ ، وهى طريقة البخارى ومسلم ، ويقويه قول سالم لابن شهاب إذ قال له : أفعل ذلك رسول الله ﷺ ؟ فقال : وهل تتبعون فى ذلك إلا سنته ؟ انتهى،

وإلى مثل ذلك جنح الحافظ بن حجر فى شرح النخبة : واقره الشيخ ابوالحسن السندى وغيره فى حواشيهم عليها، يعنى ان قول التابعى من السنة كذا فى حكم المرفوع،

پس ان عبارتوں اور احادیث صریحہ سے ثابت ہوا کہ عیدین میں دو خطبے پڑھنا آنحضرت ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین سے ثابت ہے، اور آج تک توارث جاری ہے بلانکیر کے، اور دو خطبوں کے پڑھنے کی ممانعت پر کوئی حدیث نہیں، نہ ضعیف نہ مرفوع نہ موقوف،

واللہ اعلم بالصواب وعنده علم الكتاب،

کتبہ: عبد من عباد اللہ خادم الطلبہ
القاضی رحمت اللہ عفا اللہ عنہ

دستخط علماء دہلی زادہم اللہ فضلا

الجواب صحیح	المجیب مصیب	ما احسن الجواب
محمد کفایت اللہ عفی عنہ	محمد ضیاء الحق عفی عنہ	بندہ محمد امین الدین
مدرس مدرسہ امینیہ دہلی	مدرس مدرسہ امینیہ دہلی	مہتمم مدرسہ امینیہ دہلی
لاریب فیہ	اصاب من اجاب	ذلک کذلک
محمد قاسم	انظار حسین	محمد عبد الغفور
مدرس مدرسہ امینیہ دہلی	مدرس مدرسہ امینیہ دہلی	مدرس مدرسہ امینیہ دہلی

دستخط علماء راندیر زاد اللہ تعظیما لدیہ

صح الجواب	ما کتب المجیب فھو فیہ مصیب	اصاب المجیب
حررہ: الراجی عفو ربہ الصمد	کتبہ: العبد الراجی عفو ربہ	عبدہ المذنب الجانی ابراہیم
غلام محمد عفی عنہ	الجلیل محمد اسماعیل عفی عنہ	عفا اللہ عنہ ذنبہ الجدید والقدیم
الجواب صحیح	الجواب صحیح	ھذا الجواب ھو الصواب
کتبہ: المولوی فتح علی شاہ	لعبد الراجی من اللہ:	کتبہ: طیب اللہ عفی عنہ
عفی عنہ	سیف الدین عفی عنہ	

دستخط علمائے بھوپال، زادھم اللہ تعظیما لدیہ

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
محمد یحیی۔ مفتی بھوپال عفا اللہ عنہ	محمد عبد الاحد عفی عنہ	محمد الدین عفی عنہ
الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح

محمد علیم الدین عفی عنہ | محمد عبدالرحمٰن کان اللہ لہ | محمد عثمان عفی عنہ
المجیب مصیب | اصاب من اجاب | صح الجواب
غلام محی الدین | محمد نظام الدین عفی عنہ | محمد عنایت اللہ عفی عنہ

دستخط علماء اہل حدیث سلمہم اللہ تعالی

عیدین میں دوخطبوں کا پڑھنا جائز ومشروع ہے اور متعدد روایات ؏ سے ثابت ہے جو شخص اس کو بدعت قرار دیتا ہے وہ سخت غلطی کرتا ہے، واللہ اعلم۔

کتبہ: محمد عبدالجبار عمر پوری کان اللہ لہ
مقیم دہلی

الجواب صحیح | الجواب صحیح
سید محمد عبدالسلام غفرلہ | سید محمد ابوالحسن
۱۲۹۹ھ | ۱۳۰۵ھ

؏......مولوی عبدالجبار صاحب کا اول جائز ومشروع فرما کر یہ تحریر فرما دینا کہ متعدد روایات سے ثابت ہے ظاہر کرتا ہے کہ صرف جائز ہی نہیں، بلکہ مسنون بھی ہے، اور مسنون بھی ایسا کہ بہت سی روایات میں آیا ہے۔

ناظرین ان روایات کو مختصر طور پر قاضی محمد رحمت اللہ صاحب کے جواب میں ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ اس سے ثابت ہوگیا کہ اس کو بدعت قرار دینے والا صرف کوتاہ نظر ہی نہیں ہے بلکہ ایسا دلیر بھی ہے کہ باوجود ثبوت کے بھی سنت کو بدعت بناتا ہے۔

یہ مولوی سید نذیر حسین صاحب مرحوم کے پوتے ہیں اور اسی طرح مولوی سید ابوالحسن صاحب بھی۔ اوران دونوں صاحبوں نے مولانا شیخ حسین صاحب انصاری یمانی کے عربی رسالہ پر بھی اپنی مہریں ثبت فرمائی ہیں۔

محمد امین الدین عفا عنہ
مہتمم مدرسہ امینیہ دہلی

هداية البر ایا فی احکام الضحایا

اس رسالہ میں قربانی کے احکام اور مسائل کو قدرے تفصیل کے ساتھ بیان گیا گیا ہے۔

حضرت مولانا قاضی رحمت اللہ صاحب لاجپوری راندیری

ترتیب وحواشی واضافہ اور رسالہ

''احادیث النّبویّة فی ایّام الاضحیّة''

مرغوب احمد لاجپوری

ناشر: جامعۃ القراءات، کفلیتہ

عرض مرغوب

اللہ تعالی کی توفیق سے دل میں یہ بات آئی ہمارے اکابر کے رسائل و کتابیں جو نایاب ہورہی ہیں' کی جدید طرز سے اعلی پیمانہ پر اشاعت کی جانی چاہئے ،تو اللہ تعالی کے بھروسہ پر اس کام کی ابتدا کی، الحمد للہ حضرت مولانا احمد میاں صوفی صاحب لاجپوری رحمہ اللہ کے چھ(٦) رسائل ''الرسائل الغالية فی العلوم العالية '' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔اللہ تعالی محض اپنے فضل و کرم سے قبول فرما کر حضرت مؤلف رحمہ اللہ و راقم الحروف و جملہ معاونین کے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے۔

اب محدث راندیر حضرت مولانا قاضی سید رحمت اللہ صاحب لاجپوری رحمہ اللہ کے رسائلِ مفیدہ پر کام ہورہا ہے، یہ رسالہ اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔اس رسالہ میں قربانی کے مسائل ہیں، راقم نے اس پر مفید حواشی لکھے، اور آخر میں چند کام کے فتاوی کا اضافہ کیا، اور ایک رسالہ '' قربانی کے تین دن یا چار''؟ کو بھی شامل کیا جارہا ہے، امید کہ یہ رسالہ اور فتاوی ناظرین کے لئے مفید اور نافع ہوں گے۔اللہ تعالی اس حقیر کاوش کو اپنی بارگاہ عالی میں قبول فرمائیں، اور جملہ کاموں میں اخلاص اور للّٰہیت نصیب فرمائے، ناظرین سے بھی کام کی قبولیت کی دعا کا خواسگار ہوں۔رسالہ کی زبان قدیم ہے، شروع میں خیال تھا کہ اسے نئی زبان اور حال کی اردو میں منتقل کردوں، مگر پھر اسی کو باقی رکھنے کا داعیہ پیدا ہوا اور کچھ احباب کا مشورہ بھی یہی تھا کہ اصل زبان ہی کو باقی رکھا جائے۔

آخر میں قارئین کی خدمت میں گذارش ہے کہ حضرت کے رسائل کے بعد اور اکابر کی تصنیفات کی طرف توجہ ہوگی، اس کار خیر کی ترتیب وطباعت کے جملہ مراحل کی آسانی اور قبولیت کے لئے خصوصی دعا فرمائیں کہ اللہ تعالی ہمارے اسلاف کی وہ نایاب تصنیفات جو گوشۂ گمنامی میں پڑی ہیں' کو منظر عام پر لانے کی توفیق ارزانی مرحمت فرمائے، آمین۔

غرض تحریر

از: مؤلف رسالہ، رحمہ اللہ

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله الغفور الرحيم ، والصلوٰة والسلام على رسوله الكريم ، وعلى اله وصحبه اجمعين ، وعلى الائمة المجتهدين الى يوم الدين، اما بعد،

بعد حمد وصلوٰۃ کے ناظرین پر تمکین [۱] کو معلوم ہو کہ میرے اخص الخاص خیر خواہوں کی مجھ سے خواہش ہوئی کہ چند مسائل قربانی اور اس کے متعلق احکام اور مسائل اردو میں عام فہم لکھوں تا کہ اس سے پھر گجراتی میں ترجمہ کروا کے حنفی مذہب کے مسلمان عوام غیر اردو خواں کو مفید ہو۔ اور اگر بعینہ اردو میں یہ رسالہ رہا تو اس کو بھی طبع کرا کے ہمارے مسلمان بھائیوں کی خدمت میں للہ فی اللہ پیش کیا جاوے۔ بنا براس کے احقر عبداللہ خادم الطلبہ قاضی رحمت اللہ نے اس رسالہ کو اردو میں عام فہم لکھنا اور نقل کرنا کتب فقہیہ معتبرہ سے اختیار کیا ہے۔ [۲] خدائے پاک اس کے تمام کروانے میں اعانت اور مدد فرما کے مقبول خلائق فرماوے، آمین یا رب العالمین۔ احقر العباد

قاضی رحمت اللہ عفی عنہ

---

[۱]...... تمکین...... مرتبہ، رتبہ، عزت، وقار۔ (فیروز) یعنی عزت و وقار والے ناظرین۔

[۲]...... رسالہ کا نام ہے: ”هداية البرايا فى احكام الضحايا“ ‘بَرَايَا : بَرِيَّة’ کی جمع ہے، معنی ہے: پیدا کئے ہوئے، مخلوق، عالم۔ اب رسالہ کے نام کا معنی ہوا: (یہ) قربانی کے مسائل مخلوق کی خدمت میں ہدیہ (ہیں)۔

اضحیہ کا لغوی معنی اور اس کی وجہ تسمیہ

جان تو کہ یہ رسالہ اضحیہ کا ہے، یعنی قربانی کے مسائل میں۔ اور اضحیہ لغت میں اس حیوان کا نام ہے جو ایام اضحیٰ میں ذبح کیا جائے۔[۱] قبیل سے نام رکھنے شے کے اس کے وقت کے نام کے ساتھ۔[۲]

اور جو حیوان مذبوح ہو ایام نحر میں اس کو اضحیہ اس واسطے کہتے ہیں کہ وقت ضحیٰ یعنی دن چڑھے اس کو ذبح کرتے ہیں، اسی طرح ''درر'' میں ہے۔ تو اس کا نام ماخوذ ہوا اس کے وقت کے نام سے، اسی طرح ''حلبی'' میں ہے۔

تقربات مالیہ دو قسم کے ہیں

''طحطاوی'' میں ہے کہ زیلعی نے تصریح کی ہے: تقربات مالیہ دو قسم کے ہیں: ایک قسم تملیک ہے یعنی مالک بنانا ہے، چنانچہ صدقہ۔ اور دوسری قسم اتلاف ہے، یعنی مال کا تلف کرنا ہے، چنانچہ اعتاق اور اضحیہ میں دونوں معنی مجتمع ہوئے کہ خونریزی سے وہ اتلاف ہے، پھر گوشت میں تصرف کرنے سے تملیک اور اباحت ہے۔

دس درہم کی قربانی کرنا ہزار درہم صدقہ سے بہتر ہے

اور واقعات سے ''درمختار'' اور اس کے حواشی میں منقول ہے کہ: قربانی کا خرید کرنا دس درم[۳] سے بہتر ہے ہزار درم کی خیرات سے، اس واسطے کہ جو قربت خونریزی سے حاصل

---

[۱]......اضحیہ اس جانور کو کہتے ہیں: جو قربانی کے دنوں میں تقرب الی اللہ کے لئے ذبح کیا جائے۔
(التعلیق: ۲/۱۶۷۔ بذل: ۹/۵۶۶۔ مرقاۃ: ۲/۲۵۹۔ الرفیق الفصیح ص۳۵۵ ج۹)

[۲]......یعنی یہ اس طرح کی چیزوں سے متعلق ہے جن کا نام وقت کی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔

[۳]......درہم: ایک درہم کا وزن ایک مثقال سے تھوڑا سا کم ہے۔ دس درہم ملائیں تو سات مثقال ہوتا

ہوتی ہے وہ صدقات سے نہیں ہوتی۔

شرع میں اضحیہ کی تعریف

اور اصطلاح شرع میں اضحیہ عبارت ہے حیوانِ مخصوص کے ذبح کرنے سے عبادت کی نیت سے وقت مخصوص میں۔اور مراد حیوان مخصوص سے گائے' بیل' بھیڑ' بکری' اونٹ ہے۔اور مراد وقت مخصوص سے ایام نحر ہے۔

وجوب قربانی کی شرائط

اور شرائط قربانی کی: اسلام' اور مقیم ہونا' اور اس قدر تونگری اور مالداری جس قدر سے وجوب صدقہ فطر متعلق ہے، چنانچہ کتب فقہ میں اس کی تصریح تام ہے۔[۱]

اسلام اور اقامت ایام نحر کے آخر وقت کی معتبر ہے تو اگر اول نحر میں کافر تھا اور آخر میں مسلمان ہوا یا اول نحر میں مسافر تھا اور آخر میں مقیم ہو گیا تو اس پر قربانی واجب ہوگی۔

اور ''فتاویٰ عالمگیری'' میں ہے: ظاہر الروایۃ میں تونگر اور مالدار وہ ہے جس کے پاس دوسو درم یعنی ستاون روپے یا سات تولہ سونا ہو' مسکن اور متاع مسکن اور سواری اور خادم کے

ہے، اس کو وزن سبعہ کہتے ہیں۔ایک درہم کا وزن ۲۵.۲۰/رتی ہوتا ہے، یا ۳.۱۵/ماشہ، یا ۰.۲۶ تولہ، یا ۳.۰۶۱ گرام ہوتا ہے۔(الشرح الثمیر ی ص ۳۲۸ تا ۳۳۶/ج ۱، کتاب الزکوۃ۔مرغوب الفتاوی ص ۲۸۶ ج ۳)

[۱]......قربانی واجب ہونے کی شرطیں یہ ہیں: مسلمان ہو، مالدار ہو، مقیم ہو، عاقل ہو، بالغ ہو۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

''قربانی ہر مسلمان' عاقل' بالغ' مقیم پر واجب ہوتی ہے، جس کی ملک میں ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا مال اس کی حاجات اصلیہ سے زائد موجود ہو، یہ مال خواہ سونا' چاندی یا اس کے زیورات ہوں یا مالِ تجارت یا ضرورت سے زائد گھریلو سامان یا مسکونہ مکان سے زائد کوئی مکان وغیرہ، (شامی) قربانی کے معاملہ میں اس پر سال گذرنا بھی شرط نہیں۔(جواہر الفقہ ص ۲۷۰/وص ۳۲۳/ج ۶)

سوا اور کوئی چیز ہو اس قدر مالیت کی، چنانچہ رہنے کے سوا اور گھر باغ یا چار پائے جانور یا غلام یا گھوڑے یا تجارت کے اسباب وغیرہ ہو ستاون روپے کا تو اس پر قربانی واجب ہے۔[۱]

اور اگر قرآن شریف ہو اس قدر مالیت کا تو اگر وہ شخص قرآن پڑھتا ہو یعنی پڑھ سکتا ہو تو اس پر قربانی نہیں ہے، خواہ بالفعل اس میں پڑھتا ہو یا نہ پڑھتا ہو۔ اور اگر قادر نہ ہو قرأت پر تو قربانی واجب ہے۔

اور کتابوں سے آدمی غنی نہیں ٹھہرتا، مگر اس وقت جب ایک کتاب کے دو نسخے ہوں۔ اور کتب احادیث اور تفسیر سے غنی نہیں ہوتا، اگر چہ دو دو نسخے ہوں۔ اور کتب طب اور نجوم اور ادب سے غنی ہوتا ہے، جب ان کی قیمت بقدر نصاب کے ہو، کذا فی الطحطاوی۔

اور قربانی واجب ہونے کی شرط مرد کا ہونا نہیں ہے' تو قربانی واجب ہے عورتوں پر بھی۔

قربانی کا سبب ورکن

مسئلہ:......قربانی کا سبب وقت ہے اور وقت سے مراد نحر کا دن ہے ابتدائے یوم نحر سے۔

مسئلہ:......قربانی کا رکن ذبح کرنا ہے اس جانور کا جس کا ذبح کرنا جائز ہے منجملہ چوپایوں کے نہ سوائے اس کے۔

مسئلہ:......مکروہ ہے ذبح کرنا مرغی اور مرغ کا قربانی کی نیت سے اس واسطے کہ یہ مشابہت مجوسیوں کے ساتھ ہے۔ (درمختار)

مسئلہ:......واجب ہے قربانی کرنا چوپایوں کا کہ جن کے جواز کا حکم ہے اور یہ وجوب باعتبار

---

[۱]......یہ اس وقت کے حساب سے تھا۔ قربانی کے وجوب کا نصاب ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت ہے۔ ساڑھے باون تولہ چاندی کے ۶۱۲،۳۶ رگرام بنتے ہیں۔

(الشرح الثمیری ص ۳۲۸ تا ۳۳۶ رج ۱، کتاب الزکوۃ۔ مرغوب الفتاوی ص ۲۸۷ ج ۳)

عمل کے ہے نہ باعتبار اعتقاد کے۔

مسئلہ:……اگر کوئی زندہ قربانی کو صدقہ کردے تو واجب ادا نہ ہوگا۔

قربانی سنت ہے یا واجب؟ اور سنت و وجوب کی دلیل

اور ظاہر الروایۃ یہی ہے کہ قربانی واجب ہے۔ اور ابو یوسف رحمہ اللہ سے روایت یہ ہے کہ سنت ہے۔ اور طرفین سے روایت یہ ہے کہ فرض ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ واجب ہے، چنانچہ ''مضمرات'' میں ہے۔ لیکن قربانی کا وجوب کفارۂ یمین اور صدقۂ فطر سے کمتر ہے۔

سنت ہونے کی دلیل یہ ہے کہ سرور عالم ﷺ نے فرمایا کہ: جب تم ذی الحجہ کا چاند دیکھو اور جو تم میں سے قربانی کا ارادہ کرے وہ اپنے بال اور ناخن روک رکھے، یعنی نہ کاٹے اور مشروط کرنا بالارادہ منافی وجوب کا ہے۔ [1]

اور واجب ہونے کی یہ حدیث دلیل ہے کہ:

((مَنْ وَجَدَسَعَةً وَلَمْ يُضَحِّ فَلاَ يقربَنَّ مُصَلاَّنَا)) [2]

یعنی جو کشائش پاوے اور قربانی نہ کرے وہ ہماری عیدگاہ کے پاس نہ جاوے۔

اور اس طرح کی وعید نہ ہوتی، مگر ترک واجب میں۔ [3]

---

[1]……من راى هلال ذى الحِجّة واراد ان يضحىَ فلا يأخذ من شعره ولا من اظفاره)) رواه مسلم۔ (مشكوة شريف، باب الاضحية، الفصل الاول)

[2]……درج ذیل کتابوں میں تھوڑے سے فرق سے یہ حدیث مذکور ہے۔ (ابن ماجہ ص ۲۲۶۔ کنز العمال رقم الحدیث: ۱۲۲۶۱۔ مستدرک حاکم ص ۲۵۸ ج ۴۔

[3]……وجوب کے کئی دلائل ہیں:

(۱)……''وانحر'' کی تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قربانی کی' کی گئی ہے۔ اس لفظ میں قربانی کا امر ہے، اور امر کا اصل مقتضی تو فرض ہونا چاہئے مگر ''نحر'' کی تفسیر میں اختلاف سلف کی وجہ سے ظنیت آ گئی، اس لئے اس سے صرف وجوب ہی ثابت ہوگا۔

اورحدیث اول میں ارادہ سہو کی ضد ہے یعنی عمداً نہ تخییراً تو ارادہ ذکر کرنا نفی وجوب پر دلالت نہیں کرتا، چنانچہ اس حدیث میں کہ:((مَنْ اَرَادَ اَنْ یَحُجَّ فَلْیَسْتَعْجِلْ))[۱] یعنی

(۲)......حدیث مذکور جس میں عیدگاہ میں آنے کی ممانعت کردی گئی ہے۔

(۳)......آپ ﷺ کا مدینہ منورہ میں دس سالہ قیام میں قربانی پر مواظبت فرمانا۔اگر قربانی واجب نہ ہوتی تو آپ ﷺ زندگی میں کم ازکم ایک مرتبہ بیان جواز کے لئے چھوڑ دیتے۔(مشکوۃ،فصل ثالث)

(۴)......آپ ﷺ کے زمانہ میں بعض حضرات نے نماز عید سے پہلے قربانی کرلی تو آپ ﷺ نے انہیں دوبارہ قربانی کا حکم دیا،اگرقربانی واجب نہ ہوتی تو آپ ﷺ دوبارہ قربانی کا حکم نہ دیتے۔

(مسلم شریف، باب وقتها ، کتاب الاضاحی)

ابن حزم نے اس استدلال پر یہ اعتراض کیا کہ آپ ﷺ نے اعادۂ قربانی کا حکم اس کے وجوب کی وجہ سے نہیں دیا، بلکہ اس وجہ سے دیا کہ نفل عبادت بھی شروع کرنے سے واجب ہوجاتی ہے۔''اعلاء السنن'' میں اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ: عبادت شروع کرنے سے تب واجب ہوتی ہے جبکہ اس کو اس کے وقت مشروع میں شروع کیا جائے، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص یوم نحر کا روزہ رکھ کر توڑ دے تو اس کی قضا واجب نہیں ہوگی، یہاں بھی ایسے ہی ہے،اس لئے کہ شہر میں رہنے والے کے لئے نماز عید سے پہلے قربانی کا وقت مشروع نہیں ہوتا۔نیز یہ بات بھی نص حدیث سے ثابت ہے کہ جس کو دوبارہ قربانی کا حکم دیا ہے وہ قبل الصلوۃ ذبح کی وجہ سے۔شارع فی الاضحیہ نہیں بنے تھے۔(الرفیق الفصیح ص ۳۵۹ ج ۹)

[۱]......مشکوۃ شریف، کتاب المناسک ،الفصل الثانی۔

ارادہ کا تعلق سنت اور وجوب دونوں کے ساتھ ہوسکتا ہے، جیسے کہ فرمان نبوی ہے:((من اراد الجمعة فليغتسل))ایسا نہیں کہ جمعہ جس کا جی چاہے پڑھے،اور جس کا جی نہ چاہے نہ پڑھے، بلکہ جمعہ تو فرض ہے،لیکن ارادہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

اور لفظ''ارادہ'' استعمال کرنے کی حکمت یہ ہے کہ: بعض اوقات آدمی پر قربانی واجب نہیں ہوتی، لیکن وہ قربانی کا ارادہ کرلیتا ہے،ان افراد کو بھی اگلے حکم کے تحت داخل کرکے آنحضرت ﷺ نے ''ارادہ'' کا لفظ استعمال فرمایا، اس لفظ کے استعمال کرنے سے صاحب حیثیت لوگوں پر قربانی کے وجوب کی نفی نہیں ہوتی۔

(مرقاۃ ص ۲۶۲ ج ۲۔بذل ص ۵۲۹/۵۳۱ ج ۹۔التعلیق ص ۱۶۸ ج ۲۔الرفیق الفصیح ص ۳۷۳ ج ۹)

جوحج کا ارادہ کرے وہ شتابی کرے۔

قربانی کا منکر کافر نہیں

جب قربانی واجب عملی ہوئی نہ واجب اعتقادی تو اس کا منکر کافر نہ ہوگا۔ اسی طرح "طحطاوی" میں ہے۔

قربانی کس پر واجب ہے

مسئلہ: ......قربانی کرنا واجب ہے آزاد مسلمان پر جو مقیم ہو شہر یا گاؤں یا جنگل میں اسی طرح "عینی" میں ہے۔

مسئلہ: ......قربانی واجب نہیں حاجی مسافر پر۔[۲] اور مکہ والوں پر قربانی لازم ہے اگر چہ وہ حج

[۱]......شتابی: (شِ تابی) جلدی، تیزی۔ (فیروز اللغات)

[۲]...... یہ جب ہے کہ حاجی مسافر ہو"ولا تجب الاضحية على الحاج ، واراد بالحاج المسافر"

(بدائع الصنائع: ۴/۱۹۵)

جو شخص ایسے وقت مکہ مکرمہ پہنچا کہ اب ایام حج شروع ہونے میں پندرہ دن سے کم کا عرصہ باقی ہے، یعنی: ۸/ ذی الحجہ سے: ۱۴/ دنوں پہلے یا اس سے کم دن باقی تھے کہ مکہ آیا تو اب وہ مسافر ہے، اس لئے بالاتفاق اس پر بقر عید والی قربانی واجب نہیں، کیونکہ یہ مسافر ہے اور قربانی مسافر واجب نہیں ہوتی۔

جو حاجی: ۸/ ذی الحجہ سے پندرہ دن پہلے مکہ مکرمہ پہونچ جائے وہ مقیم ہے، ایسے شخص پر کیا بقر عید کی قربانی واجب رہے گی؟ اس سلسلہ میں فقہاء حنفیہ سے دونوں طرح کی باتیں منقول ہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ: حاجی پر مطلقا عید والی قربانی واجب نہیں: "ولا تجب .... وعلى المسافرين ولا على الحاج اذا كان محرما وان كان اهل مكة"۔ (الفتاوى الهندية: ۵/۲۹۳)

اور بعض فقہاء کے نزدیک جو حاجی مقیم ہو تو اقامت کی وجہ سے اس پر قربانی واجب ہے۔ یہ دوسری رائے زیادہ احتیاط پر مبنی ہے، اس لئے اسی پر عمل ہونا چاہئے، چنانچہ "شامی" کی "کتاب الحج" میں ہے "والتضحية انما تجب بالشراء بنيتها أو الاقامة ولم يوجد واحد منهما"۔ (رد المحتار: ۳/۵۶۵)

کررہے ہوں۔

نابالغ پرقربانی

مسئلہ:...... باپ قربانی کرے اپنے فرزند صغیر کی طرف سے صغیر کے مال میں سے، اسی قول کو ''ہدایہ'' میں صحیح کہا ہے۔ [۱]

علامہ شامی نے قربانی کے بیان (كتاب الاضحية) میں اس پر روشنی ڈالی ہے، پس جولوگ مکہ میں ایام حج سے پندرہ دن پہلے پہونچ گئے ہوں ان پر حج کی قربانی کے علاوہ بقرعید کی قربانی بھی واجب ہوگی۔

البتہ حج کی قربانی تو حدودحرم ہی میں دی جاسکتی ہے، لیکن بقرعید کی قربانی کے لئے ایسی کوئی شرط نہیں، اپنے وطن میں بھی قربانی دے سکتا ہے۔ (کتاب الفتاوی ص ۱۳۵ ج ۴)

[۱]...... یہ روایت امام صاحب سے حضرت حسن نے نقل کی ہے، جوکہ ظاہر الروایۃ کے خلاف ہے، ظاہر الروایۃ میں اولاد صغیر کی طرف سے قربانی واجب نہیں۔ ''وتجب عن نفسه ، لانه اصل في الوجوب عليه ما بيناه ، وعن ولده الصغير لانه في معنى نفسه فيلحق به كما في صدقة الفطر ، وهذه رواية الحسن عن ابي حنيفة ، وروى عنه انه لا يجب عن ولده وهو ظاهر الرواية''۔

(ہدایہ ص ۴۴۴ ج ۴، كتاب الاضحية، مکتبہ یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند۔ شامی، زکریا ص ۴۵۷ ج ۹، كتاب الاضحية۔ مجمع الانہر ص ۱۶۷ ج ۴، كتاب الاضحية ، مطبوعه دار الكتب العلمية، بیروت۔ فتاوی محمودیہ ص ۲۴۲ ج ۲۶۔ مکتبہ محمودیہ، میرٹھ)

قربانی ایک عبادت ہے، اورشریعت عبادتیں بالغوں پرواجب قرار دیتی ہے، نہ کہ نابالغوں پر، اسی لئے نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ بچہ پرواجب نہیں، یہی حکم قربانی کا بھی ہے کہ قول صحیح کے مطابق نابالغ پر قربانی واجب نہیں ہوگی، البتہ اگر ولی ایسے نابالغ بچوں کی طرف سے اپنے مال میں سے قربانی کردے تو بہتر اور قرین احتیاط ہے، چنانچہ مشہور فقیہ قاضی فخر الدین اوزجندی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

''وفي الكافي الاصح انه لا يجب ذلك .... وليس للأب ان يفعله من مال الصغير''۔

(فتاوی قاضی خان ۳/۳۴۶۔ نیز دیکھئے! البحر الرائق ۸/۱۷۴۔ الفتاوی الهندية ۵/۲۹۳۔ کتاب الفتاوی ص ۱۳۲ ج ۴)

مولانا مفتی خالد سیف اللہ صاحب مدظلہم نے ''کتاب الفتاوی'' میں تو یہی لکھا کہ نابالغ پر قربانی

کس جانور کی قربانی جائز ہے

مسئلہ:......جو جانور قربانی کیا جاوے وہ دنبہ، بھیڑ، بکرا، بکری ہے، یا ساتواں حصہ اونٹ یا گائے یا بھینس، پاڑا ہو۔

مسئلہ:......اگر ایک شخص کا حصہ شتر [۱] اور گائے سے ساتویں حصہ سے کمتر ہو تو کسی کی طرف سے قربانی جائز نہ ہوگی، یعنی شتر اور گائے کی قربانی سات شخصوں کی طرف سے جائز ہے، بشرطیکہ کسی کا حصہ ساتویں حصہ سے کم نہ ہو۔

مسئلہ:......قربانی کے واسطے صحیح ہے جذع یعنی چھ مہینے کا پٹھا دنبہ کا بشرطیکہ ایسا قد آور ہو کہ اگر سال بھر کی بھیڑ بکریوں میں ملایا جاوے تو اس کی تمیز دور سے ممکن نہ ہو۔ کتب فقہ میں لفظ ضان چھ مہینے کا لکھا گیا ہے مگر مراد ضان سے وہ ہے جس کے الیہ ہو یعنی چکتی ہو۔[۲] اسی طرح صدر الشریعہ اور درر میں ہے۔ اور یہ دنبہ اگر صغیر الجثہ ہو تو چھ ماہ کے دنبہ کی قربانی جائز نہیں ہے جب تک ایک سال پورا نہ ہو، اور دوسرا سال شروع نہ ہوا ہو۔

مسئلہ:......ثنی [۳] اور اس سے زیادہ صحیح ہے تینوں قسموں سے یعنی غنم اور بقر اور ابل سے۔ اور ثنی اونٹ سے پانچ سال کا ہوتا ہے، اور گائے بیل اور بھینس سے دو سال کا ہوتا، اور بھیڑ

واجب نہیں ہے، مگر قاموس الفقہ'' میں اس کے خلاف تحریر فرما گئے، چنانچہ قربانی واجب ہونے کی شرطوں کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بالغ اور عاقل ہونا ضروری نہیں، چنانچہ نابالغ نصاب زکوۃ کا مالک ہو تو اس کے مال کا نگراں (وصی) یا اس کا ولی اس میں سے قربانی کرے گا''۔ (قاموس الفقہ ص ۱۵۵ ج ۲)

[۱]......شتر: (شُ تُر) اونٹ۔ (فیروز اللغات)

[۲]......اَلْیَۃ: دم۔ سرین۔ (بیان اللسان، عربی اردو ڈکشنری) چکتی: دنبے کی چوڑی دم۔ (فیروز اللغات)

[۳]...... ثِنِی: اونٹ کہ چھٹے سال میں لگا ہو۔ (بیان اللسان، عربی اردو ڈکشنری)

بکری سے سال بھر کا ہوتا ہے۔اندازہ اسنان مذکورہ مانع نقصان ہے نہ مانع زیادت،تو اگر ان سے کم عمر کا ذبح ہوگا تو جائز نہ ہوگا،اور اگر ان سے زیادہ عمر کا ذبح ہوگا تو جائز ہے، بلکہ افضل ہے،اسی طرح ''عالمگیری'' میں ہے۔

مسئلہ: ......جو جانور پیدا ہوا ہو اہلی اور وحشی سے، وہ اپنی ماں کا تابع ہے ایسا کہا ہے ''در المختار'' میں، یعنی اگر اس کی ماں کی قربانی جائز ہے تو اس کی بھی جائز،اور اگر اس کی ماں کی جائز نہیں تو اس کی بھی جائز نہیں۔

مسئلہ:......بھیڑ بکری بہتر ہیں بیل کے ساتویں حصہ سے،اگر قیمت اور گوشت میں دونوں برابر ہوں ،اور مینڈھا بہتر ہے بھیڑ سے جبکہ دونوں کی قیمت برابر ہو، اور بھیڑ کی قیمت زیادہ ہو یا گوشت اس کا زیادہ ہو تو وہ مینڈھے سے افضل ہے،اسی طرح ''درمختار'' میں ہے

مسئلہ: ...... مادہ بکری بہتر ہے نر بکرے سے جبکہ دونوں قیمت میں برابر ہوں۔اور اونٹنی اور گائے افضل ہے اونٹ اور بیل سے، کذا فی الحاوی۔اور ''طحطاوی'' میں ہے کہ: ابل اور بقر میں مادہ افضل ہے نر سے،اس واسطے کہ دونوں قسموں میں مادہ کا گوشت عمدہ ہوتا ہے نر کے گوشت سے۔

مسئلہ: ......شتر اور گائے کی قربانی کمتر سات سے بطریق اولیٰ جائز ہے، یعنی چھ یا پانچ شخصوں کی طرف سے بطریق اولیٰ درست ہے، بشرطیکہ ہر ایک کا حصہ ساتواں ہو یا زیادہ ہو،اسی طرح ''حلبی'' میں ہے۔

حاملہ جانور کی قربانی اور جو بچہ پیدا ہو اس کا حکم

مسئلہ: ......جو قربانی کا جانور بچہ جنے ذبح ہونے سے پہلے تو بچہ بھی ذبح کیا جائے اس کے ساتھ۔اور بعضوں کے نزدیک بچہ خیرات کیا جائے بدون ذبح کرنے کے۔[۱] (ص۲۱۱ پر)

عیب دار جانور کی قربانی

مسئلہ:......قربانی کرے منڈے یعنی جس کے سر پر سینگ نہ ہوں اور خصی یعنی بدھیا۔ اور قربانی کرے اس دیوانے کو جس کو دیوانگی چرنے چگنے سے نہ روکے اور اگر چرنے چگنے سے دیوانگی باز رکھے تو ایسے دیوانے جانور کو قربانی کرنا جائز نہیں۔

مسئلہ:......اگر قربانی کرے موٹے خارشی جانور کو تو درست ہے اور اگر خارشی جانور دبلا ہو تو جائز نہیں، اس واسطے کہ گوشت میں خارش ہونا نقصان ہے، یعنی کھال کی خارش سے گوشت میں نقصان نہیں لہٰذا اس کی قربانی درست ہے، اور جب خارش سے جانور دبلا ہو گیا تو معلوم ہوا کہ خارش گوشت تک پہنچ گئی اس واسطے درست نہیں۔

مسئلہ:......قربانی اندھے اور کانے کی اور ایسے نہایت دبلے جانور کی جس کی ہڈیاں نظر آتی ہوں اور اس میں گودا نہ ہو درست نہیں ہے۔

مسئلہ:...... جائز نہیں قربانی اس لنگڑے کی جو ذبح کرنے کے مقام تک نہ چل سکے، اگر ایسا

ل......قربانی کے بعد بچہ زندہ نکلے تو اس کی بھی قربانی کردی جائے، اور جو تصرف اصل قربانی کے گوشت میں کیا جائے وہی اس کے بچے کے گوشت میں کیا جائے۔ (فتاوی محمودیہ ص ۲۶۷ ج ۲۶، مکتبہ محمودیہ، میرٹھ)

قربانی کا جانور ذبح کرنے کے بعد بچہ زندہ نکلے تو اس کو بھی ذبح کرے۔ اور مردہ نکلے تو اس کو استعمال میں نہیں لاسکتے۔ اور اگر قربانی کا جانور ذبح کرنے سے پہلے اس کو بچہ پیدا ہو تو اسے بھی ماں کے ساتھ ذبح کردیا جائے، یا زندہ صدقہ کردیں، اگر مذکورہ دونوں صورتوں میں سے کچھ بھی نہ کیا حتی کہ ایام اضحیہ ختم ہوگئے تو اب زندہ صدقہ کرنا لازم ہے، صدقہ بھی نہ کیا یہاں تک کہ دوسرے سال کی قربانی کا زمانہ آگیا تو اب خود کی (امسال کی واجب) قربانی کے عوض اس کی قربانی درست نہیں، اس کے باوجود ذبح کیا تو اس کا گوشت صدقہ کرنا ضروری ہے، اور جانور ذبح کرنے کی وجہ سے قیمت میں جو کمی واقع ہوئی اتنی مقدار کا صدقہ کرنا بھی لازم ہے، اور خود کی واجب قربانی کے لئے دوسرا جانور ذبح کرے۔

(فتاوی رحیمیہ ص ۸۳ ج ۲۔ ص ۳۲۴ ج ۹)

لنگڑا جانور ہو جو تین پاؤں سے چلے اور چوتھے پاؤں سے نہ چلے یعنی چوتھا پاؤں زمین پر نہ رکھے تو اس کی قربانی جائز نہیں، اور اگر چوتھے پاؤں کو تھوڑا ٹیکتا ہو اور جھکا چلتا ہو تو اس کی قربانی درست ہے۔اسی طرح ''درمختار'' میں ہے۔

مسئلہ:......اور اس بیمار کی قربانی جائز نہیں جس کی بیماری صاف ظاہر ہے۔

مسئلہ:......اور اس جانور کی قربانی جائز نہیں جس کا اکثر کان یا دم یا آنکھ قطع ہوگئی ہو، یعنی جس جانور کی آنکھ کا اکثر نور جاتا رہا ہو تو اس کی قربانی جائز نہیں۔اور اکثر روشنی کا جانا چارا نزدیک رکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔

مسئلہ:......''طحطاوی'' نے کہا: اکثر کا رعایت کرنا فقیہ ابواللیث رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔اور ''مجتبیٰ'' میں اسی قول پر فتویٰ مذکور ہے۔اور'' قاضیخان'' میں ہے کہ: صحیح قول یہ ہے کہ تہائی اور اس سے کم قلیل میں داخل ہے، اور جو اس سے زیادہ ہو وہ کثیر ہے، اور اس پر فتویٰ ہے، تو معلوم ہوا کہ یہاں فتویٰ مختلف ہے۔

مسئلہ:......جس دنبہ کی اکثر چکتی [1] کٹی ہو تو اس کی قربانی جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اکثر کے واسطے کل کا حکم ہے رہنے اور جانے میں، تو اکثر کان اور دم اور آنکھ اور چکتی کا باقی رہنا کفایت کرتا ہے قربانی میں۔اور اسی قول پر فتویٰ ہے، اسی طرح ''درمختار'' میں ہے۔

مسئلہ: ......اور قربانی نہیں جائز ہے پوپلے جانور کی، یعنی جس کے دانت نہیں، اور اکثر دانتوں کا باقی رہنا کفایت کرتا ہے، اور قول ضعیف یہ ہے کہ اس قدر دانتوں کا باقی رہنا کافی ہے جس قدر سے چارہ کھا سکے، یعنی اگرچہ نصف سے کم ہوں۔

مسئلہ:......اور جائز نہیں قربانی بوچے [2] کی جس کے پیدائشی کان نہیں۔اور اگر جانور کے

---

[1]......چکتی: دنبے کی چوڑی دم۔(فیروزاللغات)

[2]......بوچا: کن کٹا۔چھوٹے کان والا۔

چھوٹے کان ہوں تو اس کی قربانی کافی ہے۔اور اگر پیدائشی ایک کان ہوتو قربانی اس کی درست نہیں،اسی طرح ''عالمگیری'' میں ہے۔

مسئلہ:......قربانی اس جانور کی جائز نہیں جس کے تھنوں کی نوکیں کٹی ہوں۔یا وہ خشک ہوں

مسئلہ:......اور قربانی درست نہیں نکٹے جانور کی جس کی ناک کٹی ہو۔

مسئلہ:......اور قربانی اس جانور کی درست نہیں ہے کہ جس کے تھنوں کی نوکیں کٹی ہوں،یعنی جس جانور کا علاج کرنے سے دودھ منقطع ہوگیا ہو۔

مسئلہ:......اور درست نہیں قربانی اس دنبہ کی جس کے پیدائشی چکتی ۱؎ نہ ہو،اسی طرح ''درمختار'' میں ہے۔

مسئلہ:......اور جائز نہیں قربانی خنثی کی،اس واسطے کہ اس کا گوشت پختہ نہیں ہوتا،اسی طرح ''درمختار'' میں ہے۔۲؎

مسئلہ:......اور جائز نہیں قربانی نجاست خوار جانور کی جو گوہ کھاتا ہے اور اس کے سوا کچھ کھاتا نہیں۔اس قید سے معلوم ہوا کہ اگر نجاست بھی کھاتا ہے اور چارہ بھی کھاتا ہوتو اس کی قربانی درست ہے،اسی طرح ''طحطاوی'' میں ہے۔

۱؎......چکتی: دنبے کی چوڑی دم۔(فیروز اللغات)

۲؎......حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری مدظلہم تحریر فرماتے ہیں:

اگر خنثی کا گوشت ''کُوکر'' وغیرہ کے ذریعہ اچھی طرح پک جائے تو قربانی درست ہوجائے گی، ''امداد الفتاوی'' (۳:۵۷۱) میں ہے: لان لحمها الخ، علت ہے، حکمت نہیں،اور ظاہر ہے کہ علت کے ارتفاع سے حکم مرتفع ہوجاتا ہے،پس جب گوشت اچھی طرح پک گیا تو قربانی کو صحیح کہا جائے گا،مگر خنثی کا گوشت پکے گا یا نہیں؟ یہ بات بعد میں معلوم ہوگی،اس لئے اس فتوی میں خنثی کی قربانی کے عدم جواز کا فتوی دیا گیا ہے۔

(فتاوی رحیمیہ ص ۳۹۵ ج ۵،مکتبۃ الاحسان،دیوبند۔فتاوی دار العلوم دیوبند ص ۵۳۷ ج ۱۵،مکتبہ دار العلوم دیوبند)

تنبیہ:......قربانی جائز ہے اس جانور کی جس کو کھانسی ہوتی ہو، اور اس کی جو بڑھاپے سے جن نہیں سکتا، اور اس کی جو داغا گیا ہو، اور اس کی جس کا دودھ نہیں اترتا بلا مرض سے، اور جس کی چھوٹی چکتی ہو دم کے برابر، اور جس کی زبان کٹی ہو بشرطیکہ چارہ کھا سکتا ہو، اسی طرح ''طحطاوی'' میں ہے۔

مسئلہ:......اگر قربانی تندرست خریدی پھر اس میں وہ عیب لگ گیا جو مانع ہے جواز قربانی کا، چنانچہ عیوب مانع مذکور ہو چکے، تو اس پر واجب ہے کہ اور قربانی کا جانور اس کے قائم مقام کرے، اگر خرید کرنے والا مالدار ہو، اور اگر محتاج ہو تو وہی عیب دار قربانی کرے، اور یہ قربانی اس کے واسطے کفایت کرتی ہے۔

مسئلہ:......اور ضرر نہیں کرتا عیب دار ہو جانا قربانی کا اس کے تڑپنے کے سبب سے ذبح کے وقت۔

قربانی کا وقت

مسئلہ:......واجب ہے قربانی کرنا یوم النحر کی فجر سے ایام نحر کے پچھلے دن تک۔ اور ایام نحر تین دن ہیں، یعنی دسویں اور گیارہویں اور بارہویں تاریخ ذی الحجہ کی۔ اور افضل دن قربانی کا پہلا دن ہے۔

مسئلہ:......ایک شہر میں جس میں فتنہ ہے یعنی وہاں کا کوئی حاکم نہیں ہے تو شہر والوں نے نماز نہ پڑھی حاکم کے نہ ہونے کے سبب سے اور قربانی کی بعد طلوع ہونے فجر کے تو جائز ہے، قول مختار میں، اس واسطے کہ شہر بمنزلہ دیہات کے ہو گیا اس حکم میں۔

مسئلہ:......اگر گواہی دی گواہوں نے امام کے نزدیک کہ وہ عید کا دن ہے، سو لوگوں نے نماز عید پڑھی اور قربانی کی، پھر ظاہر ہوا کہ وہ عرفہ کا دن ہے تو نماز اور قربانی کفایت کرتی

ہے،اس واسطے کہ ایسی خطا سے بچنا ممکن نہیں،تو جواز صلوٰۃ اور قربانی کا حکم کیا جائے گا جمیع مسلمین کے بچاؤ کے واسطے، تا کہ ان کی نماز اور قربانی فساد سے محفوظ رہے، اسی طرح ''درمختار'' میں ہے۔

مسئلہ:......قربانی کا اول وقت شہر والوں کے لئے نماز عید پڑھ چکنے یا نماز کا وقت گزر جانے کے بعد ہے، اگر شہر والوں نے عذر کے سبب سے عید کے دن نماز نہ پڑھی تو گیارہویں اور بارہویں ذی الحجہ کو قبل از نماز عید قربانی جائز ہے۔اس واسطے کہ گیارہویں یا بارہویں کی نماز قضا واقع ہوگی نہ ادا، اسی طرح ''زیلعی'' میں ہے۔[1]

مسئلہ:......آخری وقت قربانی کا یوم ثالث یعنی بارہویں تاریخ کے غروب ہونے سے پہلے، اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے تیرہویں تاریخ میں بھی قربانی جائز رکھی ہے۔[2]

رات میں قربانی کرنا

مسئلہ:......ایام نحر کی راتوں میں قربانی جائز ہے، لیکن مکروہ ہے، بسبب خوف غلط کے تاریکی میں، اسی طرح ''حموی'' میں ہے۔[3]

---

[1]......اگر کسی وجہ سے شہر کے لوگ عید الاضحیٰ کی نماز دسویں ذی الحجہ کو نہ پڑھ سکیں تو قربانی زوال سے پہلے جائز نہیں، بلکہ زوال کے بعد ہی سے قربانی کرنا جائز ہوسکتا ہے۔
(زیلعی ۶/۴۔شامی کراچی ۶/۲۸۱۔مسائل قربانی وعقیقہ ص ۱۰)

[2]......تفصیل کے لئے دیکھئے!ص:۲۵۳۔

[3]......رات میں قربانی کرنا جائز ہے، مگر خلاف اولی اور مکروہ تنزیہی ہے، کیونکہ رات میں غلطی کا خطرہ ہے۔اور ایام ثلاثہ میں سے پہلی رات یعنی نویں اور دسویں کی درمیانی رات میں قربانی جائز نہیں، اور دسویں، گیارہویں کی درمیانی رات اور گیارہویں اور بارہویں کی درمیانی رات میں جائز ہے۔
(شامی کراچی ۶/۳۱۶۔درمختار زکریا ۹/۴۶۳۔مسائل قربانی وعقیقہ ص ۱۲)
رات میں فی نفسہ قربانی کرنا مکروہ نہیں، بلکہ تاریکی کی وجہ سے غلطی کا احتمال ہوتا ہے، اور اندیشہ ہے

قربانی میں مکان کا اعتبار ہے

مسئلہ:......معتبر قربانی کا مکان ہے، نہ اس شخص کا مکان جس پر قربانی واجب ہے، یعنی اگر قربانی دیہات میں ہو اور قربانی کرنے والا شہر میں ہو تو بمجرد طلوع فجر قربانی جائز ہے، اور اگر قربانی شہر میں ہو اور قربانی کرنے والا دیہات میں ہو تو قربانی جائز نہیں، مگر بعد نماز عید کے، برخلاف صدقۂ فطر کہ اس میں مکان فاعل معتبر ہے۔[1]

قربانی میں شرکت

مسئلہ:......اگر کسی نے قربانی کا جانور گائے یا اونٹ خرید کیا اپنی ذات کے واسطے پھر اس میں شریک کرلیا، تو ''فتاویٰ عالمگیری'' میں یہ ہے کہ: اگر قربانی کے ارادہ سے خرید کیا پھر اس میں چھ شخصوں کو شریک کرلیا تو مکروہ ہے، اور قربانی ساتوں کی طرف سے کفایت کرے گی، اور اگر خرید کے وقت شریک کر لینے کا ارادہ کرے تو مکروہ نہیں، اور اگر قبل از خرید اس کا ارادہ کرے تو بہتر ہے۔

مسئلہ:......مشترک قربانی کا گوشت تقسیم کیا جائے تول کر نہ اٹکل سے، مگر جب کہ گوشت کے پائے یا کھال ملائی جاوے تو وزن کا برابر ہونا ضروری نہیں۔ جنس کو خلاف جنس کی طرف پھیرنے کے سبب سے یعنی ہر جانب میں کچھ گوشت ہو اور کچھ پائے یا ہر جانب میں کچھ

کہ ذبح میں جن رگوں اور نالیوں کو کاٹنا مطلوب ہے، وہ صحیح طور پر نہ کٹ پائیں، اس لئے فقہاء نے رات میں قربانی کو منع کیا ہے: ''ويجوز الذبح فى لياليها الاانه يكره لاحتمال الغلط فى الظلمة''۔
(البحر الرائق ۳۲۲/۸)

لہذا اگر روشنی کا انتظام ہو کہ غلطی کا اندیشہ باقی نہ رہے تو رات میں بھی قربانی کرنے اور جانور کے ذبح کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ (کتاب الفتاوی ص ۱۶۳ ج ۴)

[1]......اس مسئلہ کی تفصیل کے لئے دیکھئے! ص: ۲۳۹۔

گوشت ہو اور کچھ کھال یا ایک جانب میں گوشت اور پائے ہوں اور دوسری جانب میں گوشت اور کھال ہو تو اب جائز ہے صرف کرنا جنس کا خلاف جنس کی طرف، اسی طرح 'درر' میں ہے۔

قربانی کا جانور مرجائے یا گم ہوجائے اور پھر مل جائے؟

مسئلہ: ......اگر قربانی گم ہوگئی یا چوری ہوگئی سو دوسری قربانی کا جانور خرید کیا، پھر پہلی ملی تو دونوں کا ذبح کرنا افضل ہے، اور اگر پہلی قربانی کو ذبح کرے گا تو بھی درست ہے، اور اسی طرح اگر دوسری کو ذبح کرے گا تو بھی درست ہے۔ بشرطیکہ دوسری کی قیمت پہلی کے برابر ہو یا زیادہ ہو، اور اگر دوسری کی قیمت پہلی کی قیمت سے کمتر ہو تو زائد کا ضمان دے، اور اس کو خیرات کردے، اس میں کچھ فرق نہیں مالدار اور محتاج کا۔ اور بعضوں نے کہا کہ اگر قربانی مالداری کے سبب سے واجب ہوئی ہے تو اسی طرح کا جواب ہے جو مذکور ہو چکا اور اگر محتاجگی میں خریدنے کے سبب سے واجب ہوئی ہو تو دونوں قربانیوں کو ذبح کرے، یعنی دونوں قربانیوں کو ذبح کرنا واجب ہے اسی طرح ''طحطاوی'' میں ہے۔

مسئلہ: ......اگر قربانی گم ہوگئی یا چوری ہوگئی، سو اس نے دوسری قربانی خرید کی تو غنی پر ایک جانور کا قربانی کرنا واجب ہے، اور محتاج پر دونوں قربانیوں کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح ''درمختار'' میں ہے۔[1]

---

[1]......مفتیٔ اعظم پاکستان حضرۃ الاستاذ مولانا مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:
مسئلہ......قربانی کا جانور گم ہوا، اس کے بعد دوسرا خریدا، اگر قربانی کرنے والا امیر ہے تو ان دونوں جانوروں میں سے جس کو چاہے ذبح کرے، جبکہ غریب پر ان دونوں جانوروں کی قربانی واجب ہوگی۔
وضاحت......اگر کسی آدمی نے قربانی کے لئے جانور خریدا اور خریدنے کے بعد وہ جانور قربانی کرنے سے پہلے گم ہوجائے تو صاحب حیثیت آدمی پر قربانی کے لئے دوسرا جانور خریدنا ضروری ہے، کیونکہ اس

مسئلہ:......اگر قربانی کا جانور مر گیا تو مالدار پر دوسری قربانی اس کے سوا واجب ہے، نہ محتاج پر۔

ایک شریک مرجائے یا نصرانی ہوجائے یا صرف گوشت کی نیت ہو

مسئلہ:......اگر گائے یا اونٹ کے سات شریکوں میں سے ایک شریک مر گیا، اور میت کے وارثوں نے کہا کہ ذبح کرو میت کی طرف سے، اور اپنی طرف سے تو سب کی طرف سے قربانی صحیح ہوگی، اس واسطے کہ عبادت کا قصد سب کی طرف سے حاصل ہوا، اور اگر شریکوں نے میت کے وارثوں کی بلا اذن اس کو ذبح کیا تو شریکوں کی طرف سے بھی قربانی ادا نہ ہوگی۔ اس واسطے کہ ساتواں حصہ عبادت واقع نہ ہوا، یعنی جب بعض عبادت نہ ٹھہرا تو کل بھی عبادت نہ ہوا عدم تجزّی کے باعث (کی وجہ) سے۔ یہ ''درمختار'' میں ہے۔

پر قربانی شرعاً واجب تھی اور واجب ادا نہیں ہوا، جبکہ فقیر آدمی پر دوسرا جانور خریدنا اور قربانی کرنا لازم نہیں تھا، اس کے باوجود غریب نے دوسرا جانور بھی خرید لیا، اب اگر مالدار اور غریب ہر دو کا پہلا گم شدہ جانور مل جائے تو امیر پر صرف شرعی واجب (قربانی) کا ادا کرنا لازم ہے، جس جانور کو ذبح کردے کافی ہے، جبکہ غریب پر خود سے واجب کردہ جانوروں کی قربانی کرنا لازم ہے۔

اس کی تفصیل یوں ہے کہ امیر آدمی پر نصاب کی وجہ سے قربانی واجب تھی، اس نے وہ ادا کر دی، اس کے حق میں جانور متعین نہیں ہوا تھا اسے اختیار ہے کہ جس جانور کو چاہے ذبح کردے، جبکہ غریب آدمی پر قربانی لازم نہیں تھی، غریب نے از خود جانور خرید کر اپنے اوپر قربانی کو لازم کر لیا اور جو جانور اس نے خریدا وہ بھی متعین ہوگیا، اب پہلا جانور جو غریب کے حق میں قربانی کے نام سے متعین ہو چکا، اگر وہ گم ہوجائے تو اس کے بدلے دوسری قربانی لازم نہ تھی، اس کے باوجود غریب نے دوسرا جانور خرید کر اپنے اوپر قربانی لازم کر لی، اس بنا پر فقیر آدمی پر دوسری قربانی لازم ہوئی، لہذا غریب آدمی دونوں جانوروں کی قربانی کرے گا، بخلاف مالدار کے کہ اس پر صرف قربانی لازم ہے، جانور متعین نہیں ہے، دونوں جانوروں میں سے کسی ایک کی قربانی کردے تو کافی ہے۔ (''بینات'' ذوالحجہ ۱۴۳۳ھ نومبر ۲۰۱۲، ص ۵۶)

مسئلہ:......اگر چھ شریکوں کے ساتھ ساتواں شریک نصرانی ہو، یا فقط گوشت لینے کا ارادہ رکھتا ہو، تو ان میں کسی کی طرف سے قربانی ادانہ ہوگی، اس واسطے کہ خونریزی متجزی نہیں ہوتی، اسی طرح ''ہدایہ'' میں ہے۔ یہی حکم ہے باقی قربات کا شرکت پذیر میں، یعنی جب متقرب کے ساتھ وہ شخص شریک ہو جو قربت کا قصد نہیں رکھتا ہے تو عبادت ادانہ ہوگی۔ اور درصورت قربت عبادت ادا ہوگی، اگر چہ قربت کی جہت مختلف ہو، اس طرح پر کہ بعض شریک قربانی کا ارادہ کریں، اور بعض جزائے صید یعنی حرم کے شکار کا بدلہ، اور بعض ہدی حصار یعنی حج سے رک جانے کی، اور بعض کفارۂ احرام، اور بعض ہدی تطوع، اور بعض دم متعہ، یا قران کا ارادہ کریں، اور اسی طرح اگر بعض اپنے فرزند کے عقیقہ کا قصد کریں۔ ایسا بیان کیا ہے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے ''فوائد ضحایا'' میں۔ اور اس باب سے پہلے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ: قربانی واجب ہونے نے عقیقہ وغیرہا ہر ذبح کو منسوخ کر دیا، اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی نص سابق اس کے مفید ہے کہ نسخ تو فقط وجوب کی راہ ہے، والّا عقیقہ بھی قربت ہے، اور یہ مخالف ہے اس بحث کے جو شرنبلالی نے ذکر کیا ہے کہ عقیقہ مکروہ ہے۔ اسی طرح ''طحطاوی'' میں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ: عقیقہ کا قربت اور عبادت ہونا ماخوذ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے ثابت ہے، اور یہ جو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ: عقیقہ وغیرہا کو قربانی نے منسوخ کر دیا تو مطلب یہ ہے کہ عقیقہ واجب نہیں رہا، اس سے نفی استحباب یا اباحت کی لازم نہیں، اور اس کو مکروہ کہنا تو قول بے دلیل ہے، اس واسطے کہ عقیقہ احادیث صحیحہ معتمدہ سے ثابت ہے، اور اہل اسلام میں جاری ہے۔

تین آدمیوں کی قربانی خلط ملط ہوگئی تو

مسئلہ:......اگر تین شخصوں نے ایک ایک بکری قربانی کے واسطے خرید کی، ایک شخص نے دس

روپے کوخرید کی، اور دوسرے نے بیس روپے کو، اور تیسرے نے تیس روپے کوخرید کی، اور ہر بکری کی قیمت اس کے ثمن کے برابر ہے، پھر تینوں بکریاں اس طرح مختلط ہوگئیں کہ تینوں شخصوں سے کوئی شخص بھی اپنی خاص بکری کونہیں پہچانتا ہے، اور تینوں نے اس پر اتفاق کرلیا کہ ہرایک شخص ایک ایک بکری لے کرقربانی کرے، تو اس طرح قربانی کرنا کفایت کرے گا، اور تیس روپے والا بیس روپے خیرات کرے، اور بیس روپے والا دس روپے خیرات کرے، اوردس روپے والا کچھ خیرات نہ کرے۔اگر ہر شخص دوسرے کواذن دے کہ تو میری طرف سے قربانی کردے، تو اس کے واسطے قربانی کرنا کافی ہوگا اوراس پر کچھ خیرات کرنا واجب نہ ہوگا۔ چنانچہ اگرکوئی شخص غیر کی قربانی کوقربانی کرے بدون اس کے حکم کے تو اس پر تصدق لازم نہیں ہے۔''درمختار'' میں ہے۔تیس روپے والے پر بیس روپے کی خیرات اس احتمال سے لازم آئی کہ شاید اس نے وہ بکری قربانی کی ہو کہ جودس روپے سے خریدی گئی ہو، اوراسی احتمال سے بیس روپے والے پردس روپے کی خیرات لازم آئی، اوردس روپے والے پرقلت کا احتمال نہیں، لہٰذا اس پر کچھ تصدق نہیں ہے۔

مسئلہ:......اگر دوشخص غلط کار ہوئے اور ہر شخص نے اپنے ساتھی کی بکری ذبح کی، تو یہ قربانی صحیح ہے باعتبار استحسان کے بدون لازم ہونے تاوان کے، یعنی ہر شخص نے دوسرے کی بکری از راہ خطا اپنی ذات کی طرف سے قربانی کی، تو بدلیل صاحب ایضاح کے دونوں نے خطا کی ہو یا نہ کی ہو، ہر شخص دوسرے شخص کا وکیل ٹھہرے گا دلالت حال کے سبب سے، یعنی دونوں کوقربانی کرنا منظور تھا، سواس طرح سے بھی حاصل ہوا، اسی طرح ''ہدایہ'' میں ہے۔اور دونوں شخص باہم خلّت کی درخواست کریں، یعنی معاف کرڈالیں اگرقربانی کا گوشت کھایا اور نہ پہنچانا ہو پھر بعداس کے پہچانا ہو، اسی طرح ''ہدایہ'' میں ہے۔

مسئلہ:......اور اگر دونوں نے صورت مذکورہ میں بخل کیا اور معاف نہ کر دیا تو ہر شخص دوسرے شخص کے گوشت کی قیمت کا تاوان دے، اور ہر شخص قیمت کو خیرات کر دے، ''درمختار'' میں ہے۔

مسئلہ:......اور اشباہ میں پہلے قاعدۂ اوائل میں یہ مسئلہ ہے کہ: اگر ایک شخص نے جانور خرید کیا قربانی کرنے کی نیت سے پھر دوسرے شخص نے اس کو ذبح کر ڈالا بدون اس کے اذن کے، سو اگر مالک نے اس مذبوح کو لیا، اور اس سے تاوان نہ لیا، تو اس کے حق میں قربانی کفایت کر گئی، اور اگر اس کا تاوان لیا ذبح کرنے والے سے تو قربانی ادا نہ ہوگی، اور یہ اس صورت میں ہے جبکہ غیر شخص نے جانور کو اپنی طرف سے ذبح کیا ہوگا تو اس پر تاوان نہیں ہے۔

غصب کئے ہوئے جانور کی قربانی

مسئلہ:......قربانی صحیح ہے اگر ایک شخص نے بکری غصب کر کے قربانی کی، بشرطیکہ غاصب نے مغصوب منہ کو زندہ بکری کی قیمت کا تاوان دیا ہو۔ زندہ بکری کا ضمان اس واسطے لازم آیا کہ غاصب اس کا مالک ٹھہر گیا غصب کے وقت سے بطریق استناد کے، اگر چہ قربانی صحیح ہے لیکن غاصب گنہگار رہا۔ غصب سے توبہ اور استغفار لازم ہے۔ اس مسئلہ سے معلوم ہوا کہ تاوان کے بعد ذبیحہ حلال ہے۔ اور حرام پر بسم اللہ کہنے سے کفر لازم نہیں آتا ہے، بلکہ کفر لازم نہیں آتا جب تک کہ غصب کرنے کو حلال نہ جانے گا، اسی طرح ''طحطاوی'' میں ہے۔

مسئلہ:......بکری مغصوبہ کی قربانی صحیح ہوگئی، بسبب ظاہر ہو جانے بکری کے ملک کے تاوان دینے سے غصب کے وقت سے۔

امانت رکھے ہوئے جانور کی قربانی

مسئلہ:......قربانی صحیح نہیں امانت کی بکری کی، اگر چہ اس کے مالک کو تاوان بھی دے، اس

واسطے کہ تاوان کا سبب یہاں ذبح ہے، اور ملک تمام ہوتی ہے سبب کے تمام ہونے کے بعد، اور وہ سبب ذبح ہے، تو ذبح واقع ہوا اس کی غیر ملک میں۔

قربانی کے گوشت کی تقسیم

مسئلہ:......قربانی کرنے والا کھاوے اپنی قربانی سے، اور مقدور والے کو کھلاوے، اور ذخیرہ رکھے یہ بھی جائز ہے۔ اور مستحب یہ ہے کہ تہائی گوشت تصدق کرے، تہائی سے کم گوشت تصدق نہ کرے، اور ترک تصدق مستحب ہے عیال دار کے واسطے، ان پر کشائش کرنے کے لئے۔

مسئلہ:...... مستحب یہ ہے کہ اپنی قربانی سے کھائے، اور غیر کو کھلائے، اور افضل یہ ہے کہ تہائی گوشت خیرات کرے، اور تہائی میں اقارب اور دوستوں کی مہمانی کرے، اور تہائی اپنے واسطے اٹھار کھے۔ گوشت دینا غنی اور فقیر اور مسلم اور ذمی کو درست ہے۔

مسئلہ:...... اگر سب گوشت کو خیرات کرے تو جائز ہے، اور اگر سب گوشت اپنے واسطے ذخیرہ کرے اگرچہ تین دن سے زیادہ رکھے، تو بھی درست ہے۔

نابالغ اپنی قربانی کا گوشت خود کھائے

مسئلہ:......طفل یعنی بچہ نابالغ کھاوے اپنی قربانی سے [1] اور گوشت اٹھار کھا جائے بقدر اس کے حاجت کے اور جو گوشت باقی رہے بدل ڈالا جائے۔ اس چیز سے جس کے بعینہ ذات سے صغیر فائدہ حاصل کرے۔ چنانچہ کپڑا اور موزہ نہ اس چیز سے بدلنا چاہئے جس کے استہلاک سے فائدہ حاصل ہووے چنانچہ روٹی کھانا اور مانند اس کے۔

---

[1]......نابالغ پر قربانی واجب نہیں، اس کی تفصیل ص:۲۰۳/ پر گذر چکی ہے۔

نذر کی قربانی کا گوشت کھانا

مسئلہ:......اگر قربانی نذر مان کر اپنے او پر واجب کر لی ہو تو قربانی والے کو اس کا کھانا یا غنی کو کھلانا حلال نہیں ہے''عالمگیری'' میں ہے۔

قربانی خود ذبح کرے

مسئلہ:...... مستحب یہ ہے کہ قربانی کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرے اگر ذبح کرنا جانتا ہو، اور اگر ذبح کرنا نہ جانتا ہو تو ذبح کے وقت خود موجود ہو، اور غیر شخص کو اس کے ذبح کرنے کا امر کرے تا کہ ناواقف قربانی کو مردار نہ کر ڈالے۔ رسول خدا ﷺ نے جناب فاطمۃ الکبری رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا کہ: کھڑی ہو اور اپنی قربانی کے روبرو حاضر ہو، اس واسطے کہ تیری مغفرت ہوگی قربانی کے اول قطرے کے نکلتے ہی، اور یوں کہہ:

﴿اِنَّ صَلاتِی وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، لاشَرِیْکَ لَهٗ﴾ [۱]

جان رکھ اس کا گوشت اور خون تیرے ترازو میں رکھا جائے گا الخ۔

اہل کتاب و مجوسی کا قربانی ذبح کرنا

مسئلہ:......اہل کتاب کا ذبح کرنا قربانی کا مکروہ ہے۔ اور مجوسی کا ذبح کرنا حرام ہے۔ اس لئے کہ مجوسی ذبح کرنے کی لیاقت نہیں رکھتا ہے۔

....

[۱]......سورۂ انعام، آیت نمبر:۱۶۲/۱۶۳۔

ترجمہ:...... بیشک میری نماز' میری عبادت اور میرا جینا' مرنا سب کچھ اللہ کے لئے ہے' جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ (آسان ترجمہ، از: حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم)

قربانی کی کھال کے مسائل

مسئلہ:......قربانی کی کھال خیرات کرے یا اس سے مانند چھلنی اور جھولی اور مشک اور دسترخوان اورڈول بناوے، یا کھال کو بدلے اس چیز سے جس سے فائدہ حاصل ہوسکے اس کو باقی رکھے، چنانچہ مذکور ہو چکا یعنی مشک اورڈول وغیرہ سے بدل لے۔

مسئلہ: ......اور نہ بدلے قربانی کی کھال کو مستہلک چیز سے، یعنی جس سے فائدہ حاصل نہ ہوسکے بدون استہلاک کے، چنانچہ سرکہ اور گوشت اور مانند اس کے، چنانچہ روپے یا پیسے یا کوڑی۔

مسئلہ:......اگر قربانی کا گوشت یا چمڑا بیچا گیا مستہلک چیز سے یا روپیوں سے تو اس کے ثمن کو تصدق کردے، اور تصدق ثمن سے صحت بیع کا کراہت کے ساتھ حاصل ہوگا۔ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے روایت یہ ہے کہ بیع مذکور باطل ہے، اس واسطے کہ وہ مثل وقف کے ہے۔

مسئلہ: ......اگر کوئی قصاب کو قربانی کی کھال یا قربانی کا گوشت وغیرہ اس کی مزدوری میں دے تو یہ درست نہیں ہے۔ اس واسطے کہ مزدوری دینا قربانی سے اس کی بیع کے مانند ہے، اور یہ مسئلہ مستفاد ہوا ہے رسول خدا ﷺ کی اس حدیث سے کہ: جس نے اپنی قربانی کا چمڑا بیچا تو اس کی قربانی نہ ہوئی، کذا فی الہدایہ۔

مسئلہ:......قربانی کی اون اور بال نہ کترے ذبح کرنے سے پہلے، تا کہ اس سے فائدہ حاصل کرے، پھر اگر کترے تو اس کو خیرات کردے۔ اور قربانی پر سوار نہ ہو اور نہ اس پر کوئی چیز لادے، اور نہ اس کو کرایہ سے دے، سو اگر ایسا کوئی کرے تو اجرت کو خیرات کردے۔

....

دو جانور قربانی کیئے تو

مسئلہ:......اگر ایک شخص نے دو جانور قربانی کیئے تو دونوں قربانی ٹھہریں گے۔اور بعضوں نے کہا کہ: زیادہ گوشت والا جانور قربانی ٹھہرے گا۔

زیادہ قیمت والی قربانی افضل ہے

مسئلہ:......افضل قربانی زیادہ تر قیمت والی ہے،اور اگر قیمت میں دونوں برابر ہیں تو زیادہ گوشت والی افضل ہے،اور اگر گوشت میں برابر ہوں تو عمدہ گوشت کی قربانی افضل ہے، اور اگر سب کی قربانی کی تو سب فرض واقع ہوں گے۔جیسے نماز کے ارکان کہ ان میں سے فرض تو اسی قدر ہیں جن پر رکن کا نام بولا جائے، پھر جب نمازی نے ان کو طویل کر دیا۔ مثلاً تین آیتوں سے زیادہ قرأت کی یا پانچ یا سات بار رکوع اور سجود میں تسبیح کہی تو سب فرض ہی واقع ہوگا۔اور اس جگہ فرض سے مراد فرض عملی ہے،اسی طرح ''طحطاوی'' میں ہے۔

مامور نے قصداً بسم اللہ نہیں پڑھی تو اس پر قیمت واجب ہے

مسئلہ:......اگر قربانی کا جانور خرید کیا پھر ایک مرد کو اس کے ذبح کرنے کا امر کیا تو ذابح نے کہا: میں نے بسم اللہ کہنا قصداً ترک کیا،تو مامور پر اس کی قیمت دینی لازم ہوگی۔تاکہ امر کرنے والا اس قیمت سے اور قربانی خرید کرے، اور اس کو قربانی کرے، اور خیرات کر دے،اور آپ نہ کھائے، یہ اس وقت ہے کہ اگر نحر کے ایام باقی ہوں،اور اگر باقی نہ رہے ہوں تو اس کی قیمت تصدق کرے،اسی طرح ''درمختار'' میں ہے۔

معین ذابح پر بسم اللہ کا حکم

مسئلہ:......اگر ایک شخص نے قربانی کرنے کا ارادہ کیا،سو اپنا ہاتھ قصاب کے ہاتھ کے ساتھ

رکھا ذبح کرنے میں، اوراس کی مدد کی ذبح کرنے پر تو ہر شخص پر بسم اللہ کہنا بنا بر وجوب کے ہے، پھر اگر بسم اللہ کو ایک شخص بھی ترک کرے گا کہ ایک شخص کا بسم اللہ کہنا کفایت کرتا ہے تو ذبیحہ حرام ہوجائے گا۔

یہ چند مسائل قربانی کے عام فہم لکھے گئے تا کہ ہر ایک کو اس سے فائدہ حاصل ہو، اور دوسری کچھ غرض نہیں ہے۔ اگر اس میں کچھ خطا وخلل واقع ہوا ہوتو اس کو دامن اصلاح سے مزین فرماویں۔ اہل صلاح اور ناظرین پُرتمکین مجھ احقر کو اور اہل مدرسہ اشرفیہ کو دعاء خیر سے یاد فرماویں، فقط۔

﴿رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْم ، وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾

کتبہ: عبد من عباد اللہ خادم الطلبۃ

القاضی رحمۃ اللہ عفی عنہ

مہتمم دارالعلوم اشرفیہ عربیہ راندیر، ضلع سورت

نوٹ:......قانوناً صرف گائے کی قربانی ممنوع ہے، لہٰذا خیال رکھا جائے۔

ہنود کو خوش کرنے کے لئے گائے کا ذبح بند کرنا کیسا ہے؟

سوال :......کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ: ہنود کو خوش کرنے اور اتفاق پیدا کرنے کے خیال سے گائے کی قربانی، یا روزمرہ کے لئے گائے کا ذبح کرنا بند کرنا کیسا ہے؟ ہندوستان اور گجرات کی حالت ملاحظہ فرماتے ہوئے حکم شرع سے مطلع فرمائیے۔ بینوا بیانا شافیا توجروا، اجرکم اللہ اجرا وافیا۔

الجواب الوسیط بغیر افراط وتفریط :......محض ہنود سے اتفاق پیدا کرنے اور ان کو خوش کرنے کے لئے گائے کی قربانی کو موقوف کردینا، اور ہمیشہ کے لئے گائے کا گوشت ترک کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ گائے کا ذبح کرنا قربانی کے لئے ہو، یا محض کھانے کے لئے شعائر اسلام سے ہے، اور گائے کا ذبح نہ کرنا اور اس کے گوشت سے مذہبی حیثیت سے نفرت کرنا شعائر کفر سے ہے۔ اسلامی شعائر کو چھوڑ کر کفر کے شعائر کو اختیار کرنا، اور اس خیال سے خود ذبح گاؤ کو چھوڑ دینا، اور کسی کو ترغیب نہ دینا، بلکہ ترک ذبح گاؤ کی رغبت دلانا کہ مخالفین اسلام خوش رہیں، یہ مدارات ناجائز مداہنۃ فی الدین ہے۔ ہماری شریعت مطہرہ نے ہرگز اس کی اجازت نہیں دی۔ اور ذبح گاؤ کا اسلامی ذبیحہ بلکہ شعائر اسلام سے ہونا شرعی دلائل سے ثابت ہے، چنانچہ حق رب العزت نے قرآن شریف میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ط كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْن ، ثَمَانِيَةَ اَزْوَاجٍ مِنَ الضَّأْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ، نَبِّئُوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ، وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ﴾ [1]

---

[1]......سورۂ انعام، آیت نمبر: ۱۴۲/۱۴۳۔

ترجمہ:......اور مواشی میں اونچے قد کے اور چھوٹے قد کے جو کچھ اللہ نے تم کو دیا ہے کھاؤ، اور شیطان کے قدم بقدم مت چلو بلا شک وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔آٹھ نر اور مادہ یعنی بھیڑ میں دو قسم بکری میں دو قسم، آپ ﷺ کہئے کہ کیا اللہ تعالی نے ان دونوں نروں کو حرام کہا ہے؟ یا دونوں مادہ کو؟ یا اس کو جس کو دونوں مادہ پیٹ میں لئے ہوں؟ تم مجھ کو کسی دلیل سے تو بتلاؤ اگر سچے ہو، اور اونٹ میں دو قسم اور گائے میں دو قسم۔(پ:۸،سورۂ انعام،رکوع:۴)

اس آیت سے حلت گاؤ کی بنص صریح ثابت ہے، کسی اہل حق کو چون و چرا کی گنجائش نہیں۔اور رسول پاک ﷺ نے خود ازواج مطہرات کی جانب سے گائے کی قربانی کی ہے۔

”عَنْ جَابِرٍ رضی اللّٰہُ عنه قَالَ : ذَبَحَ رسول اللّٰہِ صلی الله علیه وسلم عن عائشة بقرة رواه مسلم۔[۱]

وعن جابر رضی اللّٰہُ عنه قال : نحر النبی صلی الله علیه وسلم عن نسائه بقرة فی حجته ، رواه مسلم۔[۲]

اور رسول پاک ﷺ نے گائے کی قربانی کی عام اجازت بھی دی ہے، اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے عام طور پر گائے کی قربانی کی ہے، چنانچہ ”ترمذی ونسائی اور ابن ماجہ“ میں ہے:

عن ابن عباس رضی اللہ عنه قال : کنا مع رسول اللّٰہِ صلی الله علیه وسلم فی سفر، فحضر الاضحی ، فاشترکنا في البقرة سبعة وفی البعیر عشرة ۔[۳]

---

[۱]......مسلم ص۴۲۴ج۱، باب جواز الاشتراک فی الهدی ، الخ۔

[۲]......مسلم شریف کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:” نحر رسول الله صلی الله علیه وسلم عن نسائه “ وفی روایة :” عن عائشة بقرة فی حجته“۔(مسلم ص۴۲۴ج۱، باب جواز الاشتراک فی الهدی)

[۳]......مشکوة، الفصل الثانی، باب الاضحیة۔بقیہ حاشیہ ص۲۳۰ پر:

وعن جابر رضی اللّٰه عنه انّ النبی صلی الله علیه وسلم قال :((البقرة عن سبعة والجزور عن سبعة)) ، رواه مسلم۔[1]

ترجمہ:......حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ: ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے پس قربانی کے ایام آ گئے تو ہم گائے میں سات آدمی شریک ہوئے ،اور اونٹ میں دس۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: گائے سات آدمیوں کی طرف سے اور اونٹ سات آدمیوں کی طرف سے۔ (مسلم)

اور رسول خدا ﷺ کے زمانے میں عام طور پر گائے کے ذبح کرنے اور اس کے گوشت کھانے کا تعامل بھی تھا۔ چنانچہ ''صحیح مسلم'' میں ہے:

عن عائشة رضی اللّٰه تعالیٰ عنها قالت : اتی النبی صلی الله علیه وسلم بلحم بقر تصدق به علیٰ بَریرة ، فقال : هو لها صدقة ولنا هدیة ۔[2]

پس جب کہ جواز قربانی کا شعائر اسلام سے ہے اور رخصت عام شارع کی طرف سے ہے تو پھر اس کو ترک کرنا باعث گمراہی کا اور تابعداری کرنا خطوات شیطان کا ہے، ہاں گائے کی قربانی کرنے میں محض ہنود کے عناد کا اعتقاد رکھنا اور ان کی ضد پر قربانی کرنا

''وفی البعیر عشرة'' کی وجہ سے جمہور کے خلاف امام اسحٰق اونٹ میں دس افراد کی شرکت کا موقف اختیار کرتے ہیں۔ جمہور کی طرف سے اس حدیث کا جواب یہ ہے کہ: یہ حدیث صریح نہیں ہے، اس لئے کہ مسافر پر قربانی واجب نہیں ہے۔ علامہ مظہر نے اس حدیث کو منسوخ قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ روایت موقوف ہے، لہٰذا جمہور کی روایات صحیحہ کے معارض نہیں ہو سکتی۔

(مرقاۃ ۳/۳۱۲۔ بذل ۹/۵۶۱۔ الرفیق الفصیح ص۳۷۲ ج۹)

[1]......مسلم شریف ص۴۲۴ ج۱، باب جواز الاشتراک فی الهدی ، کتاب الحج۔

[2]......متفق علیہ، مشکوۃ، الفصل الاول، کتاب الزکوة ، باب من لا تحل له الصدقة۔

خطا ہے، چنانچہ مولوی عبدالحی صاحب لکھنوی (رحمہ اللہ) نے اپنے ''مجموعۂ فتاویٰ'' میں تصریح کی ہے۔[1] واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ عبد من عباد اللہ خادم الطلبۃ
القاضی رحمۃ اللہ علیہ عفی عنہ

الجواب حسن جید
محمد مطیع اللہ
صدر مدرس مدرسہ اشرفیہ، راندیر

الجواب صحیح
عبد الحفیظ عفا اللہ عنہ
مدرس مدرسہ اشرفیہ، راندیر

الجواب صحیح والمجیب مصیب
امیر احمد باسنوی
خادم دار العلوم اشرفیہ راندیر، ضلع سورت
۲۴/ جولائی ۱۹۲۰ء

---

[1]......مجموعۃ الفتاوی ص ۲۴۸ ج ۳، کتاب الاضحیہ۔

راقم الحروف کے جد بزرگوار حضرت مولانا مفتی مرغوب احمد صاحب لاجپوری رحمہ اللہ کے فتاوی میں اس موضوع پر ایک تفصیلی فتوی ہے: موقع کی مناسبت سے اس کو یہاں نقل کرنا مناسب معلوم ہوا۔

گائے کو ماں کی طرح سمجھنا اور اس کا گوشت کھانے سے روکنا

س:......کوئی مسلمان علانیہ بطور نصیحت اور اشتہار کے ذریعہ گائے کو اپنے حقیقی ماں باپ کی طرح سمجھنے اور اس پر رحم و ہمدردی کرنے اور اس کے گوشت کھانے سے مسلمانوں کو منع کرے تو ایسے شخص پر شرعا کیا حکم ہے؟

ج:......حامدا ومصليا ، الجواب وبالله التوفيق: گائے کا اسلامی ذبیحہ ہونا اور گاؤکشی وگاؤ خوری کا مسلمانوں کا اسلامی طریقہ ہونا، بلکہ شعائر اسلام سے ہونا شرعی دلائل سے ثابت ہے۔قال الله تعالى: ﴿وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشاً ط كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾۔[1]

﴿ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ﴾الى آخر الآية۔

﴿وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ﴾۔[2]

اس آیت سے گاؤ کی حلت بنص صریح ثابت ہے،اور رسول اللہ ﷺ نے خود ازواج مطہرات کی جانب سے گائے کی قربانی کی ہے۔

---

[1]......سورۂ انعام،آیت ۱۴۲۔ پارہ ۸۔
ترجمہ:......اور مواشی میں سے اونچے قد کے اور چھوٹے قد کے جو کچھ اللہ تعالی نے تم کو دیا ہے کھاؤ اور شیطان کے قدم بقدم مت چلو بلاشک وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔(از حکیم الامت حضرت تھانویؒ)

[2]......سورۂ انعام،آیت ۱۴۴، پارہ ۸۔
ترجمہ:......اور اونٹ میں دو قسم اور گائی (بھینس) میں دو قسم۔

”عن جابر قال : ذبح رسول الله صلى الله عليه وسلم عن عائشة بقرة“رواه مسلم۔[۱]

وعن جابر : نحر النبی صلى الله عليه وسلم عن نسائه بقرة فی حجته“۔[۲]

اورحلت گاؤپر امت مسلمہ کا اجماع ہے،کسی اہل حق کواس میں اختلاف نہیں۔[۳]

عن انس رضی الله عنه قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :((من صلى صلوتنا واستقبل قبلتنا واكل ذبيحتنا فذلک المسلم الذی له ذمّة الله وذمّة رسوله فلا تُخفِروا الله فی ذمّته))،رواه البخاری۔[۴]

اس حدیث میں”واكل ذبيحتنا“کےارشاد سے یہ مقصود ہے کہ خاص اسلامی ذبیحہ کا کھانا مثل ادائے اسلامی نماز ومثل استقبال اسلامی قبلہ کے شعائر اسلام سے ہے،ان میں سے کسی کوکسی مصلحت سیاسی یا مدارات اہل ہنود کی خاطر نہیں چھوڑ سکتے اور اللہ ورسول ﷺ کی ذمہ داری ان تینوں عملوں کے ساتھ وابستہ ہے،اگرچہ وہ دونوں عملا فرض ہیں اور اکل ذبیحہ فرض نہیں،مگر شعائر اسلام ہونے کی حیثیت میں سب مساوی ہیں۔اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ گاؤ کا ذبح کرنا اوراس کا گوشت کھانا محض جائز ومباح ہی نہیں ، بلکہ اسلامی شعائر سے ہے اور اسلامی شعار کا چھوڑ دینا یا چھوڑنے کی دوسروں کوترغیب دینا ممنوع وقبیح ہے،اس لئے ہنود کی خوشامداوران کوخوش کرنے کے لئے گائے کی قربانی کا ترک کرنا یامطلقا ذبح کو بند کرنا اورلوگوں کومشورہ دینا ہرگز جائز نہیں،اس لئے کہ ذبح گاؤ کا

[۱]......مسلم ص۴۲۴ ج۱، باب جواز الاشراک فی الهدی ، الخ۔

[۲]......مسلم شریف کی روایت کےالفاظ یہ ہیں:” نحر رسول الله صلى الله عليه وسلم عن نسائه“ وفی رواية :”عن عائشة بقرة فی حجته“۔(مسلم ص۴۲۴ ج۱، باب جواز الاشراک فی الهدی)

[۳]......ويحل اكلها (ای البقرة) وشرب البانها بالاجماع۔(حیوۃ الحیوان اردو ص۴۴۶ ج۱)

[۴]......بخاری ص۶۵ ج۱، باب فضل استقبال القبلة۔

ترک شعار کفار ہے، اور مسلمانوں کا ترک کرنا کفر کے شعار کی ترویج میں امداد و اعانت کرنا ہے، پس جو شخص اس میں سعی کرنے والا ہوگا وہ ایک شعار اسلام کے مٹانے اور شعار کفر کے رواج دینے اور گاؤ پرستی اور اس کی عظمت کا عقیدہ مسلمانوں کے دلوں میں جمانے اور جس کو خدا اور رسول ﷺ نے حلال کیا ہے اس کو عملاً حرام کرنے کا مجرم ہوگا۔

شریعت محمدیہ میں بہ نسبت اور جانوروں کے گاؤ کی کچھ بھی عظمت ثابت نہیں، بلکہ مثل اور حلال جانوروں کے یہ بھی ایک حلال جانور ہے، جو مسلمان اس کی عظمت کا خیال کرے اور گاؤ کو ماں باپ کی طرح سمجھنے، اس پر رحم کرنے، اس کے ساتھ ہمدردی کرنے اور اس کے گوشت کھانے سے پرہیز کرنے کا مشورہ دے، اس کے اسلام میں فتور ہے، لہذا مسلمان کو ایسے فعل سے احتراز واجب ہے۔

ایک مسلم کی اسلامی شان یہ ہونی چاہئے کہ وہ قانون الٰہی کے تابع ہو، اور قانون الٰہی غیر مسلموں کی رضا مندی کی خاطر ترک گاؤ کشی کی اجازت نہیں دیتا، لہذا ایسے کاموں میں مسلمانوں کو ہندوؤں کی موافقت جائز نہیں ہے، اگر وہ اس کے خلاف کریں گے تو آخرت میں سخت سزا کے مستحق ہوں گے، اور دنیا میں جو کچھ رسوائی و ذلت ہوگی وہ الگ ہے۔

سخت افسوس کی بات ہے کہ اگر خدا کسی مسلمان کو دنیوی وجاہت وعزت یا کوئی عہدہ عطا کرتا ہے اور کچھ لوگ اس کو بڑا ماننے لگتے ہیں تو وہ حمایت اسلام کرنے کی جگہ پہلا وار اسلام پر کرتا ہے، اور اس کی شاخیں کاٹ کر پھینکنا شروع کرتا ہے، اور اس کی جڑ اکھاڑنے کی کوشش کرتا ہے، بخلاف ہندوؤں کے کہ جب ان کو اپنی قوم میں مقبولیت ہوتی ہے تو وہ مخالفت سے یا موافقت سے جس طرح بن پڑتا ہے اپنے مذہب کو تقویت پہنچانے کی فکر کرتے ہیں، لہذا مسلمانوں کو خدا و رسول ﷺ سے شرمانا چاہئے اور ہرگز کوئی کاروائی

اسلام کے خلاف نہ کرنی چاہئے۔ حقیقی عزت آخرت کی عزت ہے جو خدا کو خوش رکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ہندوؤں کی خوشامد اور ان کو خوش رکھنے کی خاطر دین برباد کرنا حماقت ہے۔ ﴿اَیَبْتَغُوْنَ عِنْدَ هُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعاً﴾ ۔[1]

اور ارشاد باری ہے:

﴿یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِیُرْضُوْكُمْ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ﴾ ۔[2]

اور ارشاد باری ہے: ﴿یَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنْ تَرْضَوْ عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَرْضٰی عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ﴾ ۔[3]

ان دونوں آیتوں میں تصریح ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ کو ناراض کر کے جب مسلمانوں کا راضی کرنا بھی موجب عتاب وعقاب ہے، تو اللہ ورسول اللہ ﷺ کو ناراض کر کے کافروں کو راضی کرنا تو کس طرح موجب عتاب وعقاب نہ ہوگا، اس پر مسلمانوں کو غور کرنا چاہئے۔

قال الله تعالى: ﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ

[1] ......سورۂ نساء، آیت ۱۳۹، پارہ ۵۔
ترجمہ: ......کیا ان کے پاس معزز رہنا چاہتے ہیں سو اعزاز تو سارا خدا کے قبضہ میں ہے۔

[2] ......سورۂ توبہ، آیت ۶۲، پارہ ۱۰۔
ترجمہ: ......یہ لوگ تمہارے سامنے (جھوٹ) قسمیں کھاتے ہیں تا کہ تم کو راضی کر لیں (جس میں مال و جان محفوظ رہے) حالانکہ اللہ اور اس کا رسول (ﷺ) زیادہ حق رکھتے ہیں کہ اگر یہ لوگ سچے مسلمان ہیں تو اس کو راضی کریں۔

[3] ......سورۂ توبہ، آیت ۹۶، پارہ ۱۱۔
ترجمہ: ......یہ اس لئے قسمیں کھاویں گے کہ تم ان سے راضی ہو جاؤ سو اگر تم ان سے راضی بھی ہو جاؤ تو (ان کو کیا نفع کیونکہ) اللہ تعالیٰ تو ایسے شریر لوگوں سے راضی نہیں ہوتا۔

الشَّيۡطَانِ اِنَّهٗ لَكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ﴾ ۔[۱]

تفسیر درالمنثور میں اس کے شان نزول [۲] بتلانے کے بعد لکھا ہے کہ: اس آیت میں یہ حکم ظاہر کیا گیا ہے کہ اسلام لانے کے بعد شعار یہود کا اتباع خلاف اسلام اور شیطان کا اتباع ہے، گو وہ اتباع صرف درجۂ عمل میں ہو نہ کہ درجۂ اعتقاد میں۔[۳]

پس جب کہ اسلام کے بعد یوم السبت کی عملی تعظیم یعنی اس روز قصداً مچھلی کا شکار نہ کرنا خلاف اسلام اور اتباع شیطان ہوا، حالانکہ تعظیم سبت ایک وقت میں مامور من اللہ رہ چکی

۱......سورۂ بقرہ، آیت: ۲۰۸، پارہ۲۔

ترجمہ:......اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو اور (فاسد خیالات میں پڑ کر) شیطان کے قدم بقدم مت چلو واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

۲......شان نزول کی روایت یہ ہے: اخرج ابن جرير عن عكرمة في قوله: ﴿يَاۤيُّهَا الَّذِيۡنَ آمَنُوا ادۡخُلُوۡ فِى السِّلۡمِ كَآفَّةً﴾ قال انزلت في ثعلبة وعبد الله بن سلام وابن يامين واسد واسيد ابني كعب و سعيد بن عمرو قيس بن زيد، كلهم من يهود، قالوا: يا رسول الله! يوم السبت يوم كنا نعظمه فدعنا فلنسبت فيه، وان التوراة كتاب الله فدعنا فلنقم بها بالليل فنزلت۔ (تفسیر درمنثور ص۴۳۳ ج۱)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ اس آیت کے شان نزول میں تحریر فرماتے ہیں: حضرت عبد اللہ بن سلام وغیرہ جو پہلے علماء یہود سے تھے اور اس مذہب میں ہفتہ کا روز معظم تھا اور اونٹ کا گوشت حرام تھا۔ ان صاحبوں کو بعد اسلام یہ خیال ہوا کہ شریعت موسوی میں ہفتہ کی تعظیم واجب تھی، اور شریعت محمدیہ میں اس کی بے تعظیمی واجب نہیں، اسی طرح شریعت موسویہ میں اونٹ کا گوشت کھانا حرام تھا اور شریعت محمدیہ میں اس کا کھانا فرض نہیں، سو اگر ہم بدستور ہفتہ کی تعظیم کرتے رہیں اور اونٹ کا گوشت باوجود حلال اعتقاد رکھنے کے صرف عملاً ترک کردیں، تو شریعت موسویہ کی رعایت ہو جاوے، اور شریعت محمدیہ کے بھی خلاف نہ ہوگا، اور اس میں خدا تعالیٰ کی زیادہ اطاعت اور دین کی زیادہ رعایت معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس خیال کی اصلاح فرمائی۔ (معارف القرآن ص۴۴۲ ج۱)

۳...... لم اجده في تفسير الدر المنثور تحت هذه الآية۔

ہے، ۱؎ تو ترک گاؤکشی بقصد موافقت ہنود و تعظیم گاؤ کیسے جائز ہوسکتی ہے، لہذا اگر کوئی ایک شخص بھی گاؤ کی تعظیم و ہنود کی رضامندی کی خاطر گاؤکشی، گاؤخوری چھوڑے گا تو سخت گنہگار ہوگا، چہ جائیکہ تمام مسلمان گاؤکشی چھوڑ کر عملاً ہندو ہو جائیں، مسلمانوں کو ہرگز ایسی جرأت نہ کرنی چاہئے۔ ۲؎ واللہ تعالی اعلم وعلمه احکم و اتم

۱؎......﴿ وقلنا لهم لا تعدوا فی السبت ﴾۔(سورۂ نساء، آیت ۱۵۴، پارہ ۶)
ترجمہ:......اور ہم نے ان کو یہ حکم دیا تھا کہ یوم ہفتہ کے بارے میں تجاوز مت کرنا۔
۲؎......ذبح گاؤ کے سلسلہ میں مزید تفصیل کے لئے دیکھئے! امداد الفتاوی ص ۵۷۶ ج ۳۔

قربانی کے چند اہم مسائل

حجاج کی قربانی میں ایسے شخص کی شرکت جس پر وجوب قربانی کا وقت ابھی تک نہ ہوا ہو۔ وکیل کی عید نہیں ہے اور مؤکل کی ہے تو وکیل، مؤکل کی قربانی کر سکتا ہے؟۔قربانی کی صحت کے لئے قربانی کرنے والے کی جگہ کا اعتبار ہے یا جانور کے ذبح ہونے کی جگہ؟۔اہل برطانیہ کی قربانی ہند و پاک میں جب تک برطانیہ میں صبح صادق طلوع نہ ہو وہاں تک درست نہیں۔اصیل کے یہاں قربانی کے دن ختم ہو چکے ہوں اور وکیل کے یہاں باقی ہوں تو۔قربانی کے دن گذر گئے اور رقم رہ گئی تو وکیل خود صدقہ کر سکتا ہے؟ جیسے اہم و چند مفید و کار آمد مسائل کا اضافہ۔

مرغوب احمد لاجپوری

ناشر: جامعۃ القراءات، کفلیتہ

حجاج کی قربانی میں ایسے شخص کی شرکت جس پر وجوب قربانی کا وقت ابھی تک نہ ہوا ہو

سوال:...... ہندو پاک کے رہنے والے ایک شخص نے اپنی واجب قربانی سعودی عرب بھیجی، وہاں حجاج نے اپنی قربانی کے ساتھ اونٹ یا گائے میں اس کا ایک حصہ بھی کرلیا، سعودی عرب میں اس سال ہندو پاک سے دو دن پہلے عید الاضحیٰ تھی، اب اس آدمی کی قربانی تو صحیح نہیں ہوئی (کیونکہ وقت سے پہلے اس کی قربانی ہو رہی ہے، جیسا کہ دار العلوم کا فتوی ہے) تو کیا دوسرے شریک کی قربانیاں درست ہوگئیں یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:......صورت مسئولہ میں ہند و پاک کے رہنے والے شخص کی طرف سے تو قربانی نہیں ہوئی، تاہم چونکہ اس کے وکیل کی نیت تقرب کی تھی، اس لئے یہ قربانی وکیل کی طرف سے نفلی ادا ہوگئی اور باقی شرکاء کی بھی درست ہوگئی۔

واضح رہے کہ یہ جواب اصول وقواعد کی روشنی میں لکھا گیا ہے، البتہ بہتر یہی ہے کہ باقی شرکاء بھی احتیاطا اپنی اپنی قربانی کا اعادہ کریں، یعنی ایک متوسط بکرا یا بکری کی قیمت صدقہ کریں۔ واللہ سبحانہ وتعالی اعلم

محمد یعقوب عفا اللہ عنہ

دار الافتاء جامعہ دار العلوم کراچی

۲۲ ؍صفر الخیر ۱۴۳۳ھ مطابق ۱۷ ؍جنوری ۲۰۱۲ء

الجواب صحیح
بندہ عبد الرؤف غفرلہ

الجواب صحیح
احقر محمود اشرف غفرلہ

باسمہ تعالی

حضرت مولانا مفتی اسماعیل صاحب کچھولوی دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته

سوال:...... ہمارے یہاں (برطانیہ میں) دو قصبے قریب قریب ہیں: ایک ڈیوز بری' دوسرا باٹلی۔سوال یہ ہے کہ باٹلی میں عیدالاضحیٰ مثلا پیر کو ہو اور ڈیوز بری میں اتوار کو۔اس صورت میں قربانی کے متعلق چند سوالات کے جوابات مطلوب ہیں:

سوال:۱...... باٹلی کا تاجر جن کے یہاں عید نہیں ہے' وکیل بن کر ڈیوز بری والوں کی قربانی اپنے یہاں (باٹلی میں) کرے تو یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟

سوال:۲...... باٹلی کا تاجر جن کے یہاں عید نہیں ہے' وکیل بن کر ڈیوز بری والوں کی قربانی باٹلی کے باہر کسی ایسی بستی میں جہاں پر عید ہے جا کر کرے' تو صحیح ہے یا نہیں؟

سوال:۳...... باٹلی کا تاجر جن کے یہاں عید نہیں ہے' وکیل بن کر ڈیوز بری والوں کی قربانی کسی ایسی جگہ جا کر کرے جہاں پر مسلمان آبادی کے نہ ہونے کی وجہ سے عید و جمعہ نہ ہوتی ہو تو' یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟۔اگر اس علاقہ میں باٹلی کے تاجر کے ساتھ کچھ اور مسلمان عید کی نماز کے وقت جمع ہو جائیں اور (باٹلی کے تاجر کے علاوہ دوسرے مسلمان) عید کی نماز پڑھ کر ڈیوز بری والوں کی قربانی کرے تو درست ہے یا نہیں؟

سوال:۴...... باٹلی کا تاجر جن کے یہاں عید نہیں ہے' وکیل بن کر ڈیوز بری والوں کی قربانی کسی ایسی بستی میں جہاں رویت ہلال کے اختلاف کی وجہ سے مختلف دنوں میں عید ہوتی ہو' جا کر کرے تو ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ یوسف ساچا عفی عنہ

۱۷/ذی قعدہ ۱۴۲۹ھ مطابق ۱۶/نومبر ۲۰۰۸ء

وکیل کی عید نہیں ہے اور مؤکل کی ہے تو وکیل، مؤکل کی قربانی کر سکتا ہے؟

الجواب:......و باللہ التوفیق ، حامدا و مصلیا و مسلما: قربانی کے دنوں میں جانور کی قربانی کرنا اللہ تعالی کے یہاں بہت محبوب عمل ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

عن عائشة رضی الله عنها ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال : ((ما عمل آدمی من عمل يوم النحر احب الى الله من احراق الدم)) الخ۔ (ترمذی شریف ص ۲۷۵)

قربانی میں جانور کو ذبح کرنے میں جو ثواب ملتا ہے اس میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ یہ فضیلت صرف قربانی کے دنوں کے لئے ہے، قربانی کے دن سے پہلے یا بعد میں جانور ذبح کرنے میں یہ فضیلت اور ثواب نہیں ہوگا، اسی لئے فقہاء نے اس میں تفصیل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ایک تو ہے شرطِ وجوب، یعنی مکلّف پر قربانی کب واجب ہوگی؟ تو اس کے لئے لکھا ہے کہ: " واما وقت الوجوب فايام النحر فلا تجب قبل دخول الوقت " الخ۔ یعنی ایام النحر کا وقت آنے سے پہلے قربانی واجب نہیں ہوگی۔

(بدائع ص ٦٦ ج ۴)

''ہدایہ'' میں لکھا ہے کہ:''وقت الاضحية يدخل بطلوع الفجر من يوم النحر''

(ہدایہ ص ۴۴۵)

دوسرا ہے وقت ادا، یعنی قربانی ادا کرنے کا وقت۔ اس میں تفصیل ہے کہ اس جگہ پر عید الاضحیٰ کی نماز ادا ہوتی ہے کہ نہیں؟ اگر عید الاضحیٰ کی نماز ہوتی ہے تو اس جگہ پر عید کی نماز ادا کرنے کے بعد قربانی کرنا واجب ہوگا، اور اگر عید کی نماز اس بستی میں ہونے پہلے قربانی کردی گئی تو وہ قربانی درست نہیں ہوگی۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : ((ان اول ما يبدأ به في يومنا هذا ان نصلی

ثم نرجع فننحر، من فعله فقد اصاب سنتنا، ومن ذبح قبل فانما هو لحم قدّمه لاهله ليس من النسک فی شئ)) الخ ۔(۸۳۲ج۲)

اوراگروہ ایسی جگہ ہے کہ چھوٹی بستی ہونے کی وجہ سے عید کی نماز نہیں پڑھی جاتی تو ایسی جگہ پر یوم النحر کی صبح صادق کے بعد قربانی کرنا درست ہوگا۔

وقد قال قاضی خان : فاما اهل السواد والقری والرباطات عندنا یجوز لهم التضحیة بعد طلوع الفجر ، اھ۔(شامی ص۴۶۱ج۱)

عیداور رؤیت ہلال اورایسے ہی دوسرے مسائل کے لئے ہمارے اندر اتحاد اور اتفاق ہوتا، اور دینی احکامات پر عمل کرنے کا صحیح جزبہ ہوتا، تو ایسے بلاد غیر میں کسی ایک مرکز پر ہم سب توحید پرست جمع ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا، مگر ہماری عصبیت' نفس پرستی اور انانیت ہمیں کسی ایک مرکز پر جمع ہی نہیں ہونے دیتی، اس لئے ہر شہر بلکہ ہر گھر میں متعدد عیدیں منائی جارہی ہیں، اور ایک دوسرے کی اتباع کرنے کے لئے کوئی تیار نہیں ۔ایسی حالت میں ہمارے لئے شہر کی چاند کمیٹی یا مسجد کی کمیٹی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، اورجیسا کہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے لکھا:

" فلو الولاة کفارا یجوز للمسلمین اقامة الجمعة ویصیر القاضی قاضیا بتراضی المسلمین " اھ۔(ص۱۴ج۳)

''کتاب الفتاوی'' میں لکھا ہے کہ:اس میں کمیٹی کا فیصلہ ہر شخص کے لئے واجب العمل ہے، اوراعلان سلطان کے درجہ میں ہے، اوران حدود کے باہر کے لوگوں کے لئے محض ایک خبراوراطلاع ہے۔(ص۳۷۸ج۳)

''جدید فقہی مسائل'' میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے (ص۳۵ج۲) طویل بحث

کے بعدلکھا ہے کہ :مسلمانوں کی وحدت‘ انتشار سے حفاظت‘ دین وشریعت کی حرمت اور ہر طبقہ کے علماء اور ارباب حل وعقد کے وقار واعتبار کی برقراری کے لئے علماء دین اور خادمین شریعت اتنی فراخ چشمی اور کشادہ قلبی کے لئے بھی تیار نہیں؟؟؟

آپ نے جوسوال پوچھا ہے مذکورہ تفصیل کے بعداس کا جواب یہ ہے کہ ڈیوزبری شہر والوں کے لئے کہ انہوں نے چاند کے ثبوت کے لئے جو ذرائع متعین کئے ہیں‘ ان کو سامنے رکھ کر وہاں کے ذمہ داروں نے (کمیٹی والے یا مسجد کے منتظمین نے) اعلان کی وجہ سے اس دن کو عید الاضحیٰ اور یوم النحر مانا ہے تو اس دن کی صبح صادق کے وقت وہاں کے رہنے والے صاحب نصاب باشندوں پر قربانی واجب ہوگی ،لیکن اس جگہ عید کی نماز ہوتی ہے‘ اس لئے وہاں عید کی نماز پڑھنے سے پہلے قربانی صحیح نہیں ہوگی۔اس لئے ڈیوزبری والے‘ اور اس کے مضافات میں رہنے والے ان کے عید الاضحیٰ کے دن عید کی نماز کے بعد خود بھی قربانی کر سکتے ہیں اور کسی کو وکیل بنا کر اپنی قربانی بھی کرواسکتے ہیں، اگر کوئی چھوٹا گاؤں ایسا ہے کہ وہاں کے حل وعقد ذمہ دار لوگوں نے اس اعلان کی وجہ سے یوم النحر مان لیا ہے، مگر چھوٹی بستی ہونے کی وجہ سے عید کی نماز نہیں ہوتی تو یوم النحر کی صبح صادق کے بعد وہاں قربانی کرنا درست ہوگا۔

باٹلی والوں کے یہاں imws اور رابطہ علماء اور مساجد کے تمام امام صاحبوں کے اتفاق اور تحقیق کے مطابق یہ دن یوم النحر نہیں ہے،اور ۹/ذی الحجہ یا یوم عرفہ ہے،اس لئے مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق تمام باٹلی والوں کو یہ فیصلہ ماننا ضروری ہوگا،اور انفرادی رائے پر عمل کرنا خلاف شرع ہوگا،اور یہ دن یوم عرفہ ہونے کی وجہ سے اس جگہ میں یا باٹلی کے حدود میں جو سلاٹر ہاؤس ہیں ان میں باٹلی والوں کا یا ڈیوزبری والوں کا قربانی کرنا صحیح نہیں ہوگا۔

جواب:۲......باٹلی کا تاجر اجیر بن کر یا وکیل بن کر ڈیوزبری والوں کی قربانی باٹلی کی حدود کے باہر ایسی بستی میں جہاں یوم النحر ہے' قربانی کرتا ہے تو یہ قربانی درست ہے، کیونکہ قربانی کی صحت کے لئے یوم النحر کا ہونا شرط ہے، اجیر یا وکیل کے لئے یوم النحر کی شرط نہیں، بلکہ ذبح کرنے والے کا اہل ہونا کافی ہے، جیسا کہ شامی (ص۴۷۴ج۱) میں ہے: " ولو امر المسلم کتابیا بان یذبح اضحیتہ جاز " الخ۔

جواب:۳......ایسی بستی جہاں مسلم آبادی نہیں ہے اور اس وجہ سے وہاں جمعہ وعیدین نہیں ہوتی' اور غیر مسلم آبادی قریہ کبیرہ کے درجہ میں ہے، وہاں ڈیوزبری کے چند آدمی جا کر جنہوں نے معتبر طرق سے اعلان کو مان کر یوم النحر مانا ہے' عید کی نماز کسی جگہ پڑھ کر قربانی کریں تو یہ بھی درست ہے۔

جواب:۴......کسی ایسی بستی جہاں کے باشندے مختلف ہیں' کچھ لوگ یوم النحر مان رہے ہیں، اور کچھ لوگ یوم النحر کے منکر ہیں تو چونکہ وہاں کے لوگوں کے نزدیک بھی یوم النحر ہے، اس لئے ڈیوزبری والوں کی قربانی صحیح ہو جائے گی، کیونکہ ذبح کرانے والے کے یہاں یوم النحر ہے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ العبد: اسماعیل کچھولوی غفرلہ

یکم ذی الحجہ ۱۴۲۹ھ

۲۰۰۸/۱۲/۱

قربانی کی صحت کے لئے قربانی کرنے والے کی جگہ کا اعتبار ہے یا جانور کے ذبح ہونے کی جگہ کا؟

جس پر قربانی واجب ہے اس نے اپنی رقم دوسرے کسی ملک بھی بھیجی کہ اس کی طرف سے قربانی کردی جائے، اب سوال یہ ہے کہ جس جگہ رقم بھیجی ہے وہاں عید ایک یا دو دن پہلے ہے تو کیا اس کی قربانی ایک یا دو دن پہلے والی جگہ پر عید کے دن صحیح ہوجائے گی؟ مثلا ہندو پاک کے کسی شخص نے اپنی قربانی کی رقم سعودی عرب بھیجی کہ وہاں قربانی کی جائے، اور عامۃً سعودی میں ہندو پاک سے ایک یا دو دن پہلے عید ہوتی ہے۔ تو کیا ہندو پاک والے آدمی کی قربانی صحیح ہوجائے گی۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس صورت میں قربانی صحیح ہوجائے گی، ان حضرات نے قربانی کی جگہ کا اعتبار کیا کہ جہاں قربانی ہورہی ہے وہاں عید کا دن ہے، ان کی دلیل شامی وغیرہ کی یہ عبارت ہے کہ: والمعتبر مکان الاضحیة لا مکان من علیه ، الخ۔

مگر ارباب فتوی اور اکابر علماء کا رجحان یہ ہے کہ اس صورت میں قربانی درست نہیں ہوگی۔ اور یہ رائے اوفق بالفقہ والفتوی ہے۔

راقم اس مسئلہ کی تفصیل کچھ لکھ رہا تھا کہ حضرت مولانا مفتی اسماعیل صاحب بھڑکودروی رحمہ اللہ کا ایک تفصیلی فتوی نظر سے گذرا، اس کو پڑھ کر اپنی طرف سے کچھ لکھنے کے بجائے اسی کی تلخیص نقل کرنا کافی سمجھا گیا، وھو ھذا:

(۱):......جو عبادات مسلمانوں پر فرض و واجب ہیں عموماً ان میں دو چیزیں ہوتی ہیں:

اول:......نفس وجوب، یعنی مکلّف کے ذمہ کسی عبادت کا لازم ہونا۔

دوسرا:......وجوب ادا، یعنی مکلّف کے ذمہ کسی عبادت کے واجب ہونے کے بعد ذمہ سے

بری ہونے کے لئے اس کی ادائیگی کا واجب ہونا۔

(۲):......عموماً نفس وجوب کا سبب الگ ہوتا ہے، اور وجوب ادا کا سبب الگ ہوتا ہے۔

(۳):......حضرات اصولیین جہاں اسبابِ وجوب کی بحث فرماتے ہیں' وہاں نفس وجوب کے سبب سے بحث فرماتے ہیں۔

(۴):......حضرات فقہاء کرام کتب فقہ میں عبادات سے متعلق ہر کتاب کے شروع میں عموماً سبب وجوب کو ذکر کرتے ہیں' وہاں بھی اصولیین کے طرز پر نفس وجوب ہی کا سبب ذکر کرتے ہیں، وجوب ادا کا سبب ذکر نہیں کرتے۔

(۵):......قربانی کے سلسلے میں بھی ''شامی' فتح القدیر' مجمع الانہر'' وغیرہ میں قربانی کا سبب وجوب ایام نحر کو بتایا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ شرائطِ وجوب پائے جانے کی صورت میں ایام نحر شروع ہونے سے قربانی واجب ہوگی۔ اس سے قبل واجب نہ ہوگی۔

(۶):......جس عبادت کے نفس وجوب کا سبب وقت ہو، اس عبادت کے واجب ہونے میں مقامی وقت کا اعتبار ہوگا، دوسری جگہ وقت شروع ہونے کا اعتبار نہ ہوگا، اور دوسری جگہ وقت شروع ہوجانے سے وہ عبادت مکلّف پر واجب نہ ہوگی، جیسا کہ نماز' روزہ' عیدین میں اسی پر عمل ہوتا ہے۔

(۷):......واجب قربانی کی ادائیگی کے لئے مالکِ قربانی کے مقام پر وقتِ قربانی (سببِ وجوب) شروع ہوکر اس پر قربانی واجب ہونا، اور جہاں قربانی کا جانور ذبح کرنا ہے وہاں بھی وقتِ قربانی (شرطِ ادا) کا موجود ہونا ضروری ہے۔

مذکورہ بالا تمام اصول ومسائل سے یہ حقیقت واضح ہے کہ جب تک کسی مکلّف کے مقام پر قربانی کا وقت شروع نہ ہو، اس پر قربانی واجب نہیں ہوتی، اور نفسِ وجوب سے پہلے

واجب قربانی کی ادائیگی صحیح وجائز نہیں ہے، جیسا کہ نماز وروزہ سے یہ بات عیاں ہے۔

واما وقت الوجوب فایام النحر ، فلا تجب قبل دخول الوقت ، لان الواجبات الموقتة لا تجب قبل اوقاتها ، کالصلوۃ والصوم ونحوهما۔ (بدائع الصنائع ۴:۱۹۸)

گجرات کے کچھ مفتی حضرات کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ: کسی جگہ کے باشندوں پر وہاں وقت قربانی شروع نہ ہونے کی وجہ سے اس پر نفسِ وجوب سے پہلے وہ اپنی قربانی بہ ذریعہ وکیل ایسی دوسری جگہ جہاں قربانی کا وقت شروع ہو چکا ہو، اگر کروائے تو جائز ہے۔

ان میں ایک مفتی صاحب صراحتِ فقہاء کرام کے خلاف قربانی کا سببِ وجوب غناء کو قرار دیتے ہیں، اور تمام حضرات اصولیین وفقہاء کرام کے مشہور طرز وتعامل کے خلاف یہ کہتے ہیں کہ: جن فقہی عبارات عربی میں قربانی کا سببِ وجوب وقت بتایا گیا ہے، اس سے وجوبِ ادا کا سبب ہونا مراد ہے، نفس وجوب کا سبب ہونا مراد نہیں ہے، حالانکہ یہ بات کتب فقہ واصول فقہ کے طرز وتعامل کے صریح خلاف ہے، اور کسی کتاب میں سببِ وجوب سے وجوبِ ادا کا سبب مراد ہونا اور نفسِ وجوب کا سبب مراد نہ ہونا مذکور نہیں ہے۔ بس یہ ان صاحب کی دوراز کار طویل بحث کا خلاصہ اور مختصر جواب ہے۔

ان میں سے دوسرے مفتی صاحب فقہاء کرام کی یہ عبارت ''والمعتبر مکان الاضحیة لا مکان من علیه '' کو استدلال میں پیش کرتے ہیں، حالانکہ مذکورہ عبارت کا تعلق مکانِ جانور اور مکانِ مالک دونوں جگہ وقتِ قربانی شروع ہونے کے بعد قبل صلوۃ العید یا بعد صلوۃ العید واجب قربانی ادا کرنے اور ذبح کرنے کے مسئلہ سے ہے۔ اس عبارت میں نفسِ وجوب سے بحث نہیں ہے، یعنی اس عبارت کا تعلق وجوبِ ادا سے ہے، نفسِ وجوب سے

نہیں ہے۔اوراس عبارت کا یہ مطلب لینا کہ:’’ مالکِ قربانی کی جگہ:۹رذی الحجہ ہواوراس کے جانور کی جگہ:۱۰رذی الحجہ ہوتو مالک کی واجب قربانی ذبح کرنا جائز ہے، چاہے مالک کی جگہ ابھی:۱۰رذی الحجہ یعنی قربانی کا وقت شروع نہ ہوا ہو‘‘ یہ مطلب لینا درست نہیں ہے، کیونکہ مالکِ قربانی پر نفسِ وجوب سے پہلے اس کی واجب قربانی ادا کرنا کیسے جائز کہا جا سکتا ہے؟ اور یہ بات مندرجہ ٔ ذیل عبارات سے بھی واضح طور پر سمجھی جا سکتی ہے:

’’ولامعتبر فی ذلک مکان الاضحیة ، حتی لو کانت فی السواد والمضحی فی المصر یجوز کما انشق الفجر ، وفی العکس لا یجوز الا انه بعد الصلوة ، وحیلة المصری اذا اراد التعجیل ان یبعث بها الی خارج المصر فی موضع یجوز لمسافر ان یقصر فیه فیضحی فیه کما طلع الفجر، لان وقتها من طلوع الفجر ‘‘۔

(تبیین الحقائق:۶ر۴)

اوریہی مسئلہ’’البحر الرائق‘‘۸ر۱۷۵ر پراور’’درمختار مع الشامی‘‘۵ر۲۰۲ر پر بھی موجود ہے۔

واما شرائط ادائها : فمنها الوقت فی حق المصری بعد صلوة الامام ، والمعتبر مکان الاضحیة لا مکان المضحی۔(البحر الرائق:۸ر۱۷۳)

صاحب بدائع نے بھی اس مسئلہ کو شہری باشندہ کی واجب قربانی بعد العید ذبح کرنے کا مسئلہ بتایا ہے،لہذا وہ تحریر فرماتے ہیں:’’ واما الذی یرجع الی وقت التضحیة فهو لا تجوز قبل دخول الوقت ، لان الوقت کما هو شرط(لعلة لفظ سبب) الوجوب فهو شرط جواز اقامة الواجب کوقت الصلوة ، فلایجوز لاحد ان یضحی قبل طلوع الفجر الثانی من الیوم الاول من ایام النحر ، ویجوز بعد طلوعه ، وسواء کان من اهل المصر أو من اهل القری ، غیر ان للجواز فی حق اهل المصر شرطا زائدا وهو ان

يكون بعد صلوة العيد ولا يجوز تقديمها عليه عندنا''۔(بدائع:۴/۲۱۱)

پھر اہل مصر کی قربانی بعد نماز عید ہونی چاہئے، اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:''هذا اذا كان من عليه الاضحية في المصر والشاة في المصر، فان كان هو في المصر والشاة في الرستاق أو في موضع لا يصلى فيه، وقد كان اَمَرَ اَن يُضَحُّوا عنه فَضَحَّوُا بها بعد طلوع الفجر قبل صلوة العيد (في المصر) فانها تجزيه وعلى عكسه...... وانما يعتبر في هذا (أى في التضحية بعد صلوة العيد أو قبله) مكان الشاة لا مكان من عليه''۔(بدائع:۴/۲۱۳)

اس عبارت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مالکِ قربانی کا مکان اور جانور کا مکان الگ الگ ہونے کے باوجود دونوں جگہ عید کا دن شروع ہو چکا ہے، مسئلہ صرف جانور کے قبل العید یا بعد العید ذبح کرنے کا ہے۔اس عبارت میں یہ مسئلہ بیان کرنا مقصود ہی نہیں کہ مالکِ قربانی کے مکان پر اگر قربانی کا دن شروع نہیں ہوا اور جانور کے مکان پر شروع ہو چکا ہے تو مالک کی واجب قربانی ذبح کرنا جائز ہے، بلکہ یہ مسئلہ بیان کرنا ہے کہ مصری اور دیہاتی کی قربانی کس صورت میں بعد العید ذبح کرنا ضروری ہے، اور کس صورت میں قبل العید ذبح کرنا جائز ہے،تو اس کا یہی مطلب صحیح طور پر ثابت وواضح ہوگا، والله تعالى اعلم بالصواب وهو يلهم الصواب۔

العبد اسماعیل بھڑکودروی
خادم افتاء دار العلوم کنتھاریہ
وخادم حدیث جامعہ علوم القرآن، جمبوسر
۲۸/صفر ۱۴۲۷ھ مطابق ۲۹/ مارچ ۲۰۰۶ء

مظاہر علوم سہارنپور کی تصدیق

جواب صحیح اور منقح ہے، قربانی واجبات موقتہ میں سے ہے، اور واجبات موقتہ کا وجوب قبل الوقت نہیں ہوتا۔ اور فقہاء کی مشہور عبارت "والمعتبر مکان الاضحیۃ لا مکان من علیہ" الخ "شہری اور دیہاتی کا فرق تقدیم صلوۃ عید میں ہے، ورنہ جو وقت شہری کے لئے وہی وقت دیہاتی کے لئے ہے، اور قربانی صحیح ہونے کے لئے اس وقت کا محقق ہونا ضروری ہے:

(قولہ واول وقتھا بعد الصلوۃ) وفیہ تسامح اذ التضحیۃ لا یختلف وقتھا بالمصر وغیرہ، بل شرطھا فأول وقتھا فی حق المصری والقروی طلوع الفجر الا انہ شرط للمصری تقدیم الصلوۃ علیھا۔ (شامی: ۲۰۲/۵)

العبد محمد: طاہر عفا اللہ عنہ

الجواب صحیح: مقصود

دار العلوم دیوبند کی تصدیق

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ	محمود حسن غفرلہ، بلند شہری	زین الاسلام قاسمی، الہ آبادی
مفتی دار العلوم دیوبند	مفتی دار العلوم دیوبند	نائب مفتی دار العلوم دیوبند

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری مدظلہم کی تصدیق وتائید

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب صحیح، والمؤیدون مصیبون: مضحی پر نفس وجوب کے بعد ہی قربانی صحیح ہوگی،

اور’’ المعتبر مکان الاضحیة‘‘ کی رو سے جہاں جانور قربان کیا جارہا ہے وہاں قربانی کا وقت باقی ہونا ضروری ہے، پس اگر سعودیہ میں :۱۳/ذی الحجہ ہو جائے اور ہندوستان میں ۱۲/ذی الحجہ ہو تو سعودیہ میں قربانی نہیں ہوسکتی، کیونکہ مکان اضحیہ میں قربانی کا وقت ختم ہوگیا ہے، جبکہ یہ بھی شرط ہے۔ واللہ اعلم حررہ: سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری

خادم دارالعلوم دیوبند

۱۴۲۸/۴/۵ھ

مذکورہ فتوی میں گجرات کے جن مفتی صاحب کے اختلاف کا ذکر ہے وہ قربانی میں نفسِ وجوب اور وجوبِ ادا کو علیحدہ علیحدہ مانتے ہیں، اور نفس وجوب کا سبب غنا (مالداری) کو قرار دیتے ہیں، اور وجوبِ ادا کا سبب وقت کو گردانتے ہیں، جیسے زکوۃ اور صدقۃ الفطر میں یہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں، حالانکہ زکوۃ میں مالکِ نصاب ہونے کے بعد کئی سالوں کی زکوۃ مقدم ادا کی جاسکتی ہے، اور صدقۃ الفطر میں’’ رأسٌ یَمُوْنُهٗ وَیَلِیْ عَلَیْه ‘‘ (وہ ذات جس کا خرچہ آدمی برداشت کرتا ہے اور جس کی سرپرستی کرتا ہے) کے تحقق کے بعد متعدد سالوں کا صدقۂ فطر پیشگی ادا کیا جاسکتا ہے۔ اور نماز، روزے میں یہ چیزیں ساتھ ہیں، خطابِ خداوندی سے نفس وجوب آتا ہے، اور وقت وجوبِ ادا کا سبب ہے، چنانچہ ظہر کا وقت ہونے کے بعد ایک ہی ظہر ادا کی جاسکتی ہے، متعدد ظہر کی نمازیں ادا نہیں کی جاسکتیں۔ قربانی میں بھی یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ ہیں، قربانی کا وقت شروع ہونے کے بعد خطابِ خداوندی متوجہ ہوتا ہے اور اس سے نفسِ وجوب آتا ہے، اس لئے جب تک قربانی کرنے والے پر قربانی کا وقت نہیں آئے گا اور اس کی طرف خطابِ خداوندی متوجہ نہیں ہوگا، اس کی طرف سے قربانی کرنا درست نہیں۔

اور دوسری صورت میں مکانِ اضحیہ کا بھی اعتبار ہوگا، یعنی جہاں جانور ذبح کیا جارہا ہے وہاں قربانی کا وقت باقی ہونا ضروری ہے، اگر قربانی کے ایام گذر گئے ہیں تو قربانی درست نہیں ہوگی، اگر چہ قربانی کرنے والے کی جگہ ابھی ایام قربانی چل رہے ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ حررہ: سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری

خادم حدیث دارالعلوم دیوبند

یکم شعبان المعظم ۱۴۳۱ھ مطابق ۱۵/ جولائی ۲۰۱۰ء

(فتاوی رحیمیہ ص ۴۲۴ ج ۵، مکتبۃ الاحسان دیوبند)

حضرۃ الاستاذ مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری کا مدظلہم کا فتوی

بیرون ممالک میں رہنے والے وہ احباب جن کے مقام رہائش پر قربانی کا دن اور وقت دیر سے شروع ہوتا ہے' وہ حضرات ایسے دور کے مقام پر کہ جہاں قربانی کا دن اور وقت جلدی شروع ہوتا ہے، کسی شخص یا ادارہ کو اپنی قربانی ذبح کرنے کا وکیل بناتے ہیں تو اس دوسرے مقام کے لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ پہلے مقام پر جب تک قربانی کا دن شروع نہ ہو وہاں تک ان لوگوں کی قربانی کا جانور ذبح نہ کریں، اگر کریں گے تو درست نہیں ہوگی، البتہ اسی مقام پر دن تو شروع ہو چکا ہے اور قربانی کے جانور کے مقام پر دن اور وقت دونوں شروع ہو چکے ہیں جیسا کہ شہر اور دیہات کے باشندوں کی مثال میں اوپر لکھا جا چکا ہے تو قربانی درست ہوگی، فقط واللہ تعالی اعلم۔

املاہ: العبد احمد خانپوری

۲۳/ ذی قعدہ ۱۴۲۵ھ

(ماہنامہ ''اذان بلال'' آگرہ، فروری ۲۰۰۵)

دارالعلوم کراچی کا فتوی اور اکابر دارالعلوم کی تصدیقات

لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ ادا کا اعتبار اس وقت ہوگا جب اس عمل سے پہلے مکلّف کے ذمہ نفس وجوب ہو چکا ہو..... کیونکہ وجوب سے قبل اداء کا اعتبار نہیں، اور نفس وجوب کا تعلق ذمہ مکلّف سے ہوتا ہے، اور ذمہ کا محل مکلّف ہے، مال نہیں، لہذا نفس وجوب میں مکلّف (فاعل) کے محل کا اعتبار ہوگا، اور نفس وجوب کا سبب یوم نحر ہے......لہذا نفس وجوب میں یہ دیکھا جائے گا کہ جہاں مضحی (قربانی کرنے رکرانے والا) رہ رہا ہے وہاں یوم نحر ہو چکا ہے یا نہیں، اگر یوم نحر ہو چکا ہے تو نفس وجوب ہو گیا، اب اگر دیگر شرائط کے پائے جانے کی صورت میں خود قربانی کرے یا اس کی اجازت سے دوسرا کوئی آدمی کرے تو دونوں صورتوں میں یہ قربانی شرعا ادا ہو جائے گی۔

لیکن مضحی (جہاں رہ رہا ہے وہاں یوم نحر اگر نہیں تو جس طرح اس وقت یہ خود قربانی نہیں کرسکتا، اسی طرح اس کی طرف سے کوئی اور بھی نہیں کرسکتا، اگر چہ وکیل (دوسرا شخص) کے شہر یا ملک میں یوم نحر شروع ہو چکا ہو۔

اس تفصیل سے یہ بات بالکل صاف طور پر معلوم ہوگئی کہ اگر کوئی شخص مثلا پاکستان میں رہ رہا ہے اور وہ اپنی قربانی مثلا افغانستان میں کراتا ہے تو نفس وجوب کے وقت میں پاکستان کا اعتبار ہوگا، لہذا افغانستان میں پاکستان سے ایک دن پہلے عیدالاضحیٰ ہوئی اور اس پاکستانی کا جانور افغانستان میں پہلے دن ذبح ہوا تو یہ قربانی شرعا نہیں ہوگی۔

اس لئے دوسرے ممالک میں قربانی کرانے والوں پر واجب ہے کہ وہ اپنے وکیلوں کو اس بات کا پابند بنائیں کہ ہمارے جانور کو اس دن ذبح کریں جس دن ہمارے یہاں بھی ایام نحر میں سے کوئی دن ہو۔

اہل برطانیہ کی قربانی ہندو پاک میں جب تک برطانیہ میں صبح صادق طلوع نہ ہو وہاں تک درست نہیں

مذکورہ بالا اصول سے ضمناً ایک اور مسئلہ کا حکم بھی معلوم ہوا، اور وہ یہ کہ مثلاً برطانیہ کا وقت پاکستان کے وقت سے پانچ گھنٹے پیچھے ہے، مثلاً پاکستان میں صبح ساڑھے چھ بج رہے ہیں تو اس وقت برطانیہ میں رات کا ڈیڑھ بج رہا ہوتا ہے، لہذا اگر ایک آدمی برطانیہ میں رہ رہا ہے اور وہ اپنی قربانی پاکستان میں کراتا ہے، تو جب تک برطانیہ میں یوم نحر کی صبح طلوع نہ ہو اس وقت تک اس کا جانور پاکستان میں ذبح کرنا درست اور معتبر نہیں، لان نفس الوجوب لم یتحقق فی ذمته کما مر ، واللہ تعالی اعلم وعلمه اتم واحکم۔

عصمت اللہ عصمہ اللہ

۱۴۲۰/۸/۱۵ھ

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ	محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ	بندہ عبدالرؤف عفی عنہ	احقر محمود اشرف عفی عنہ
الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
اصغر علی ربانی	محمد کمال الدین راشدی	محمد عبداللہ غفرلہ	محمد عبدالمنان عفی عنہ

(عربی عبارتوں وحوالوں کے لئے دیکھئے! ماہنامہ ''البلاغ'' کراچی، بابت: رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ)

اصیل کے یہاں قربانی کے دن ختم ہو چکے ہوں اور وکیل کے یہاں باقی ہوں تو؟

دارالعلوم کے مذکورہ فتوی کی اس عبارت ''دوسرے ممالک میں قربانی کرانے والوں پر

واجب ہے کہ وہ اپنے وکیلوں کو اس بات کا پابند بنائیں کہ وہ ہمارے جانوروں کو اس دن ذبح کریں جس دن ہمارے یہاں بھی ایام نحر میں سے کوئی دن ہو' پر یہ اشکال ہوا کہ آپ کے فتوی سے یہ سمجھ میں آرہا ہے کہ اگر کسی کی قربانی کا جانور دوسرے ملک میں جس وقت ذبح کیا گیا اس وقت وہاں قربانی کا آخری دن تھا، لیکن قربانی کرانے والے کے یہاں قربانی کے ایام ختم ہو چکے تھے، مثلا برطانیہ میں جمعرات کو عیدالاضحیٰ تھی، اور ہندو پاک میں جمعہ کو ہوئی، اب برطانیہ والے کی قربانی ہندو پاک میں اتوار کو کی جائے تو قربانی صحیح ہوگی یا نہیں؟ کیونکہ برطانیہ میں قربانی کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ اس کا جواب دارالعلوم کراچی سے یہ موصول ہوا:

الجواب، حامدا ومصلیا:......صورت مذکورہ میں چونکہ قربانی نفس وجوب کے بعد ہوئی اور جہاں جانور ذبح ہوا وہاں یوم نحر تھا، اس لئے قربانی صحیح ہوگی۔ باقی ماہنامہ ''البلاغ'' میں تحریر کردہ جواب ایک خاص صورت سے متعلق ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ نفس وجوب سے قبل وکیل کا ایام نحر میں جانور ذبح کرنا، اور چونکہ یہ صورت ناجائز تھی، اس لئے جواب میں یہ بات تحریر کی گئی کہ: ''دوسرے ممالک میں قربانی کرانے والوں پر واجب ہے کہ وہ اپنے وکیلوں کو اس بات کا پابند بنائیں کہ ہمارے جانور کو اس دن ذبح کریں جس دن ہمارے یہاں بھی ایام نحر میں سے کوئی دن ہو' اس عبارت سے بظاہر اگرچہ آپ کی تحریر کردہ صورت کا عدم جواز معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ صورت مراد نہیں ہے۔ باقی اس بات کی کوشش کرنا بہتر ہے کہ قربانی کرانے والے (یعنی اصیل) کے یہاں بھی اور قربانی کرنے والے (یعنی وکیل) کے یہاں بھی ایام نحر میں سے کوئی دن ہو، واللہ اعلم بالصواب۔

الجواب صحیح: احقر محمود اشرف غفرلہ　　　　محمد معاذ عفی عنہ

قربانی کے دن گذر گئے اور رقم رہ گئی تو وکیل خود صدقہ کرسکتا ہے؟

سوال:......ایک ادارہ نے قربانی کا اشتہار دیا' اس پر زید نے قربانی کی رقم اور نام ادارہ کے ذمہ دار کے علاوہ دوسرے شخص کو دے دیا کہ یہ پیسے ادارہ کے ذمہ دار کو پہنچا دینا، مگر اس سے بھول ہوگئی اور وہ قربانی کی رقم ادارہ کے ذمہ دار کو دینا بھول گیا، اب اس کا کیا حل ہے؟ کیا ادارہ کے ذمہ دار حضرات پیسے دینے والے کو اطلاع کئے بغیر اس کی رقم صدقہ کر سکتے ہیں یا اسے اطلاع دینا ضروری ہے؟ اگر اطلاع دینے میں فتنہ کا خوف ہو اور ادارہ کا نقصان ہوتا ہو تو کیا' کیا جائے؟ قربانی واجب ہو تو کیا حکم ہے؟ اور نفلی ہو تو کیا حکم ہے؟ کیا دونوں صورتوں میں پیسے دینے والے کو اطلاع کرنا ضروری ہے؟ کیا ادارہ کو نقصان اور دشمنوں کی شرارت سے بچانے کے لئے کوئی ایسی صورت ہوسکتی ہے کہ پیسے دینے والے کو اطلاع بھی نہ کی جائے اور اس کی رقم بھی کسی مصرف میں ادا ہو جائے اور قربانی بھی ذمہ میں نہ رہے؟

الجواب:......صورت مسئولہ میں مسمی ناصر نے غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے، بالخصوص جبکہ ملک کے اطراف میں قربانی اور اس کے جانور کی آمد و رفت ہیئت مذکّرہ بھی موجود ہے، ایسے وقت یاد نہ رہنا یا یاد نہ رکھنا سمجھ سے بالاتر ہے۔ ہماری ناقص رائے میں قربانی کی کل رقم کا تصدق کر دینے سے بھی مؤکلین کا ذمہ فارغ ہو جائے گا، کیونکہ مذکورہ رقم کی واپسی کی صورت میں مؤکلین کو بھی یہی حکم ہے کہ وہ اس رقم کا تصدق کریں۔

"فاذا فات الوقت یجب علیه التصدق اخراجا له عن العهدة کالجمعة تقضی بعد فواتها ظهرا' والصوم بعد العجز فدیة"۔ (ہدایہ ج:۴ صفحہ:۴۴۶)

نیز مؤکل کا قربانی کی رقم وکیل کے حوالہ کرنے سے مقصد قربانی کے حکم سے ذمہ کا فراغ ہے، اور وہ فراغ ایام اضحیہ میں بصورت اراقۃ الدم ہے اور ایام قربانی کے گذر جانے کے

بعد رقم کا تصدق ہے، اس لئے بھی تصدق کی اجازت معلوم ہوتی ہے۔ نیز مقصد حاصل ہوجانے کی صورت میں وکیل کی قدرے مخالفت قابل برداشت معلوم ہوتی ہے۔حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کے شراء اضحیہ کے مشہور واقعہ میں ان کا ایک دینار کی اضحیہ خریدنے کے بعد اسے دو دینار کا فروخت کرنا بظاہر توکیل کے خلاف تھا (اسی وجہ سے امام بیہقی رحمہ اللہ اور امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے اس پر ''باب المضارب یخالف '' کا ترجمۃ الباب قائم کیا) اس کے باوجود حضور ﷺ نے اسے جائز رکھا اور تجارت میں برکت کی دعا دی۔ اسی طرح صورت مسئولہ میں گو کسی درجہ میں موکلین کے حکم کی خلاف ورزی ہے لیکن مقصد (برائت ذمہ) حاصل ہوجانے کی وجہ سے اسے ایسی مخالفت قرار نہ دیں گے جو حکم توکیل کے خلاف ہو۔''عن حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعث معہ بدینار لیشتری لہ اضحیۃ فاشتراھا بدینار و باعھا بدینارین فرجع فاشتری اضحیۃ بدینار و جاء بدینار الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فتصدق بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ودعا لہ ان یبارک لہ فی تجارتہ''(السنن الکبری للبیھقی)

''فتصدق بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم '' حضور پاک ﷺ نے حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کے دیئے ہوئے اس دینار کو جو صدقہ کردیا اس کی وجہ دینار کا اضحیہ اور تقرب الی اللہ کے لئے متعین ہونا تھی۔''امر بتصدقہ لکونہ حصل بربح دینارٍ نوی صرفہ فی سبیل اللہ بطریق الاضحیۃ یعنی انہ قد خرج عنہ للقربۃ للہ تعالی فی الاضحیۃ فکرہ اکل ثمنھا''۔(مرقاۃ ، آخر باب العتیرۃ، جلد:۵/صفحہ:۲۴۵)

اسی طرح زیر بحث صورت میں مذکورہ تمام رقم کا تصدق ضروری ہے، گائے کے ایک حصہ کے بقدر تصدق کافی نہیں، فقط واللہ اعلم۔ بندہ: محمد عبداللہ عفا اللہ عنہ

رئیس دارالافتاء خیر المدارس ملتان

احادیث النّبویّة

فی ایّام الاضحیّة

اس مختصر رسالہ میں احادیث اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم کی روشنی میں اس مسئلہ کو واضح کیا گیا ہے کہ قربانی کے ایام تین دن ہیں۔

مرغوب احمد لاجپوری

ناشر: جامعۃ القراءات، کفلیتہ

تین دن سے زیادہ قربانی کا گوشت رکھنے کی ممانعت

عن ابن عمر رضی الله عنه : ان النبی صلی الله علیه وسلم قال : لا یاکل احدکم من لحم اضحیته فوق ثلاثة ایام۔

(ترمذی شریف، باب فی کراهیة اکل الاضحیة فوق ثلا ثة ایام ، ابواب الاضاحی)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ: آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی اپنی قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ نہ کھائیں۔

آپ ﷺ نے ایک سال یہ اعلان کرایا تھا کہ تین دن کے بعد کوئی قربانی کا گوشت نہ کھائے، کیونکہ مدینہ منورہ میں باہر سے بہت سے مسلمان آگئے تھے، پس آپ ﷺ نے چاہا کہ سب کو گوشت پہنچے، مگر آئندہ سال بھی صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے اس پر عمل کیا تو آپ ﷺ نے پھر اعلان کرایا کہ: ایام قربانی کے بعد بھی قربانی کا گوشت کھا سکتے ہیں، اور پہلے اعلان کی وجہ سمجھائی کہ یہ مصلحت تھی، مسئلہ نہیں تھا۔ (تحفۃ الالمعی ص۴۴۲ ج۴)

تین دن کے بعد قربانی کا گوشت کھانے کی اجازت

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے آپ لوگوں کو تین دن سے زیادہ قربانی کا گوشت کھانے سے روکا تھا تاکہ باحیثیت لوگ ان لوگوں پر وسعت کریں جن کے پاس قربانی کی وسعت نہیں ہے، یعنی قربانی کرنے والے تین دن تک کھانے کے بقدر گوشت روک کر زائد گوشت غرباء میں تقسیم کریں، مگر چونکہ یہ مصلحت باقی نہیں رہی، اس لئے وہ حکم ختم، اب جب چاہیں کھائیں، کھلائیں اور ذخیرہ کریں۔

حضرت عابس (رحمہ اللہ) نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا: کیا رسول اللہ ﷺ قربانی کے گوشت سے (ایام قربانی کے بعد) منع کیا کرتے تھے؟ صدیقہ رضی

اللہ عنہا نے فرمایا: نہیں، البتہ ایک سال ایسا ہوا کہ قربانی کرنے والے کم تھے، اس لئے آپ ﷺ نے چاہا کہ قربانی کرنے والے قربانی نہ کرنے والوں کو کھلائیں، بخدا! واقعہ یہ ہے کہ ہم بکری کے کھر اٹھا کر رکھ دیتے تھے اور ایام قربانی کے دس دن کے بعد (جب سارا گوشت نمٹ جاتا تھا) کھاتے تھے۔

(ترمذی شریف، باب فی الرخصة فی اکلها بعد ثلاث ، ابواب الاضاحی، تحفۃ الالمعی ص۴۴۲ ج۴)

اس حدیث سے بھی دلیل پکڑی جاتی ہے کہ قربانی تین سے زیادہ جائز نہیں، اس لئے کہ تین دن سے زیادہ قربانی کا گوشت جمع کرنے سے منع فرمایا، چونکہ سب تک قربانی کا گوشت پہنچانا تھا، اور قربانی کا دستور تین دن تک ہی تھا، اس لئے ممانعت بھی تین دن ہی کی فرمائی، بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا۔

آثار صحابہ رضی اللہ عنہم

(۱):......عن علی رضی الله عنه قال : الاضحی یومان بعد یوم الاضحی۔

(السنن الکبری للبیهقی ص۲۹۷ ج۹، باب من قال الاضحی یوم النحر و یومین بعده)

ترجمہ:......حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: قربانی عید کے بعد دو دن تک ہے۔

(۲):......عن علی رضی الله عنه قال: النحر ثلاثة ایام ، افضلها اولها۔

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: نحر تین دن تک ہے، لیکن پہلا دن افضل ہے۔

ایک روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر ان الفاظ سے منقول ہے: ”ایام النحر ثلاثة ایام ، اولهن افضلهن “۔ (عمدۃ القاری ص۱۴۸ ج۲۱۔ مؤطا امام مالک ص۴۸۷ ج۲، باب ذکر ایام الاضحی ، کتاب الضحایا)

ابن عبد البر نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت اس طرح نقل کی ہے کہ: ایام

معدودات یوم نحر ہے اور دو دن اس کے بعد، ان میں جب چاہو ذبح کرو لیکن پہلا دن افضل ہے۔

عن علی رضی الله عنه قال : الايام المعدودات: يوم النحرو يومان بعده ، اذبح فی ايها شئت و افضلها اولها۔

(اوجز المسالک الی موطا مالک ص۲۶۳ ج۹، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان)

امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: اس طرح کی روایت توقیفی ہی ہوسکتی ہے اس میں رائے کو دخل نہیں۔قال الطحاوی : مثل هذا لا يكون رأيا فدل انه توقيف۔(حوالہ بالا)

(۳):......عن نافع ان ابن عمر رضی الله عنهما قال : الاضحی يومان بعد يوم الاضحی ، وقال : وبلغنی عن علی بن ابی طالب مثله۔(حوالہ بالا)

(۴):......عن انس رضی الله عنه قال : الذبح بعد النحر يومان۔(حوالہ بالا)

(۵):......عن عمر بن الخطاب رضی الله عنه : انما النحر فی هذه الثلاثة الايام۔

(اعلاء السنن ص۲۳۲ ج۱۷، باب ان الاضحية يومان بعد يوم الاضحی، ادارۃ القرآن، کراچی)

(۶):......عن ابن عباس رضی الله عنهما : ايام النحر ثلاثة ايام۔(حوالہ بالا)

(۷):......عن ابن عمر رضی الله عنهما قال: ما ذبحت يوم النحر والثانی والثالث فهی الضحايا۔(حوالہ بالا)

(۸):......عن ابی هريرة رضی الله عنه : الاضحی ثلاثة ايام۔(حوالہ بالا)

ان تمام آثار کا خلاصہ یہی ہے کہ قربانی کے تین دن ہیں۔ پانچویں اور ساتویں روایت میں تو من وجہٍ حصر ہے کہ ان تین ہی ایام میں قربانی ہوگی، یعنی ان کے علاوہ ایام میں قربانی نہیں ہوگی۔

قربانی کے چار دن کے قائلین کے دلائل اوران کے جوابات

((کل ایام التشریق ذبح))

(۱):……آپ ﷺ کا ارشاد حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نقل فرماتے ہیں: کل ایام التشریق ذبح ۔(زادالمعاد ص۳۱۸ ج۲)

یعنی ایام تشریق سب کے سب ایام ذبح ہیں۔

اس حدیث سے استدلال درج ذیل وجوہ سے صحیح نہیں:

پہلا یہ کہ:…… یہ حدیث صحیح نہیں، ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’الحدیث منقطع لا یثبت وصلہ‘‘ یعنی یہ حدیث منقطع ہے، آپ ﷺ تک اس کا موصول ہونا ثابت نہیں۔

اہل حدیث حضرات تو ہر بات میں صحیح حدیث کا مطالبہ کرتے ہیں، یہاں خود ان کے بڑے امام کی صراحت ہے کہ یہ حدیث منقطع ہے۔

ایام تشریق ایام ذبح ہیں تو پھر نویں کو بھی قربانی جائز ہونی چاہئے

دوسرے یہ کہ:…… اس حدیث سے استدلال کرنا ہو تو پھر ان کو پوری حدیث پر عمل کرنا چاہئے۔اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ ایام تشریق قربانی کے دن ہیں، اور ہر ایک کو معلوم ہے کہ ایام تشریق ذی الحجہ کی نو تاریخ ہی سے شروع ہو جاتے ہیں، پس اس حدیث کے ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ نویں تاریخ سے قربانی شروع ہو، مگر کسی اہل حدیث کا اس پر عمل نہیں۔

دور صحابہ میں تمام مراکز اسلام کا فتوی تین دن کا تھا

دور صحابہ میں تمام مراکز اسلام : مکہ مکرمہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما، مدینہ منورہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، کوفہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، بصرہ میں حضرت انس رضی

اللہ عنہ تین دن ہی پر فتوی دیتے تھے، کہیں بھی کسی نے منکر روایت کا سہارا لے کر اس فتوی کی مخالفت نہیں کی۔

مگر چار دن تک قربانی کے جواز کے قائلین حضرات نے ایک منکر حدیث کا سہارا لے کر کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا کہ: ''ایام تشریق کھانے پینے کے دن ہیں'' یعنی ان میں روزہ نہ رکھیں۔ یہ مضمون تقریبا چودہ صحابہ نے روایت فرمایا ہے۔

جبیر بن مطعم کی روایت علماء اہل حدیث کے نزدیک بھی صحیح نہیں

اس کے خلاف حضرت جبیر بن مطعم کی روایت میں ایک راوی سلیمان بن موسی الاشدق نے غلطی سے کھانے کے بجائے لفظ ''ذبح'' بیان کر دیا۔ غیر مقلدین میں سے جو علم حدیث سے معمولی مناسبت بھی رکھتے ہیں وہ اس کو صحیح نہیں مانتے، چنانچہ ان کے سابقہ مناظر اعظم مولانا بشیر احمد سہوانی اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ (فتاوی علماء حدیث ص ۱۷۸ ج ۱۳)

اور سابق امیر جماعت اہل حدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی بھی فرماتے ہیں کہ: اس کے ہر طریق میں کچھ نہ کچھ نقص ہے۔ (فتاوی علماء حدیث ص ۱۶۹ ج ۱۳)

اور دوسری جگہ تو غصے میں فرماتے ہیں:

''بعض کم فہم اور متعصب حضرات سارا زور جبیر بن مطعم کی حدیث اور اس پر جرح میں صرف کر دیتے ہیں، حالانکہ جبیر بن مطعم کی حدیث استدلال کی بنیاد نہیں''۔

(فتاوی علماء حدیث ص ۱۷۱ ج ۱۳)

اور خود چار دن قائلین حضرات کے اکابر بھی قربانی میں تاخیر کو پسند نہیں فرماتے ہیں، جس کو پہلے دن قربانی میسر ہو اور وہ نہ کرے اور قربانی کو باندھ رکھے، اس کا عمل حدیث کے خلاف ہے۔ (فتاوی برکاتیہ ص ۲۵۵)

اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ:

جس طرح اول وقت میں نماز پڑھنا افضل ہے آخر وقت نماز پڑھنے کی عادت بنالیں تو نماز تو ہو جائے گی، لیکن منافقانہ نماز ہوگی۔ (فتاوی علمائے حدیث ص ١٦٧ ج ١٣)

(اس طرح قربانی بھی اول دن میں ہونی چاہئے)۔ (فتاوی بینات ص ٦٠٢ ج ٤)

(٢):......حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر ہے:

"ایام النحر یوم الاضحی و ثلاثة ایام بعده"۔ (زادالمعاد ص ٣١٩ ج ٢)

یعنی قربانی کے چار روز ہیں ایک روز عید کا اور تین روز اس کے بعد کے۔

جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی روایت علماء اہل حدیث کے نزدیک بھی صحیح نہیں

چار دن والی روایت پر اہل حدیث کی خدمت میں چند گذارشات

نواب صاحب کے نزدیک صحابی کا قول حجت نہیں

اس سلسلہ میں پہلی گذارش یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ صحابی ہیں اور صحابی کا قول اہل حدیث کے یہاں حجت نہیں۔ نواب صدیق حسن خان بھوپالی تحریر فرماتے ہیں:

"وقول الصحابی لا تقوم به حجة"۔ (الروضۃ الندیۃ ص ١٤١ ج ١)

یعنی صحابی کے قول سے حجت قائم نہیں ہوتی ہے۔

تو جب صحابی کے قول سے حجت نہیں پکڑی جاسکتی ہے اور معرض استدلال میں صحابی کا قول اہل حدیث کے یہاں مردود ہے، تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول کو دلیل بنانا کیسے جائز ہوگا؟

کچھ اہل حدیث احناف سے مطالبہ کرتے ہیں کہ: حدیث میں قربانی کے ایام چار روز ہیں، لہذا تمہارا عمل تین دن کا حدیث کے خلاف ہے۔

مقلد سے حدیث کا مطالبہ تعجب خیز ہے۔قربانی کی فضیلت میں کوئی صحیح حدیث نہیں، پھر حضرات اہل حدیث قربانی کیوں کرتے ہیں؟

اہل حدیث حضرات کی خدمت میں پہلی درخواست تو یہ ہے کہ ہم تو مقلد ہیں ہم سے حدیث کا مطالبہ کرنا ہی فضول ہے۔ دوسری یہ کہ: قربانی کے ایام کتنے ہیں؟ یہ مسئلہ تو الگ ہے، ہمارے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اہل حدیث حضرات قربانی کرتے ہی کیوں ہیں؟اس لئے قربانی کی فضیلت کے سلسلہ میں ان کے اکابر کے بقول کوئی صحیح حدیث ہی نہیں ہے، اور اہل حدیث حضرات کا تو عمل (بقول ان کے، حقیقت بھی ایسی ہے یا نہیں، یہ علیحدہ بحث ہے) ہمیشہ صحیح حدیث ہی پر ہوتا ہے۔مشہور غیر مقلد عالم اور محدث مولانا عبد الرحمٰن مبارکپوری تحریر فرماتے ہیں:

”قال ابن العربی فی شرح الترمذی : لیس فی فضل الاضحیة حدیث صحیح ، قلت : الامر کما قال ابن العربی“۔(تحفۃ الاحوذی ص۳۵۳ ج۲)

یعنی ابن عربی رحمہ اللہ نے شرح ترمذی میں فرمایا ہے کہ: قربانی کی فضیلت کے بارے میں کوئی بھی صحیح حدیث نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں (یعنی مولانا مبارک پوری فرماتے ہیں) کہ: بات وہی ہے جو ابن عربی رحمہ اللہ نے کہی۔

جب بات وہی ہے جو ابن عربی رحمہ اللہ نے فرمائی، یعنی قربانی کی فضیلت کے بارے میں کوئی صحیح حدیث نہیں ہے، تو اہل حدیث کے یہاں قربانی کا عمل یقیناً باعث تعجب ہے، پس اولاتو اہل حدیث حضرات یہ بتلائیں کہ وہ قربانی کیوں کرتے ہیں؟ ثانیاً غیر صحیح حدیث پر عمل کے جواز کے بارے میں کون سی صحیح حدیث ہے؟

رہی بات اہل حدیث حضرات صرف احناف ہی سے کیوں نالہ ہے، کیا تین روز قربانی

کا مسئلہ صرف احناف کا ہے یا یہی مذہب جمہور کا بھی ہے؟ قربانی کے ایام کے بارے میں جو مسلک احناف کا ہے وہی امام مالک وامام احمد بن حنبل رحمہما اللہ کا بھی ہے، اور صحابۂ کرام میں یہی مسلک حضرت عمرؓ حضرت علیؓ وحضرت ابن عمرؓ وحضرت ابن عباسؓ وحضرت ابو ہریرہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہم کا بھی ہے۔ ''المغنی لابن قدامۃ'' حنبلی مذہب کی مشہور کتاب ہے، اس میں ہے:

''ایام النحر ثلاثة : یوم العید و یومان بعده ، وهذا قول عمر و علی وابن عمر وابن عباس وابی هریرة و انس (رضی الله عنهم) قال احمد: ایام النحر ثلاثة عن غیر واحد من اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم ، وهو قول مالک والثوری وابی حنیفة (رحمهم الله) ''۔ (المغنی ص۹۳۸ ج۸)

یعنی قربانی کے تین دن ہیں، عید کا دن اور دو دن اس کے بعد، اور یہی قول حضرت عمرؓ حضرت علیؓ وحضرت ابن عمرؓ وحضرت ابن عباسؓ وحضرت ابو ہریرہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہم کا بھی ہے۔ حضرت امام احمد رحمہ اللہ نے کہا کہ: قربانی کے تین دن ہیں اور یہی بہت سے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) سے مروی ہے، اور یہی قول امام مالک امام ثوری اور امام ابو حنیفہ (رحمہم اللہ) کا بھی ہے۔ کیا اہل حدیث حضرات ان اجل صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کے بارے میں حدیث کے خلاف عمل کا فتوی صادر فرمائیں گے؟ (ارمغان حق ص۵۹ ج۱)

آج کے اہل حدیث حضرات بات بات میں امام بخاری رحمہ اللہ کا نام لیتے ہیں، اور قربانی کے ایام کے مسئلہ میں امام بخاری رحمہ اللہ کو بالکل چھوڑ دیا، اس لئے کہ امام بخاریؒ ابن سرینؒ داؤد ظاہری اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ کے نزدیک قربانی کا صرف ایک دن ہے: یوم النحر۔ (عمدۃ القاری ص۱۴۸ ج۲۱)

ان حضرات کی دلیل ''بخاری شریف'' کی روایت کے الفاظ: ''الیس یوم النحر ؟ قلنا : بلی ''(بخاری شریف، باب : من قال : الاضحی یوم النحر ، کتاب الاضاحی)

اس میں ''یوم'' کو ''نحر'' کی طرف مضاف کیا ہے، اور ''النحر'' میں الف لام جنس کا ہے، یعنی نحر کا صرف ایک دن ہے۔ (عمدة القاری ص ۱۴۷ ج ۲۱)

لیکن جمہور کی طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں نحر سے نحر کامل مراد ہے، لام کمال کے لئے بھی بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ (عمدة القاری ص ۱۴۸ ج ۲۱۔ کشف الباری ص ۳۳۱)

ایک اور بات بھی قابل غور ہے کہ کچھ اہل حدیث حضرات احناف کی ضد میں جان کر پہلے دن قربانی نہیں کرتے اور چوتھے دن قربانی کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم مسئلہ کی وضاحت اور اشاعت کے لئے یہ عمل کر رہے ہیں، جبکہ قربانی پہلے دن افضل ہے۔ آپ حضرات چار دن کے جواز میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں، حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دونوں طرح کی روایتیں منقول ہیں، چار دن کی بھی اور تین دن کی بھی، مگر پہلے دن قربانی کا افضل ہونا بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے ثابت ہے، اب آپ حضرات اس افضلیت کو کیوں ترک کرتے ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر ہے: '' ایام النحر ثلاثة ایام ، اولهن افضلهن ''۔

(عمدة القاری ص ۱۴۸ ج ۲۱۔ مؤطا امام مالک ص ۴۸۷ ج ۲، باب ذکر ایام الاضحی ، کتاب الضحایا)

قربانی کے ایام میں سات مذاہب

آخر میں اس بات کی وضاحت بھی مفید ہے کہ قربانی کے ایام میں مجموعی طور پر سات مذاہب ہیں:

(۱):......قربانی کا فقط ایک دن ہے یوم نحر، یہ مذہب داؤد (ظاہری) اور ابن سیرین رحمہما اللہ کا ہے اور یہی مذہب امام بخاری رحمہ اللہ کا بھی ہے، کما مر۔

(۲):......قربانی کے تین دن ہیں، یہ مذہب ائمۂ ثلاثہ وغیرہ کا ہے۔

(۳):......قربانی کے چار دن ہیں، یہ مذہب امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے۔

(۴):......قربانی کے سات دن ہیں، یوم نحر اور اس کے بعد چھ دن، یہ حضرت قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔

(۵):......قربانی کے دس دن ہیں، ابن التین سے اس طرح منقول ہے۔

(٦):......ذی الحجہ کے آخر تک، یہ ابن حزم کا مذہب ہے۔

(۷):......شہروں میں ایک دن اور منی میں تین دن، یہ قول سعید بن جبیر اور جبیر بن زید کا ہے۔ (اوجز المسالک الی مؤطا مالک ص۲٦۲ ج۹، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان)

''الیواقیت الغالیہ فی تحقیق وتخریج الاحادیث العالیۃ'' سے ایام قربانی کے متعلق تین سوالات اور ان کے جوابات

قربانی کے ایام کے بارے میں تین سوالات شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحب مدظلہم سے کیئے گئے تھے، وہ اور ان کے مختصر جوابات کا یہاں نقل کرنا فائدہ سے خالی نہیں ہوگا، مکمل جوابات اور عبارتیں وغیرہ کے لئے اصل کتاب کا مطالعہ مفید ہے۔

کیا قربانی کرنے کا صرف ایک ہی دن ہے، دوسرا آرام کرنے کا ہے؟

سوال:......کیا قربانی کرنے کا صرف ایک ہی دن ہے، دوسرا آرام کرنے کا ہے؟

جواب:......بہر حال.....کہیں بھی قربانی فی یوم الحادی عشر کی نفی ہرگز معلوم نہیں ہوتی ہے۔

.......حاصل یہ ہے کہ اصل تو یہی ہے کہ یوم اول میں قربانی ہو جائے، لیکن اگر اتفاق سے کوئی نہ کر سکا تو اس کے لئے بعد کے ایام میں اجازت ہے، بلکہ ایک روایت علامہ سیوطی (رحمہ اللہ) نے ''خصائص کبریٰ'' میں نقل کی ہے، جس سے یوم القر (قربانی کا دوسرا دن) میں قربانی ثابت ہوتی ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ قربانی کے چار دن کے قائل یا تین دن کے؟ ابن حجر رحمہ اللہ کا تسامح

سوال:......قد روی ابن ابی شیبة من وجه آخر عن ابن عباس رضی الله عنهما : ان المعلومات یوم النحر وثلاثه ایام بعده ، ورجّح الطحاوی هذا لقوله تعالی: ﴿ ویذکروا اسم الله فی ایام معلومات علی ما رزقهم ﴾الخ۔(فتح الباری ص۲٦٦ ج۲)

ابن ابی شیبہ کی مکمل سند مطلوب ہے، پوری سند تحریر فرمادیں۔

امام طحاوی (رحمہ اللہ) کا بیان طحاوی میں نہیں ملتا، امام طحاوی (رحمہ اللہ) نے جو چار دن کی قربانی کو قرآن کی آیت سے ترجیح فرمائی ہے، یہ بیان امام طحاوی (رحمہ اللہ) کی کونسی کتاب میں ہے؟ اس کتاب کا نام اور صفحہ تحریر فرمادیں۔

جواب:......''ابن ابی شیبہ'' کی روایت باوجود تتبع بالغ کے نہیں مل سکی، اس لئے کہ جس قدر مطبوعہ نسخے ہیں اس میں نہیں ہے، اور جو نسخہ قلمیہ ہے اس میں بھی نہیں ملی، لیکن ابن کثیر نے سورۃ الحج کی تفسیر (ص۳/۲۱۷) میں اس کی سند کا کچھ حصہ نقل کیا ہے۔

یہ مذہب ابن عباس (رضی اللہ عنہ) سے متعدد علماء نے نقل کیا ہے کہ قربانی یوم النحر کے بعد تین دن تک ہے۔........

لیکن امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مہذب میں یہ مذہب (حضرت) علی ابن ابی طالب

جبیر بن مطعم اور ابن عباس (رضی اللہ عنہم) سے نقل فرمایا ہے۔ اس کے برخلاف ایک جماعت نے حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہ) سے تین دن نقل کیا ہے، یوم النحر اور دو دن اس کے بعد۔......

اسی طرح یہ مذہب ابن عباس (رضی اللہ عنہ) سے حافظ ابن عبد البر اور علامہ موفق' صاحب المغنی (ص ۱۱/۱۱۴) ابوالحسن کرخی' صاحب ہدایہ (ص ۴۴۶) وغیرہ فقہاء (رحمہم اللہ) نے نقل فرمایا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اثر قربانی کے تین دن ہے' کا حوالہ

سوال:......عینی جو شرح ہے ''بخاری شریف'' (ص ۱۰/۹۰) پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فرمان ہے کہ: قربانی کے تین دن ہیں، امام طحاوی نے بسند جید نقل فرمایا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ''طحاوی'' میں نہیں ملتا، یہ قول امام طحاوی کی کونسی کتاب میں ہے؟ اس کتاب کی پوری سند تحریر فرمادیں۔

صاحب فتح الباری' طحاوی کے حوالہ سے حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہ) کی قربانی چار دن ثابت کرتے ہیں۔ اور علامہ عینی حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہ) کے قول سے بحوالۂ ''طحاوی'' تین دن کی قربانی ثابت کرتے ہیں، اور کتاب ''طحاوی'' میں دونوں قول نہیں ملتے۔

مہربانی فرما کر اپنا قیمتی وقت اس پر خرچ کریں اور اس معمہ کو حل فرمادیں کہ ''فتح الباری'' کی بات صحیح ہے یا علامہ عینی کی؟ ابن عباس (رضی اللہ عنہ) کے دونوں قول کی سند مطلوب ہے۔

جواب:......حافظ ابن حجر (رحمہ اللہ) نے طحاوی کی کس کتاب سے نقل کیا ہے معلوم نہیں

ہوسکا، طحاوی کی کتاب ’’شرح معانی الآثار، شرح مشکل الآثار‘‘ میں یہ مسئلہ سردست نہیں ملا۔

علامہ عینی (رحمہ اللہ) نے جو کچھ نقل کیا ہے وہ تو ’’احکام القرآن‘‘ تصنیف امام طحاوی (رحمہ اللہ) سے کیا ہے۔ علامہ ابن الترکمانی (رحمہ اللہ) نے ’’جوہر نقی‘‘ میں ’’احکام القرآن‘‘ ہی سے نقل کیا ہے، اور بظاہر عینی کی ’’شرح ہدایہ‘‘ کی عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ابن الترکمانی (رحمہ اللہ) کا اقتدا کیا ہے۔

ظن غالب یہ ہے کہ حافظ ابن حجر (رحمہ اللہ) نے تسامح سے کام لیا ہے، کوئی بھی تو طحاوی سے حافظ کے موافق نقل نہیں کرتا ہے، اور احناف کا بیان اس باب میں زیادہ قابل اطمینان ہے، فان صاحب البيت ادری بما فيه۔

حافظ ابن حجر (رحمہ اللہ) بسا اوقات دوسرے کے اتباع میں ’’طحاوی‘‘ سے کچھ نقل کر جاتے ہیں، لیکن وہ خلاف تحقیق ہوتا ہے۔ (آگے حضرت مدظلہم نے اس کی مثالیں بھی دی ہیں)۔ (الیواقت الغالیہ، ملخصاص ۱۰۱ج۱)

تلک عشرة کاملة

اس رسالہ میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے حالات‘ آپ کے بارے میں نااہلوں کے اعتراضات اوران کے جوابات‘ آپ پر طعن کرنے والوں کے طعن کا تحقیقی جائزہ، آپ کے بارے میں غیر احناف اکابر کے تذکرے وتصنیفات، فقہ کی فضیلت وغیرہ امور پر مشتمل بہت ہی مفید اور قابل مطالعہ چیزیں جمع کی گئی ہیں۔

حضرت مولانا قاضی رحمت اللہ صاحب لاجپوری‘ راندیری

ترتیب‘ عنوانات‘ تعارف رسالہ‘ حواشی اوراضافہ

مرغوب احمد لاجپوری

تقریظ

از: حضرت مولانا محمد امین الدین صاحب رحمہ اللہ

میں نے اس رسالہ کو اکثر مقامات سے دیکھا، فاضل مصنف نے سراج الامۃ امام الائمہ کے حالات نہایت حقانیت اور نیک نیتی سے جمع کئے ہیں، اور مخالفین کے اعتراضوں کے جواب نہایت خوبی سے دیئے ہیں۔ خدا تعالیٰ ان کو اس کی جزاء خیر عطا فرمائے، اور ان کی تصنیف کو مقبول کرے، آمین۔

محمد امین الدین

دہلی، سنہری مسجد

....

عرض محشی وتعارف کتاب

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی شخصیت تعارف کی محتاج نہیں، آپ کے مناقب میں صرف علماء احناف ہی نے نہیں بلکہ دوسرے مسالک کے اساطین نے اس قدر کتابیں لکھی ہیں کہ جن کے تعارف کے لئے بھی ایک کتاب چاہئے۔ مگر تعصب اور ضد وعناد کا کیا کہئے کہ ایک طبقہ آپ کی شان میں گستاخی ہی پر تلا ہوا ہے، اور امام رحمہ اللہ پر اعتراضات اور ان کے خلاف کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑنا ان کا شیوہ رہا ہے، ان ہی اعتراضات کے جوابات کے لئے محدث راندیری حضرت مولانا قاضی سید رحمت اللہ صاحب لاجپوری رحمہ اللہ نے یہ رسالہ تالیف فرمایا۔ موصوف نے اس میں دس موضوعات پر بحث فرمائی ہے اسی لئے اس رسالہ کا نام ''تلک عشرة کاملة'' رکھا۔

ایک بحث میں آپ نے دلائل سے اس بات کو ثابت کیا کہ حضرت امام صاحب رحمہ اللہ نے صحابہ کرام کا زمانہ پایا ہے اور آپ کو اللہ تعالی نے شرف تابعیت کے عظیم اعزاز سے معزز فرمایا ہے۔ اس ضمن میں آپ نے یہ بھی لکھا کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کے لئے دعا فرمائی، اس طرح کہ آپ کے والد ثابت جب ان کی خدمت میں گئے تو انہوں نے ان کے لئے اور ان کی اولاد کے حق میں برکت کی دعا فرمائی۔

ایک بحث میں ان لوگوں کے اعتراضات کے جوابات دیئے جو کہتے ہیں کہ حضرت امام رحمہ اللہ تابعی نہیں ہیں۔ اور بہت مدلل اور محقق جوابات سے ثابت فرمایا کہ ان حضرات کے اعتراضات کی کوئی حقیقت نہیں۔

ایک بحث میں اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ کیا امام صاحب رحمہ اللہ عربیت میں ضعیف اور کمزور تھے؟ یہ عجیب لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ امام کو عربیت میں کامل مہارت

حاصل نہیں تھی، موصوف نے اس پر بڑی عمدہ بحث فرمائی اور ثابت کیا کہ یہ اعتراض ہی قلت علم اور جہل کی دلیل ہے۔

ایک بحث میں اس بات کا خلاصہ ہے کہ کیا امام صاحب رحمہ اللہ کو صرف سترہ حدیثیں ہی یاد تھیں؟ ویسے کسی اہل علم کا یہ اعتراض ہو ہی نہیں سکتا، یقیناً کسی جاہل یا ضدی نے ازراہ عناد یہ پروپیگنڈہ کیا کہ آپ کو صرف سترہ حدیثیں یاد تھیں؟ موصوف نے تفصیل کے ساتھ اس پروپیگنڈہ کا ازالہ فرمایا۔

ایک بحث میں امام صاحب پر کیا گیا اس اعتراض کا جواب ہے کہ کیا امام صاحب رحمہ اللہ اور آپ کے اصحاب اہل الرائے تھے؟ اس بحث میں موصوف نے بڑے عمدہ طریقہ پر اس شبہ کا جواب دیا ہے۔

ایک بحث میں ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ پر بعض حضرات نے ضعف کا حکم لگایا، اس کا جواب دیا اور اکابر کے اقوال سے ثابت کیا کہ آپ پر ضعف کا حکم لگانا جہالت اور فن سے ناواقفیت کا ثبوت دینا ہے۔

ایک بحث میں اس بات کو بڑی تحقیق سے لکھا کہ کون سی جرح مقبول ہے اور کون سی مردود؟ اور ثابت کیا کہ امام صاحب رحمہ اللہ پر کی گئی جرح مردود و باطل ہے۔

ایک بحث میں اس بات کا تعارف کیا گیا ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ کے مناقب میں غیر احناف علماء کرام نے تصانیف لکھ کر آپ کی جلالت شان کو جس انداز میں ظاہر کیا وہ قابل تعجب ہے۔

ایک بحث میں امام صاحب رحمہ اللہ کی شان میں مشہور شافعی محدث اور شارح بخاری حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے اقوال کو جامع کیا گیا ہے۔

ایک بحث میں فقہ کی عمدگی اور افضلیت بیان کی گئی ہے۔ایک یہ بھی بحث فرمائی کہ امام ابوحنیفہ پر لوگ قیاس کا الزام لگاتے ہیں، یہ بھی قطعا غلط ہے۔ایک بحث یہ کی کہ امام صاحب رحمہ اللہ مفسر اور مستنبط کلام اللہ تھے، اس بحث میں امام صاحب کی تفسیری نقاط کی چند قابل مطالعہ مثالیں بھی دی گئی ہیں۔

آخر میں رسالہ کی غرض کو واضح فرماتے ہوئے لکھا کہ: مقصد اس سے یہ ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ کو برا کہنے والوں کو غیرت آئے۔

امام صاحب پر کسی بڑے نے اگر کوئی جرح کر بھی دی تو اس سے کون بچا؟ دار قطنی نے امام بخاری امام مسلم رحمہما اللہ پر جرح کی ہے۔ابن تیمیہ ابن قیم محی الدین بن عربی رحمہم اللہ پر کفر و الحاد تک کا حکم لگایا گیا ہے۔رسالہ کے آخر میں بطور خلاصہ امام صاحب رحمہ اللہ پر کئے اعتراضات کو بیان کیا گیا ہے۔

بہر حال رسالہ قابل مطالعہ ہے۔بہت تحقیق اور عمدگی سے اپنے موضوع پر باوجود اختصار کے بہت کچھ مواد لئے ہوا ہے۔

راقم نے اس رسالہ کی ترتیب میں کچھ مفید حواشی کا اضافہ کیا، امید کہ ناظرین کے لئے مفید ہوگا۔بعض مشکل اور غیر مانوس الفاظ کے ترجمے حاشیہ میں کئے گئے ہیں۔اصل رسالہ میں عنوانات نہیں تھے، راقم نے اپنی سمجھ کے مطابق عنوانات قائم کر کے ناظرین کے لئے سہولت مہیا کر دی ہے۔

اللہ تعالی اس خدمت کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما کر باعث نجات و ذخیرۂ آخرت بنائے، اوران سطور کو قبول فرما کر اپنے دین متین کے خدام میں شمار فرمائے، آمین۔

مرغوب احمد لاجپوری

غرض تحریر، از: مؤلف رحمہ اللہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العٰلمین ، والصلوۃ والسلام علی خاتم الانبیاء والمرسلین ، وعلٰی اٰلہ واصحابہ الطیبین الطاھرین اجمعین ، لاسیما علی ائمۃ المجتھدین المستنبطین الٰی یوم الدین۔

امابعد! خاص وعام پر واضح ولائح ہے کہ آج کل اکثر ابناء زمانہ خاص کر غیر مقلدین متعصبین کا یہ طریقہ دیکھا جاتا ہے کہ ائمہ مجتہدین محدثین مستنبطین رضوان اللہ علیہم اجمعین کو خاص کر امام الائمۃ ابوحنیفہ [۱] نعمان [۲] بن ثابت رضی اللہ عنہ کی نسبت: اہل رائے قلت

---

[۱]......ابوحنیفہ: کنیت نام رکھنے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ حنیفہ اہل عراق کے لغت میں دوات کو کہتے ہیں، اور امام صاحب رحمہ اللہ ہر وقت دوات ساتھ رکھتے تھے۔ یا اس لئے کہ امام صاحب رحمہ اللہ کی ایک بیٹی حنیفہ نام کی تھی، لیکن تذکرہ نگاروں کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ: امام صاحب رحمہ اللہ کے صرف ایک بیٹے حماد (رحمہ اللہ) تھے، کوئی اور مؤنث یا مذکر اولاد نہیں تھیں۔ (سیرت امام ابوحنیفہ ص۱۰)

[۲]......ابن حجر مکی رحمہ اللہ نے ''نعمان'' کے تین معنی لکھے ہیں:

(۱)......نعمان: نعمت سے اسم مبالغہ ہے۔ اللہ تعالی نے قرآن پاک میں تکمیل دین کو اتمام نعمت فرمایا تو سب سے بڑی نعمت کی تدوین جس سے ہوئی وہ واقعی اسم بامسمی ''نعمان'' ہیں۔

(۲)......نعمان: ایک گھاس ہوتی ہے جس کی خوشبو دور دور تک پھیلتی ہے، امام عالی مقام کے ذریعے نبی ﷺ کی عالمگیر سنت کی خوشبو پوری دنیا میں پھیلی۔ کسی اور امام کا مذہب اس کا عشر عشیر بھی نہیں پھیلا، اس لئے بھی آپ اسم بامسمی ''نعمان'' ہیں۔

(۳)......نعمان: اس خون کو کہتے ہیں جس پر زندگی کا مدار ہے جو جسم کے ایک ایک بال تک پہنچتا ہے۔ آپ نے پیارے نبی ﷺ کی پیاری سنت کی ایسی تفصیل فرمائی کہ انسان کی پیدائش سے موت تک زندگی کے ہر چھوٹے بڑے مسئلہ کا حل سنت سے تلاش کرلیا۔ اس معنی میں بھی آپ ''نعمان'' ہیں۔

عربیت، غیر مفسّر، غیر ثقہ، قلیل الحدیث، وغیرہ طواعن وخلل اور عیوب کی طرف کرتے ہیں، اور بمصداق ''چھوٹا منہ بڑی بات'' کرنے کو مستعد ہوجاتے ہیں، ماسوااس کے طرح طرح کے اتہام وکذب درکذب ان کے سرلگا کرزمرہ ''لَعْنَتُ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِیْن'' ا میں داخل ہوتے ہیں، ان کے مسائل اجتہادیہ پر طعن وتشنیع کرتے ہیں۔ فقط ''مشکوٰۃ'' وغیرہ کی چند حدیثیں برائے نام دیکھ کر اپنے آپ کو احادیث نبوی ﷺ کا بڑا ماہر وباہر عالم بالحدیث جانتے ہیں، اور مؤول یا منسوخ یا ضعیف ومنکر ومجہول ومضطرب حدیث پر بلاشناخت عمل کرنے کو عمل بالحدیث کہتے ہیں، اور عوام بھولے بھالے سیدھے سادھے حنفیہ کو اس طرح دھوکے دیتے اور بہکاتے پھرتے ہیں کہ تمہارے امام ابوحنیفہ اقتدا کرنے کے لائق نہیں ہیں، تمہارے امام کے تراشے ہوئے مسائل فلاں حدیث کے خلاف ہیں، تمہارے امام کو تابعین محدثین میں ان کے مذہب والوں کے سوا کسی نے داخل نہیں کیا، ادھر عام مقلدین حنفیہ چونکہ اپنے امام کے حالات صحیحہ مدلّلہ بینہ اور مناقبات صریحہ مبرہنہ سے واقف نہیں ہوتے، اس لئے غیر مقلدین متعصبین کے دھوکے اور مکر میں آکر خود اپنے امام اعظم تابعی سے جو کہ خیر القرون کی بشارت سے علی الاصح مبشر ہیں، بدظن ہوجاتے ہیں، اس لئے بنظر خیرخواہی اخوان مقلدین وغیر مقلدین مناسب معلوم ہوا کہ ایک رسالہ جامعہ دس ابحاث اور ایک تنبیہ پر مرتب کیا جائے، باوجودیکہ ایسے گندے اعتراضات وافتراء کے دنداں شکن جوابات باصواب ہوچکے ہیں، مگر پھر بھی اپنی بے حیائی سے اپنی پردہ دری کو فخر سمجھ کر اپنی سفاہت وکم علمی کو ہر زمانہ میں ظاہر کرتے ہیں، لہٰذ ہر زمانہ میں ان کا جواب

نیز آپ کی فقہ بعد والوں کے لئے بھی قوام کا کام دیتی ہے۔ امام مالک، امام شافعی، امام احمد رحمہم اللہ سب نے اس سے استفادہ کیا۔ اس معنی میں بھی آپ اسم بامسمی ''نعمان'' ہیں۔ (تجلیات صفدر ص۱۰۲ ج۱)

ا...... جو جھوٹے ہوں ان پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔ (سورۂ ال عمران، آیت نمبر:۶۱)

بھی جاہلوں کی جہالت اور متجاہلوں کی تجاہل دور کرنے کو مناسب بلکہ انسب ہوا۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کا زمانہ یقیناً پایا ہے

(۱): بحث اول: ہم زمانہ ہونا ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قطعاً و یقیناً......

ناظرین باتمکین [۱] کو معلوم ہو کہ جناب نواب صدیق الحسن خان صاحب مرحوم ''حطہ'' میں اور مولوی عبدالحئ لکھنوی مرحوم ''سعایہ شرح وقایہ'' (کے صفحہ: ۲۷/اور مقدمہ مؤطا امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے صفحہ: ۳۳/میں) تحریر فرماتے ہیں:

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دعا کرنا

اسمٰعیل بن حماد بن النعمان ابی حنیفہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ: ثابت بن زوطی بن ماہ مرزبان، والد ابی حنیفہ رحمہ اللہ فارسی نسل کی اولاد اور آزاد لوگوں میں سے ہیں۔ خدا کی قسم ہم پر رق اور غلامی کبھی واقع نہیں ہوئی، اور یہ بھی کہا کہ: میرے دادا ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی ولادت: ۸۰ھ (اسّی) میں ہوئی۔ اور امام صاحب کے والد ماجد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں پہنچے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے اور ان کی ذریت کے حق میں برکت کی دعا کی ہے، [۲] اور وہ عبارت یہ ہے:

روی الخطیب فی تاریخه عن اسمٰعیل بن حماد بن النعمان ابی حنیفة : ان ثابت بن المرزبان والد ابی حنیفة من ابناء فارس الاحرار، واللّٰه ما وقع علینا رق قط ، ولد جدی ابوحنیفة : ۸۰ ثمانین ، وذهب ثابت الی علی بن ابی طالب فدعا له

---

[۱]...... تمکین: عزت، وقار۔ عزت ووقار والے ناظرین۔

[۲]...... امام صاحب رحمہ اللہ کے پوتے حضرت اسمٰعیل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ہم کو اللہ تعالی سے امید ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دعا ہمارے حق میں قبول ہوئی۔ (تاریخ بغداد ص ۳۲۶ ج ۱۶۔ سیرت امام ابوحنیفہ)

بالبرکة فی ذریته۔

یعنی علامہ خطیب رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ میں اسمٰعیل بن حماد بن نعمان ابی حنیفہ رحمہ اللہ سے روایت کی ہے کہ: ہرآئینہ [۱] ثابت بن مرزبان والد ابی حنیفہ رحمہ اللہ اولاد فارسی میں سے آزاد ہیں، اور خدا کی قسم ہم پر غلامی واقع نہیں ہوئی، [۲] اور میرے جد ابوحنیفہ رحمہ اللہ

---

[۱]...... ہرآئینہ: بے شک، ضرور۔

[۲]......بعض حضرات کو اصرار ہے کہ امام صاحب کا خاندان موالی میں سے ہے یعنی غلامیت کے بعد آزاد کئے گئے ہیں۔ (عرب مؤرخین کی زبان میں موالی غیر عرب کو کہتے ہیں) اگر واقعی یہ بات ہو تو بھی یہ کوئی عیب کی بات نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں بلاد وامصار کے اکثر فقہاء موالی اور اعاجم میں سے تھے۔ اس کی ایک جھلک زہری اور عبدالملک کے مکالمہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ایک مرتبہ ابن شہاب زہری (رحمہ اللہ) عبدالملک کے دربار میں پہنچے تو اس نے کہا: زہری! کیا تم بتا سکتے ہو کہ مسلمانوں کے مختلف امصار اور شہروں میں آج کل سب سے بڑے عالم جو مرجع انام ہوں کون کون لوگ ہیں؟ زہری نے کہا کیوں نہیں؟ فرمایئے کس کس شہر کے ائمہ بتاؤں! تو عبدالملک نے حسب ذیل ترتیب کے ساتھ پوچھنا شروع کیا:

عبدالملک:......تم اس وقت کہاں سے آرہے ہو؟

زہری (رحمہ اللہ):......مکہ معظّمہ سے۔

عبدالملک:......مکہ میں کس شخص کو چھوڑ کر آئے ہو جو اس وقت مکہ والوں میں دینی وعلمی اور روحانی پیشوائی کر رہا ہے؟

زہری (رحمہ اللہ):......عطاء بن رباح، مجاہد، سعید بن جبیر اور سلمان بن یسار (رحمہم اللہ)

عبدالملک:......عرب خاندان کے آدمی ہیں یا موالی سے ان کا تعلق ہے؟

زہری (رحمہ اللہ):......موالی سے۔

عبدالملک:......کس چیز نے عطاء اور ان کے رفقاء کو یہ مقام بخشا؟

زہری (رحمہ اللہ):......علم دین اور احادیث کی روایت نے۔

عبدالملک:......ٹھیک ہے یہ دونوں چیزیں ہیں ایسی کہ آدمی کو پیشوائی عطا کردیں۔ اچھا بتاؤ کہ یمن میں

کی ولادت ۸۰ھ میں ہوئی ہے۔ اور امام صاحب کے والد ثابت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی

مسلمانوں کا پیشوا اور رہنما آج کل کون ہیں؟

زہری(رحمہ اللہ):......طاؤس بن کیسان (اس کا بیٹا اور ابن منبہ)

عبدالملک:......کیا وہ عرب سے نسلی تعلق رکھتے ہیں یا موالی سے ہیں؟

زہری(رحمہ اللہ):......موالی سے۔

عبدالملک:......ان کو کس نے یہ بڑائی عطا کی ہے؟

زہری(رحمہ اللہ):......ان باتوں نے جس نے عطا اور ان کے رفقاء کو بڑھنے کا موقع دیا۔

عبدالملک:......اچھا مصر میں ان دنوں امام کون ہے؟

زہری(رحمہ اللہ):......یزید بن حبیب۔

عبدالملک:......عرب ہے یا موالی سے یہ بھی ہیں؟

زہری(رحمہ اللہ):......ان کا بھی موالی سے تعلق ہے۔

عبدالملک:......اور شام میں پیشوا آج کل کون ہیں؟

زہری(رحمہ اللہ):......مکحول۔

عبدالملک:......عرب ہے یا موالی؟

زہری(رحمہ اللہ):......ان کا بھی موالی سے تعلق ہے، غلام تھے، ہزیل کی ایک عورت نے ان کو آزاد کیا تھا'

عبدالملک یہ سن کر سرخ ہو رہا تھا اور اس کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو گیا' سرد آہیں بھرنے لگا' رگیں پھول گئیں اور تن کھڑا ہو گیا، پھر پوچھا:

جزیزہ یعنی فرات اور دجلہ کے درمیانی علاقوں کا امام کون ہے؟

زہری(رحمہ اللہ):......میمون بن مہران۔

عبدالملک:......مولی ہیں یا عربی؟

زہری(رحمہ اللہ):......مولی ہیں۔

عبدالملک:......فقیہ عراق کون ہیں جن پر عراقیوں کو اعتماد ہو؟

زہری(رحمہ اللہ):......حسن بن ابی الحسن، محمد بن سیرین۔

عبدالملک:......دونوں کی حیثیت کیا تھی؟ موالی تھے یا عرب؟

خدمت میں گئے ،تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے برکت کی دعا ان کے اوران کی اولاد کے حق میں کی۔

پس اس تحریر سے ثابت ہوا کہ جناب ابوحنیفہ رحمہ اللہ ہم عصر صحابہ ہیں، کیونکہ پیدائش امام صاحب کی ۸۰ھ میں بنا بر اصح مذہب کے ہے، اور اس وقت صحابہ متفرق مواضع

زہری (رحمہ اللہ):......دونوں مولی یعنی عجمی تھے۔
عبدالملک: مدینہ کے فقیہ کون ہیں جن کو وہاں پر دینی اور علمی سیادت حاصل ہو؟
زہری (رحمہ اللہ): زید بن اسلم، محمد بن المنکدر راور نافع بن ابی نجیح۔
عبدالملک:......ان کی حیثیت اور نسبت کیا ہے؟
زہری (رحمہ اللہ):......موالی سے ہیں۔ یہ سن کر عبدالملک کا سانس پھولنے لگا۔
عبدالملک:......خراسان کا سب سے بڑا فقیہ کون ہیں؟
زہری (رحمہ اللہ):......ضحاک بن مزاحم اور عطاء بن عبداللہ خراسانی۔
عبدالملک:...... یہ لوگ کون تھے؟
زہری (رحمہ اللہ):......موالی۔
عبدالملک:......ویلک ، (تجھ پر افسوس ہو)

(اس وقت عبدالملک کے چہرے کا مٹیالا پن اور بھی بڑھ رہا تھا اور اس پر ایسی سیاہی چھا رہی تھی کہ دیکھنے والے کو ڈر لگتا تھا)

کہنے لگا آخر یہ بتاؤ کہ کوفہ میں مسلمانوں کی دینی پیشوائی اور فقہی سیادت کون کر رہے ہیں؟
زہری (رحمہ اللہ):......ابراہیم النخعی اور شعبی ۔

(زہری کہتے ہیں کہ: اگر میں اس سے خائف نہ ہو گیا ہوتا تو حکم بن عتبہ اور حماد بن ابی سلیمان کا نام لیتا۔ یہ حضرات موالی سے تھے، مگر مجھے اس میں شر کے آثار نظر آ رہے تھے)

جب میں نے ابراہیم نخعی کا نام لیا تو عبدالملک نے بیساختہ نعرۂ تکبیر لگایا، اور اسے اطمینان کا سانس نصیب ہوا، اس کے بعد کہنے لگا: اف زہری اب جا کر تم نے ایک بات سنائی جس سے غم کا بادل میرے دل سے کچھ ہٹا۔ (امام اعظم ابوحنیفہ کے حیرت انگیز واقعات ص ۲۵۹)

میں موجود تھے، اس کا کوئی فرد بشر انکار نہیں کرسکتا مگر متعصب غبی۔ اور ظاہر ہے کہ جناب امام اعظم صاحب رحمہ اللہ نے چار صحابیوں (رضی اللہ عنہم) کا زمانہ پایا ہے، انس بن مالک اور عبداللہ بن ابی اوفی (رضی اللہ عنہما) کوفہ میں تھے، اور سہل بن سعد الساعدی (رضی اللہ عنہ) مدینہ منورہ میں، اور ابوالطفیل عامر بن واثلہ (رضی اللہ عنہ) مکہ معظّمہ میں تھے، چنانچہ کتب مذکورۃ الصدر میں موجود ہے، اور وہ عبارت یہ ہے:

وادرک ابو حنیفة اربعة من الصحابة : انس بن مالک وعبداللّٰہ بن ابی اوفی بالکوفة ، وسهل بن سعد الساعدی بالمدینة ، وابا الطفیل عامر بن واثلة بمکة۔

یعنی ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے چار صحابیوں (رضی اللہ عنہم) کا زمانہ پایا ہے انس بن مالک اور عبداللہ بن ابی اوفی (رضی اللہ عنہما) کوفے میں تھے، اور سہل بن ساعدی (رضی اللہ عنہ) مدینہ منورہ میں، اور ابوطفیل عامر بن ابی واثلہ (رضی اللہ عنہ) مکہ معظّمہ میں تھے۔

اسی طرح علامہ نواب صدیق الحسن صاحب مرحوم "حطه فی اصول الصحاح السته" (کے صفحہ:۳۵) میں تحریر فرماتے ہیں کہ: علامہ حافظ حجر العسقلانی ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

ادرک الامام ابوحنیفة جماعة من الصحابة ، لانه ولد بالکوفة سنة ثمانین من الهجرة ، وبها یومئذ من الصحابة عبد اللّٰہ بن ابی اوفي ، فانه مات بعد ذلک بالاتفاق ، وبالبصرة یومئذ انس بن مالک ومات سنة تسعین اوبعدها۔

یعنی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے زمانہ جماعت صحابہ کا پایا ہے، کیونکہ ان کی ولادت کوفہ میں سن ۸۰ھ میں ہوئی ہے، اور اس وقت کوفہ میں صحابہ (رضی اللہ عنہم) میں سے عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ تھے، اور ان کی وفات بعد پیدائش امام صاحب کے بالاتفاق ہے، اور بصرہ

میں اس وقت انس بن مالک رضی اللہ عنہ، اوران کی وفات ۹۰ر میں ہوئی ہے یا بعد اس کے،

پس اس عبارت سے بھی قطعاً ثابت ہوگیا کہ امام اعظم رحمہ اللہ ہم عصر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تھے۔[۱]

اوراسی طرح ''حطہ'' کی دوسری عبارت (صفحہ:۳۵) میں ہے:

وقال ابن حجر المكي فی شرح المشكوٰة : ادرک الامام الاعظم ثمانية من الصحابة ، منهم انس بن مالک ، وعبداللّٰه بن ابی اوفٰی ، وسهل ابن سعد ، وابو الطفيل ، انتهٰی۔

ف:...... یہ عبارتیں کتب احناف میں بھی ہیں، لیکن غیر مقلدین کی کتاب اور امام شافعی وغیرہ کے مقلدین کی کتب معتبرہ متداولہ بروایۂ صحیحہ صریحہ سے امام اعظم رحمہ اللہ کا ہم زمانہ ہونا صحابہ رضی اللہ عنہم کے احقر نے ثابت کردکھایا تاکہ بعض غیر مقلد متعصب کا میدان اعتراض وطعن کا انسداد بدرجۂ اکمل ہوجائے، اور پھر کسی طرح کلام مالا یرام کی جگہ نہ رہے، **النصيحة منا والهداية من اللّٰه۔**

---

[۱]......اس لئے کہ امام صاحب کی پیدائش ۸۰ھ میں ہے اور ۸۰ھ کے بعد درج ذیل صحابہ کرام کا انتقال ہوا ہے:

حضرت واثلہ بن اسقع کی وفات ۸۳ھ یا ۸۵ھ میں، حضرت عمر بن حریث کی ۸۵ھ میں، حضرت عبد اللہ بن جزاء ۸۵ھ میں، حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی ۸۷ھ میں، حضرت عبد اللہ بن بسر ۸۸ھ میں، حضرت عبد اللہ بن جعفر کی ایک روایت کے مطابق ۹۰ھ میں، حضرت سائب بن خلاد کی ۹۱ھ میں، حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کی ۹۱ھ یا ۹۲ھ یا ۹۴ھ میں، حضرت انس کی ۹۳ھ میں، حضرت عبد اللہ بن بسر رضی اللہ عنہ کی ۹۶ھ میں، حضرت ابو الطفیل (عامر بن واثلہ) کی ۱۱۰ھ میں، رضی اللہ عنہم اجمعین۔

امام ابوحنیفہ تابعی نہیں ہیں، معترضین کی عبارتیں اوران کے جوابات

(۲): بحث ثانی: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے تابعی ہونے میں......

ناظرین باتمکین کو واضح ہو کہ بعض غیر مقلدین متعصبین کو اصرار ہے کہ ابوحنیفہ رحمہ اللہ تابعی نہیں ہیں، اوران کی دلیلیں نو عبارتوں اور نو اقوال پر منحصر ہیں:

اول: عبارت کردری رحمہ اللہ کی ہے جو منقول شرح مسند امام ملا علی قاری رحمہ اللہ سے ہے:

جماعة من المحدثين انكروا ملاقاته مع الصحابة واصحابه اثبتوه۔

یعنی ایک جماعت نے محدثین میں سے انکار کیا ہے امام اعظم کی ملاقات ہونے کا صحابہ کے ساتھ، اوران کے مقلد ثابت کرتے ہیں۔

جواب اس کا یہ ہے کہ: یہ عبارت دلالت نہیں کرتی، مگر اس بات پر کہ بعض جماعت محدثین نے انکار امام اعظم رحمہ اللہ کی ملاقات کا صحابہ سے کیا ہے، اور یہ نہیں ثابت ہوتا ہے کہ اکثر محدثین نے انکار ملاقات کیا ہے، اور یہ بھی نہیں ثابت ہوتا ہے کہ اکثر محدثین امام اعظم رحمہ اللہ کے تابعی ہونے کا انکار کرتے ہیں، بلکہ یہ ثابت ہوا کہ جب بعض محدثین انکار کرنے والے ہوئے تو معلوم ہوا کہ اکثر محدثین اثبات تابعیت پر مستقیم ہیں''وللاكثر حكم الكل''

اوردوسری عبارت منکرین کی یہ ہے:

عبارة الاكمال في اسماء رجال المشكوة : كان في ايام ابي حنيفة رحمة الله عليه اربعة من الصحابة : انس بالبصرة، وعبدالله بن ابي اوفى بالكوفة، وسهل بن سعد بالمدينة، وابو الطفيل عامر بن واثلة بمكة، ولم يلق احدا منهم ولا اخذ عنهم، انتهى۔

یعنی ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے زمانہ میں چار صحابہ تھے: انس رضی اللہ عنہ بصرہ میں، اور عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کوفہ میں، اور سہل بن سعد رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ میں، اور ابوالطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ مکہ معظّمہ میں، اور نہ امام صاحب کی کسی سے ملاقات ہوئی ہے اور نہ کسی سے اخذ کیا۔

جواب اس کا یہ ہے کہ: اس قول میں کلیہ اور اکثریہ کا کچھ ذکر نہیں، باوجود اس کے عدم ملاقات اور عدم اخذ سے عدم رویت ثابت نہیں ہوتی، اور جب عدم رؤیت ثابت نہیں ہوئی تو رؤیت ثابت ہوئی۔ (چنانچہ عبارات متعددہ سے رؤیۃ امام صاحب کی انس رضی اللہ عنہ سے ثابت ومبرہن ہے۔۱۲ منہ) وہوالمقصود۔

تیسری عبارت ''جامع الاصول'' کی ہے:

کان فی ایّام ابی حنیفة اربعة من الصحابة : انس بن مالک بالبصرة ‘ وعبداللّٰه بن ابی اوفی بالکوفة ‘ وسهل بالمدینة ‘ وابو الطفیل بمکة ، ولم یلق احدا منهم ولا اخذ عنهم واصحابه ، یقولون : انه لقی جماعة من الصحابة وروی عنهم ، ولایثبت ذلک عند اهل النقل، انتهٰی۔

یعنی تھے زمانے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے چار صحابہ: انس بن مالک بصرہ میں، اور عبداللہ بن ابی اوفی کوفہ میں، اور سہل مدینہ منورہ میں، اور ابوالطفیل مکہ معظّمہ میں، لیکن نہ کسی سے ملاقات ہوئی اور نہ کسی سے اخذ کیا، اور ان کے مقلدین کہتے ہیں کہ امام صاحب نے ملاقات صحابہ سے کی ہے، اور ان سے روایت بھی کی ہے، اور نزدیک اہل نقل کے یہ ثابت نہیں ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ: اس میں لقا اور روایت کی نفی ہے رؤیت کی نفی نہیں، اور لقا اکثر

مستعمل ہوتا ہے بمعنی اخص من الرؤیۃ، اور شاہد اس بات پر دارقطنی کا قول ہے:

لم یلق ابو حنیفة احدًا من الصحابة ، الّا انه راٰی انسا بعینیه ، انتهی ، کما نقله السیوطی فی تبییض الصحیفة فی مناقب ابی حنیفة۔

یعنی نہیں ملاقات کی ہے ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کسی صحابی سے، مگر دیکھا ہے انس رضی اللہ عنہ کو، جیسا کہ اس کو نقل کیا ہے سیوطی نے ''تبییض الصحیفه بمناقب ابی حنیفه'' (رحمہ اللہ) میں۔

چوتھی عبارت ''علل متناہیہ'' کی ہے: ابن جوزی نے علل متناہیہ میں لکھا ہے:

وابو حنیفة لم یسمع عن الصحابة وانما رأی انس بن مالک بعینیه کذا نقل عنه صاحب أوشحة الجید۔

قال الدار قطنی : لایصح لابی حنیفة سماع من انس ولارؤیة ، ولم یلق احدًا من الصحابة ۔

یعنی دارقطنی نے کہا کہ: نہیں صحیح ہے ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا سماع انس رضی اللہ عنہ سے اور نہ رؤیت اور نہ ملاقات صحابہ سے۔

جواب یہ ہے کہ: اس عبارت مذکورہ سے نہیں ثابت ہوتا مگر انکار دارقطنی کا نہ انکار اکثر محدثین کا، پس یہ عبارت مفید انکار کل اور اکثری کو نہیں ہے، لہٰذا یہ مدعا ثابت نہیں۔

پانچویں عبارت ''وفیات الاعیان'' کی ہے:

ادرک ابو حنیفة اربعة من الصحابة ، ولم یلق احدا منهم ولااخذ عنهم ، واصحابه یقولون : لقی جماعة من الصحابة وروىٰ عنهم ، ولم یثبت ذلک عند اهل النقل۔

اوراسی طرح چھٹی عبارت طاہر پٹنی کی ''تذکرہ'' میں ہے:

کان فی ایام ابی حنیفة اربعة من الصحابة ، ولم یلق واحدا منھم ولا اخذ عنھم واصحابه یقولون : انه لقی جماعة من الصحابة ، رویٰ عنھم ، ولم یثبت ذلک عند اھل النقل۔

اورساتویں عبارت ''تقریب'' میں حافظ ابن حجر کی ہے:

النعمان بن ثابت الکوفی ابوحنیفة : الامام : اصله من فارس ، وقیل مولیٰ بنی تیم ، فقیه مشھور من السادسة ، اي الّذین عاصروا الخامسة ولم یثبت لھم لقاء احد من الصحابة۔

اورآٹھویں عبارت ''مرآۃ الجنان'' یافعی کی ۱۵۰ھ کے حوادث میں:

فیھا توفی فقیه العراق الامام ابوحنیفة النعمان بن ثابت الکوفی ، مولدہ سنة ثمانین ، رأی انسا وروی عن عطا بن ابی رباح وطبقته ، وکان قد ادرک اربعة من الصحابة ھم انس ' وعبداللّٰہ بن ابي اوفیٰ ' وسھل وابو الطفیل، قال بعض اصحاب التاریخ : ولم یلق احدًا منھم ولا اخذ عنھم، واصحابه یقولون : لقی جماعة من الصحابة وروی عنھم ، ولم یثبت ذلک عند اھل النقل ۔

ان عبارات سے منکرین استدلال کرتے ہیں امام صاحب کے تابعی نہ ہونے پر۔اور جوابات گزرچکے ہیں کہ ان عبارتوں سے ثابت نہیں ہوتا کہ ابوحنیفہ تابعی نہیں ہیں، باوجود اس کے عبارت ثالثہ اور خامسہ اور سادسہ اور ثامنہ کا ملخص یہ ہے کہ ''لم یثبت ذلک عند اھل النقل '' اور منکرین کا اس عبارت سے دلیل پکڑنا سخافت اور ضعف سے خالی نہیں ہے بچند وجوہ:

پہلی وجہ ضعف کی یہ ہے کہ......لفظ ''ذلک '' سے پہلے ان عبارتوں میں دو باتیں ذکر ہیں: ایک ملاقات، دوسرے اخذ روایت، پس عدم ثبوت کی جو نفی کی جاتی ہے وہ نفی دونوں

امروں کی طرف ہے نہ ایک جانب، پس یہ عبارت نہیں دلالت کرتی مگر تحقق پر ان دو امروں کے معاً۔ ہاں مجرد رؤیت ثابت ہے جو ثبوت تابعیت کے لئے مذہب صحیح پر کافی اور وافی ہے، لفظ ذلک سے پہلے ان عبارتوں میں روایت اور ملاقات معًا ہے، یعنی دونوں کو ملا کر نزدیک اہل نقل کے ثابت نہیں، تنہا ملاقات کا ذکر نہیں ہے، پس بنابریں یہ عبارت نہیں دلالت کرتی ہے مگر تحقق پر ان دونوں امروں کے معاً جیسا کہ گئے ہیں ان کے مقلدین کہ روایت وملاقات دونوں ثابت ہیں لیکن اہل نقل کے نزدیک یہ یقیناً ثابت نہیں، نہ مجرد ملاقات اور رؤیت کے عدم پر کہ جو مدار تابعیت کا ہے اقوال صحیحہ کے بنا پر۔

اور دوسری وجہ ضعف کی یہ ہے کہ.....عبارات مذکورہ میں لفظ ''ذلک'' سے قبل ملاقات ایک جماعت صحابہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، یہ اہل نقل کے نزدیک ثابت نہیں۔ پس نہیں دلالت کرے گی عبارت مذکورہ مگر عدم ثبوت ملاقات جماعت صحابہ پر۔ یہ نزدیک علماء اہل نقل کے ثابت نہیں، اور نہیں دلالت کی ہے اس عبارت نے عدم ثبوت رؤیت صحابی واحد مثل انس ابن مالک کے، اور یہ کافی ہے تابعی ہونے کے لئے اہل نقل کے نزدیک۔

اور تیسری وجہ یہ ہے کہ.....قبل لفظ ''ذلک'' کے عبارۃ مذکورہ میں مذکور نہیں ہے مگر ملاقات نہ رؤیت، اور اکثر وقت لقا یعنی ملاقات مستعمل ہوتا ہے بمعنی اخص رؤیت کے، اور گواہ اس بات پر قول دارقطنی کا ہے:

لم يلق ابو حنيفة احدًا من الصحابة الا انه رأى انسا بعينيه ۔

یعنی نہیں ملاقات کی ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کسی صحابی سے مگر حضرت انس رضی اللہ عنہ کو بعینہ دیکھا۔

چنانچہ نقل کیا اس کو سیوطی نے ''تبييض الصحيفة في مناقب ابي حنيفة ''میں، اور

اگراس سے زیادہ بیان وحجج پر مطلع ہونا ہوتو وکیل احمد صاحب کی'' نصرة المجتهدين برد هفوات غير المقلدين '' کا مطالعہ اور ملاحظہ فرمایئے،اور میں نے بخوف طوالت ترک کرنا مناسب سمجھا۔

اگر کوئی اعتراض کرے کہ امام اعظم صاحب کے تابعین میں ہونے کا قائل کوئی محدث نہیں،اگراس کا کوئی قائل ہوتو بتلاؤ!

تو جواب اس کا یہ ہے کہ: کیا خطیب اور نووی محدثین میں نہیں ہیں، بلکہ محدثین میں سے ان کا ہونا اظہر من الشمّس ہے باوجودیکہ یہ دونوں تصریح اور تنصیص کرتے ہیں کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تابعی ہیں۔دیکھوقول علامہ نووی رحمہ اللہ کا'' تهذيب الاسماء واللغات ''میں:

قال الخطيب البغدادى فى التاريخ : هو ابوحنيفة التيمى فقيه اهل العراق رأى انس بن مالک ، الخ۔

یعنی خطیب بغدادی نے تاریخ میں کہا ہے کہ:ابوحنیفہ تیمی فقیہ اہل عراق کے ہیں،دیکھا ہے انہوں نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو۔

اور کیا دار قطنی اور ابن جوزی علماء محدثین میں سے نہیں ہیں؟ بلکہ بالاتفاق یہ دونوں بھی محدثین میں سے ہیں، باوجود اس کے یہ دونوں بھی تصریح کرتے ہیں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے تابعی ہونے کی،چنانچہ علامہ ابن جوزی'' علل متناهيه فى الاحاديث الواهيه '' میں فرماتے ہیں:

قال الدار قطني : لم يسمع ابوحنيفة احدا من الصحابة ، وانما رأى انس ابن مالک بعينيه۔

یعنی دارقطنی نے کہا کہ: ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کسی صحابی سے نہیں سنا ہے اور کسی کو نہیں دیکھا ہے، مگر انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو۔

پس منکرین تابعیت کے اقوال باطل اور مردود ہو گئے، اور ابن حجر وغیرہ محدثین (رحمہم اللہ) کا کلام متفق ہے اس بات پر کہ ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے انس (رضی اللہ عنہ) کو دیکھا ہے، لہٰذا ثبوت تابعیت کے لئے کافی ہے، اور متقدمین ومتاخرین متفق ہیں، اور یہی قول ارجح اور بہتر ہے، دیکھئے! قول علی القاری المکی کا طبقات حنفیہ میں:

قد ثبتت رؤیته لبعض الصحابة ، واختلف فی روایته عنهم ، والمعتمد ثبوتها کما بینته فی سند الانام شرح مسند الامام ' حال اسناده الی بعض الصحابة الکرام، فهو من التابعین الاعلام ' کما صرح به العلماء والاعیان ' داخل تحت قوله تعالیٰ: ﴿والذین اتبعوهم باحسان﴾ وفی عموم قوله علیه السلام : ((خیر القرون قرنی ثم الّذین یلونهم))، رواه الشیخان ، ثم اعلم ان جمهور علماء الحدیث علی ان الرجل بمجرد اللقیٰ والرؤیة یصیر تابعیا ولایشترط ان یصحبه مدة۔

یعنی ثابت ہے رؤیت امام صاحب کی بعض صحابہ کو، اور روایت میں اختلاف ہے، اور معتمد ثبوت روایت ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے، اس کو "سند الانام شرح مسند الامام" میں، پس یہ امام صاحب تابعین اعلام سے ہیں جیسا کہ تصریح کی ساتھ اس کے علماء اعیان نے، اور داخل ہیں تحت میں: **قوله تعالیٰ ﴿والذین اتبعوهم باحسان﴾** کے، اور داخل ہیں عموم میں: قوله علیه السَّلام: **((خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم))** کے۔ روایت کی ہے اس کو بخاری اور مسلم نے۔[۱]

---

[۱]......ان الفاظ سے یہ روایت ثابت نہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھئے! مرغوب الفتاوی ص۴۹۸ ج۱۔ مرغوب الرسائل فی عمدة المسائل ص۳۵۳ ج۲۔ مرغوب الفقه ص۱۰۷ ج۱۲۔

پھر جمہور علماء حدیث کا یہ مذہب ہے کہ رجل بمجرد ملاقات اور رؤیت کے تابعی بن جاتا ہے،اور تابعی ہونے کی یہ شرط نہیں ہے کہ مدت دراز تک صحبت صحابی میں رہے۔

اور دیکھئے! شرح الشرح نخبۃ الفکر میں بحث تعریف تابعی میں:

قال العراقی : وعليه عمل الاكثر ين ، قلت : وبه يندرج الامام الاعظم فی سلک التابعين ، فانه قد رأى انسا وغيره من الصحابة على مَا ذكره الامام الجزری فی اسماء الرجال القراء ، والتورپشتی فی تحفة المرشد ، وصاحب كشف الكشاف فی تفسير سورة المؤمنين ، وصاحب مراٰة الجنان وغيرهم من العلماء المتبحرين ، فمن نفى انه تابعی فإما من التتبع القاصر أو التعصب الفاتر۔

یعنی علامہ عراقی رحمہ اللہ نے کہا کہ:اس پر عمل اکثر علماء کا ہے،یعنی تابعی ہونے کے لئے رؤیت صحابی کافی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ: بنا براس قول کے امام اعظم رحمہ اللہ داخل ہوئے سلک تابعین میں، کیونکہ امام اعظم رحمہ اللہ نے انس رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ کو دیکھا ہے۔ بنا بر اس کے کہ امام جزری رحمہ اللہ'' اسماء الرجال القراء'' میں، اور علامہ تورپشتی نے'' تحفۃ المرشد'' میں اور صاحب کشف الکشاف' نے تفسیر سورہ المومنین میں، اور صاحب مرآۃ الجنان وغیرہ علماء متبحرین نے تصریح کی ہے۔ پس جو کہ نفی کرتا ہے امام صاحب کے تابعی ہونے کی وہ قاصر ہے تتبع کرنے میں، یا تعصب سے انکار کرتا ہے۔

اور دیکھئے! قول ذہبی کا کاشف میں'' رأى انسا رضی اللّٰه عنه ''یعنی امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے انس رضی اللہ عنہ کو دیکھا ہے۔

اور دیکھئے! قول علامہ ذہبی کا'' تذکرۃ الحفاظ'' میں:'' رأى انس ابن مالک غير مرة لما قدم عليهم الكوفة ''یعنی دیکھا امام اعظم نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو چند مرتبہ

جب کہ تشریف لائے وہ کوفہ میں۔

اور دیکھئے! قول ابی الحجاج مزی کا ''تہذیب الکمال'' میں '' رأی انسا رضی اللّٰہ عنه'' الخ، یعنی دیکھا امام اعظم رحمہ اللہ نے انس رضی اللہ عنہ کو۔

اور دیکھئے! قول احمد قسطلانی کا ''ارشاد الساری شرح صحیح البخاری'' ''باب وجوب الصلوٰة فی الثیاب '' میں ''ومن التابعین الحسن البصری وابن سیرین والشعبی وابن المسیب وابو حنیفة '' یعنی تابعین میں سے حسن بصری اور ابن سیرین اور شعبی اور ابن المسیب وابوحنیفہ رحمہم اللہ۔

اور دیکھئے! قول یافعی کا ''مرآة الجنان'' میں ''رأیٰ انسا رضی اللّٰہ عنه '' یعنی امام اعظم رحمہ اللہ نے دیکھا ہے انس رضی اللہ عنہ کو۔

اور دیکھئے! قول یافعی کا اسی ''مرآة الجنان'' میں ''ذکر الخطیب فی تاریخ بغداد : انه رأی انس بن مالک '' یعنی خطیب رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے تاریخ بغداد میں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے دیکھا ہے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو۔

اور دیکھئے! قول ولی العراقی رحمہ اللہ کا، چنانچہ سیوطی رحمہ اللہ نے اس کو نقل کیا ہے ''قد رأی انس بن مالک رضی اللّٰہ عنه '' یعنی دیکھا ہے انس بن مالک کو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے۔

اور دیکھئے! قول ابن الجوزی کا ''انما رأی انس بن مالک بعینیه ' یعنی دیکھا ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو (اپنی آنکھوں سے)۔

اور دیکھئے! قول دارقطنی کا چنانچہ اس کو سیوطی نے نقل کیا ہے '' لم یلق احدا من الصحابة الا انه رأیٰ انسا رضی اللّٰہ عنه ''

اور دیکھئے! قول نووی رحمہ اللہ کا ''تہذیب الاسماء واللغات'' میں ''قال الخطیب البغدادی فی التاریخ : ابو حنیفة امام اصحاب الرأی و فقیه اهل العراق رأیٰ انس بن مالک رضی الله عنه ''یعنی خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے تاریخ میں کہا ہے کہ: ابوحنیفہ رحمہ اللہ امام اصحاب رائے اور فیقہ اہل عراق نے دیکھا ہے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو۔

اور دیکھئے! قول ابن حجر مکی ہیثمی کا ''خیرات الحسان فی مناقب النعمان'' میں ''صح کما قاله الذهبی : انه رأی انس بن مالک وهو صغیر ، وفی روایة مراراً ، واکثر المحدثین علی ان التابعی من لقي الصحابی وان لم یصحبه ، صححه النووی کابن الصلاح ''یعنی صحیح ہے جیسا کہ کہا ہے اس کو ذہبی نے کہ: دیکھا ہے امام اعظم صاحب نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو اپنی صغرسنی کے زمانہ میں، اور ایک روایت میں ہے کہ: دیکھا ہے چند بار، اور اکثر محدثین اس قول پر ہیں کہ تابعی وہ ہے کہ ملاقات کرے صحابی کی، اگرچہ مصاحبت دراز نہ ہوئی ہو، اس قول کی تصحیح کی نووی نے مثل ابن صلاح کے۔

اور دیکھئے! قول ابن عابدین کا ''ردالمختار'' میں ''علی کل حال فهو من التابعین ولمن جزم بذلک الحافظ الذهبی والحافظ العسقلانی وغیرهما ''یعنی ہر حال میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تابعین میں سے ہیں، اور اسی کا جزم کیا حافظ ذہبی اور حافظ عسقلانی نے اور سوا ان دونوں کے۔

اور دیکھئے ''تذکرۃ الراشد'' میں ہے: ''ماوقع للعینی انه اثبت سماعه عن الصحابة رده علیه صاحبه الحافظ قاسم الحنفی ، والظاهر ان سبب عدم سماعه ممن ادرکه من الصحابة انه في اول امره اشتغل بالکتاب حتی ارشده الشعبی لما رأیٰ من باهر نجابته الیٰ الاشتغال بالعلم ''یعنی علامہ عینی رحمہ اللہ نے ثابت کیا ہے کہ سماع امام ابوحنیفہ

رحمہ اللہ کا صحابہ سے، لیکن رد کیا اس کو ان کے صاحب حافظ قاسم حنفی رحمہ اللہ نے، اور ظاہر یہ ہے کہ ہر آئینہ سبب عدم سماع امام صاحب کا ان کے ابتداء امر میں اس لئے تھا کہ یہ مشغول تھے ساتھ کتاب اللہ کے یہاں تک کہ جب ان کو شعبی رحمہ اللہ نے دیکھا کہ ان کی نجابت ظاہر ہے تو ہدایت کی ان کو علم کی طرف مشغول ہونے کی۔

اور دیکھئے! قول سیوطی کا "قد الف ابو معشر عبدالکریم بن عبدالصمد الطبری المقري الشافعی جزءًا فیھا رواہ ابو حنیفة عن الصحابة" یعنی ابو معشر عبدالکریم بن عبدالصمد الطبری المقری الشافعی نے ایک جز اس بیان میں تالیف کیا ہے کہ: ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے صحابہ سے روایت کی ہے۔

اور دیکھئے! قول علامہ ازینقی کا "مدینۃ العلوم" میں "قد ثبت بھذا التفصیل ان الامام من التابعین" یعنی ہر آئینہ ثابت ہوا اس تفصیل سے کہ البتہ امام اعظم تابعین میں سے ہیں،

پس یہ علماء ثقات اور اَثبات مثل دار قطنی اور ابن سعد اور خطیب اور ذہبی اور ولی العراقی اور ابن حجر المکی اور علی القاری۔ اور اکرم السندی مؤلف امعان النظر نے علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ کا ذکر کیا ہے کہ جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے اور اس کو ثابت کیا ہے، اور ابو معشر اور حمزۃ السہیلی اور جزری اور تورپشتی اور سیوطی اور قسطلانی اور سراج اور ازینقی اور ابن عابدین الشامی اور یافعی اور عینی وغیرہ علماء محدثین ومقلدین شافعی وغیرہم مداح امام اعظم رحمہ اللہ کے ہیں۔ پس باوجود اس کے اختیار کرنا قول بعض متعصبین کا گمراہی اور خلل دماغ سے خالی نہیں۔ اگرچہ بعض نے اس بارے میں خلاف کیا ہے، لیکن اس کے دنداں شکن جوابات اوپر گذر چکے ہیں، اور جو منکر ہیں وہ نافی ہیں، اور اصول حدیث وفقہ کا قاعدہ مسلمہ ہے کہ جب اقوال مثبت کے معارض نافی کے ہوں تو مثبت نافی پر مقدم ہوتا ہے، پس بنا بر اس

قاعدے کے بھی امام اعظم رحمہ اللہ کو تابعی کہنے والوں کا قول مرجح اور مقدم ہوگا جیسا کہ ''شرح نخبۃ الفکر'' اور ''تنقیح الاصول'' اور ''تلویح'' اور ''منار'' اور ''مرآۃ الاصول شرح مرقاۃ الوصول'' وغیرہ میں تصریح کی ہے ''المثبت مقدم علی النافی، بحث فی رد الطعن علی ابی حنیفة رحمة اللّٰہ علیه بقلة العربیة۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر قلت عربیت کا الزام اور اس کا جواب

جن لوگوں نے جناب ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو قلت عربیت کی طرف منسوب کیا ہے۔ان کے پاس کوئی دلیل سوا اس ایک حکایت کے نہیں ہے جو ''تاریخ ابن خلکان'' میں مع جواب کے موجود ہے، مگر متعصبین غیر مقلدین نے ابن خلکان کی حکایت کے اول جملہ کو لے لیا ہے اور ثانی جملہ جو جواب اس کا تھا اس کو ترک کر دیا، اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ کوئی جاہل بے نمازی دلیل پکڑ لے ''لاتقربوا الصلوٰة'' کو ''وانتم سکاریٰ'' کو چھوڑ دے، مگر یہ نہیں جانتے کہ جب اہل علم منصف مزاج دیکھیں گے تو کیا سمجھیں گے؟

''ابن خلکان'' کی عبارت نقل کر کے پیش ناظرین منصفوں کے پیش کی جاوے گی، بلکہ خباثت ناحق اور بے اصل طعن کرنے کی طاعنین پر ہی واقع ہوگی، میں بعینہ وہ عبارت نقل کرتا ہوں:

فمثل هذا الامام لایشک فی دینه ولا ورعه وحفظه، ولم یکن یعاب بشیء سوی قلة العربیة ، فمن ذلک ما روي ان ابا عمر وبن العلاء المقری النحوی سأله عن القتل بالمثقل هل یوجب القود ام لا ؟ فقال : لا کما هو قاعدة مذهبه ، خلافا للشافعی ، فقال له ابو عمرو : ولو قتله بحجر المنجنیق ؟ فقال : ولو قتله بأبا قبیس، یعنی الجبل المطل علی مکة ، وقد اعتذروا عن ابی حنیفة بانه قال : ذلک علی لغة

من يقول ان الكلمات الستة المعربة بالحروف وهى : ابوه ' واخوه ' وحموه ' و هنوه ' وفوه ' وذو مال اعرابها يكون فى الاحوال الثلث بالالف ، وانشدوا فى ذلك

ان اباها و ابا اباها قد بلغا فى المجد غايتاها

وهى لغة الكوفيين وابوحنيفة من اهل الكوفة فهي لغته ، والله اعلم۔ ١

یعنی پس اس جیسے امام کے دین وورع اور تحفظ میں شک نہیں کیا جا سکتا، اور سواء قلت عربیت کے اور کوئی عیب نہیں لگایا گیا (لیکن یہ کوئی عیب اور جرح نہیں ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر نے مقدمۂ فتح الباری میں اس کی تصریح کردی۔ فانظرثمہ)

پس منجملہ اس کے ایک یہ روایت ہے کہ: ابوعمرو بن علاء نحوی نے امام صاحب سے سوال کیا، قتل بالمثقل کے بارے میں کہ اس سے قصاص واجب ہوتا ہے یا نہیں؟ تو آپ نے جواب دیا نہیں جیسا ان کے مذہب کا قاعدہ ہے، امام شافعی صاحب کے خلاف، پھر کہا ابوعمرو نے: اگر چہ منجنیق کے پتھر سے اس کو قتل کرے جب بھی قصاص واجب نہیں ہوگا؟ امام صاحب نے جواب دیا کہ: اگر چہ قتل کردے اس کو جبل ابا قبیس سے یعنی دراز پہاڑ سے جو مکہ میں ہے (یہاں اعتراض کا منشا یہ ہے کہ ابی قبیس کے بجائے امام صاحب نے ابا قبیس کہا ہے جو نحوی قاعدہ کے خلاف ہے) اور امام صاحب کی طرف سے علماء نے جواب یوں دیا ہے کہ: ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس شخص کی لغت پر جواب دیا ہے جو کلمات ستہ معربہ بالحروف کا اعراب تینوں حالتوں میں الف کے ساتھ مانتا ہے، وہ کلمات چھ یہ ہیں۔ ابوه ' اخوه ' حموه ' هنوه ' فوه ' ذومال ، اوراس کے استدلال میں انہوں نے ایک عرب کے شاعر کا شعر پیش کیا ہے اور وہ یہ ہے:

١......وفیات الاعیان، لابن خلکان ص ١٦٥ ج ٢۔

''ان اباها و ابا اباها ''اس میں ''وابا ابی ھا'' کی جگہ ''وابا اباھا'' شاعر نے باندھا ہے، یہ کوفیوں کی لغت ہے، اور ابوحنیفہ کوفی ہیں۔ پس امام صاحب کا '' بأبا قبیس '' کہنا ''بابی قبیس '' کی جگہ صحیح ہے، لہٰذا اعتراض اٹھ گیا۔ بعد اس جواب کے کوئی قلت عربیت کا الزام لگائے تو جہالت ہے ''نعوذ باللہ من کید المتعصبین ''جواب قوی ومدلل ومبرہن ہے۔ چنانچہ ''الفیہ''اور شرح الفیہ ''بہجۃ المرضیہ'' اور علامہ سیوطی کی شرح میں ہے:

والنقص فی ھذا الاخیر وھو : ھن بان یکون معربا بالحرکات علی النون احسن من الاتمام ، قال علیہ الصلوۃ والسلام : من تعزی بعزیٰ الجاھلیۃ فاعضوہ بھن ابیہ ، وفی اب وتالیہ وھما اخ وھم یندرأی یقل وقصرھا أی قصر اب واخ وھم بان یکون بالالف مطلقا من نقصھن اشھر کقولہ :

ان اباھا و ابا اباھا قد بلغا فی المجد غایتاھا

اور ماسوائے اس کے ابن عقیل اور مکووی وغیرہ سے شرح الفیہ ابن مالک میں تصریح موجود ہے، پس امام صاحب پر کوئی دھبہ قلت عربیت کا نہیں لگتا، اس کے بعد ''من شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر'' کا اختیار باقی ہے، فتأمل ولا تکن من المعاندین۔

کیا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو صرف سترہ حدیثیں یاد تھیں؟

بحث چہارم: رد میں اس بات کے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو فقط: ۱۷/حدیثیں پہونچی ہیں......

ناظرین اہل انصاف پر مخفی نہ رہے کہ جس امام کے علماء محدثین ومقلدین امام شافعی اور امام مالک اور امام احمد کے یعنی غیر مذہب والے ثنا خوان ابوحنیفہ کے ہوں، اور مثل آفتاب نصف النہار کے روشنی بخشیں تمام جہان میں مشرق سے مغرب تک اور جنوب سے شمال تک جس کا مذہب ہو، اور بڑے بڑے مجتہدین مثل امام شافعی اور امام محمد اور امام ابو یوسف رحمہم

اللہ اور امام بخاری اور دارقطنی (رحمہم اللہ) وغیرہ جن کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد ہوں، ایسے امام اعظم جناب ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو اپنی کم فہمی سے جو شخص قلت عربیت اور قلت احادیث کی طرف منسوب کرے، وہ بیشک ''ضلوا فأضلوا '' کا مصداق ہے۔ معاذ اللہ یہ کیسی دشمنی اور کیسی بیبا کی غیر مقلدین کی ہے جو کہتے ہیں کہ: امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو سترہ حدیثیں پہونچیں؟ یہ جملہ ردیہ اور کلمات سخیفہ [۱] ہیں، پس یہ مثل ایک درخت خبیثہ کے ہے کہ زمین سے اکھڑ گیا ہے اور اس کو قرار نہیں، یا مثل بنیاد کمزور کے ہیں جو کسی طرح سیلاب تحقیق کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی، اور یقیناً یہ زلت فاحشہ اور ذلت فاضحہ ہے کہ ایسے لچر پوچ [۲] کلام کی تصدیق نہیں کرے گا، مگر وہ شخص جس کے حواس مختل ہوں، اور چاروں طرف سے اس کو اوہام باطلہ کی گھٹائیں گھیرے ہوئے ہوں، اور جن کے مدارک عالیہ [۳] ہیں وہ ایسے کلام کی طرف اصلا توجہ نہیں کریں گے۔

اور یہ طعن اور اس کی وجہ کہ امام صاحب قلیل الروایت کیوں ہیں؟ علامہ ابن خلدون نے اپنی تاریخ میں ذکر کی ہے، مگر عقل کے دشمنوں نے قلت احادیث کی طعن کو امام صاحب کی شان میں نقل کیا، اور وجہ کو چھوڑ دیا، یہ مثل استدلال پکڑنے کج فہم کے ''لا تقربوا الصلوٰة '' سے ''وانتم سکارٰی '' کو چھوڑ کر، چنانچہ اس کی تصریح خود ابن خلدون نے اپنی تاریخ میں بیان کی ہے:

قد تقول بعض المتعصبين : ان منهم من كان قليل البضاعة فى الحديث ، ولا سبيل الٰى هذا المعتقد فى كبار الائمة ، لان الشريعة انما تؤخذ من الكتاب والسنة ،

---

[۱]...... ردیہ خراب، بے کار۔ سخیفہ بے ہودہ۔ کم فہم و سمجھ۔

[۲]...... لچر پوچ: مہمل بے ہودہ، لغو۔

[۳]...... مدارک عالیہ: سمجھ اور فہم بلند اور زیادہ ہو۔

ومن كان قليل الحديث فيتعين عليه طلبه وروايته والجد والتشمير فى ذلک لياخذ عن اصول صحيحة ويتلقى الاحكام عن صاحبها المبلغ لها ، وانما قال منهم من قلل الرواية لاجل المطاعن التى تعتريه والعلل التى تعرض فى طرقها۔

یعنی بعض متعصبین باتیں بناتے ہیں کہ: بعض مجتہدین سے وہ شخص ہے کہ تھوڑی پونجی کے ہیں علم حدیث میں، اورکوئی طریقہ طرف اس اعتقاد کے ائمہ مجتہدین کبار کی شان میں نہیں ہے، یعنی جو کہ کبار مجتہدین میں سے ہیں، ان کی طرف یہ اعتقاد بالکل مناسب نہیں، بلکہ خطا ہے، کیونکہ شریعت نہیں پکڑی جاتی ہے، مگر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے (یعنی کبار مجتہدین کو حاوی ہونا اور مفسر ہونا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ پر ضروریات میں سے ہے) اور جو کہ قلیل الحدیث ہو تو معین ہو چکا ان پر طلب کرنا علم حدیث کا، اور روایت کرنا حدیث کا اور کمر بستہ ہونا حصول حدیث میں تا کہ اخذ کرلے وہ مجتہد اصول صحیحہ سے، تا کہ لیوے احکام کو اس کے صاحب سے، اور قلت حدیث ان سے نہیں ہوتی ہے، مگر بسبب مطاعن وعلل وعوارض کے احادیث میں یعنی اسانید احادیث میں فتأمل ولا تكن من الغافلين۔

اسی طرح دوسرا قول ابن خلدون کا ہے:

الامام ابوحنيفة انما قلّت روايته ، لما شدد في شروط الرواية والتحمل وضعف رواية الحديث اليقينى اذا عارضها الفعل النفسى، وقلت من اجل ذلک روايته فقل حديثه ، لا انه ترک رواية الحديث عمدا۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی قلت روایت حدیث کی نہیں ہوئی ہے، مگر بسبب اس بات کے کہ تشدد کیا انہوں نے شروط روایت میں اور تحمل حدیث میں، اور بسبب روایت کرنے

حدیث یقینی کے جب کہ معارض ہو اس کو فعل نفسی، اور کم ہوئی روایت امام صاحب کی تو کم ہوئی حدیث ان کی (یعنی بہ نسبت غیروں کے) نہ یہ بات کہ امام صاحب نے ترک کیا ہو روایت حدیث کو عمداً۔

تیسرا قول ابن خلدون کا اس کی تاریخ میں:

یدل علی انه یعنی ابو حنیفة من کبار المجتهدین في الحدیث اعتماد مذهبه فیما بینهم والتعویل علیه واعتباره ردًّا وقبولا، واما غیره من المحدثین وهم الجمهور فتوسعوا فی الشروط فکثر حدیثهم والکل من اجتهاد، وقد توسع اصحابه من بعده فی الشروط فکثرت روایاتهم، وروی الطحاوی فاکثر وکتب مسندا۔

یعنی دلالت کرتا ہے یہ امر کہ جناب ابو حنیفہ رحمہ اللہ کبار مجتہدین سے ہیں، فن حدیث میں اعتماد کرنا علماء کا ان کے مذہب پر اور ان کے مذہب کو مرجع علم سمجھنا اور اس کا اعتبار کرنا از روئے رد اور قبول کے، اور ماسوائے ان کے دوسرے محدثین نے وسعت کی شروط صحت روایت میں، تو زیادہ ہوئیں حدیثیں ان کی اور کل اجتہاد سے ہے، اور تحقیق کہ توسع کیا امام صاحب کے شاگردوں نے بعد ان کے تو زیادہ ہوئیں روایتیں ان کی، اور امام طحاوی رحمہ اللہ نے کثرت سے روایت کی، اسی وجہ سے ایک مسند لکھ ڈالا۔

اس سے واضح ہو گیا کہ جناب ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی قلت حدیث بسبب بے پروائی اور کم علمی کے نہ تھی، کیونکہ ابن خلدون وغیرہ علماء تواریخ اور محدثین نے ان کو کبار مجتہدین فی الحدیث سے تسلیم کیا ہے۔ اور ان کے علم و فضل اور حافظہ اور ورع اور زہد و تقویٰ کا جمہور علماء متبحرین نے اقرار کیا ہے۔ اسی طرح علامہ نواب صدیق الحسن خاں مرحوم نے باوجودیکہ ان کو دعویٰ محدث اور غیر مقلد ہونے کا تھا، پھر بھی وہ ''حطه فی اصول صحاح سته'' کے

(ص:۳۷) میں نقل کرتے ہیں:

والامام ابوحنيفة انما قلّت روايته لما شدد في شروط الرواية والتحمل وضعف رواية الحديث اليقيني اذاعارضها الفعل النفسي، وقلت من اجلها روايته فقل حديثه ، لا انه ترک رواية الحديث متعمدا فحاشاه من ذلک۔

یعنی امام ابوحنیفہ کی روایت کم ہوئی، باعث اس کا یہ ہے کہ انہوں نے شروط روایت میں بہت تشدد اور سختی کی ہے (چنانچہ دوسرے محدثین مثل بخاری وغیرہ کی تصحیح کی ہوئی حدیث ان کے نزدیک ضعیف اور ذی علل ہے، بلکہ بنابراس کے یوں کہنا درست ہے کہ چند حدیثیں ایسی امام صاحب نے ضعیف جان کر چھوڑ دیں ان کو امام بخاری وغیرہ نے اپنی شرطوں کے موافق صحیح جان کر اخذ کیا) شروط روایت اور تحمل روایت میں اور بسبب ضعیف جاننے روایت حدیث یقینی کے جب معارض ہوا اس کو فعل نفسی، اور قلت روایت ہوئی تو کم ہوئی حدیث ان کی، نہ یہ کہ ترک روایت حدیث کی عمداً کی ہو، پس پاک ہیں امام اعظم اس سے۔

اور ''حطّہ'' میں ہے:

ويدل على انه من كبار المجتهدين في علم الحديث اعتماد مذهبه بينهم والتعول عليه واعتباره رداً وقبولا ، الخ۔

یعنی دلالت اس بات پر کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کبار مجتہدین سے ہیں علم حدیث میں معتمد ہونا ان کے مذہب کا درمیان علمائے محدثین وغیرہ کے، ونیز اعتماد واعتبار کرنا ان کے مذہب پر باعتبار ردوقبول کے۔

اس سے زیادہ تصریح دیکھنی ہوتو علماء متقدمین ومتاخرین محدثین وغیرہم کی تالیفات

خاص کر مولوی عبدالحی لکھنوی (رحمہ اللہ) کے مقدمات: ہدایہ اور جامع الصغیر اور مؤطا امام محمد اور شرح وقایہ وغیرہ کا ملاحظہ فرمائیے، فتدبر۔

اب غور کرنے کی جگہ ہے کہ امام اعظم رحمہ اللہ اگر فقط سترہ حدیثیں جانتے ہوتے تو کیوں ان کو کبار مجتہدین فی الحدیث میں گنا جاتا؟ اور کیوں گواہی دیتے ساتھ مہارت اور علو مرتبت ان کے فن حدیث میں؟ اور ان کی قلت حدیث کی روایت میں کیوں عذر بیان کرتے؟

علاوہ اس کے جو شخص مطالعہ کرے تصانیف شاگردان امام اعظم صاحب کا کہ انہوں نے باسانید متصلہ امام صاحب سے اپنی اپنی تالیفات میں روایات صحیحہ صریحہ کو درج کیا ہے۔ مثل ''مؤطا امام محمد'' اور ان کی ''کتاب الحجج'' اور ''کتاب الآثار'' اور ''سیر'' اور ''کتاب الخراج'' امام ابو یوسف کی اور ''امالی'' وغیر ذلک کے۔ تو اس میں روایات امام صاحب کی اور ان کے اساتذہ کی اسانید متصلہ کے ساتھ زیادہ سو سے بلکہ دو سو بلکہ اور بھی زیادہ اس سے ہزار دو ہزار تک ملیں گے۔ باوجود اس کے یوں کہنا کہ روایات امام صاحب کی سترہ تک پہنچی ہیں نہیں ہے مگر اس طرح کہ کوئی یوں کہے کہ: امام بخاری کی روایات سولہ ہیں۔

علاوہ اس کے جس نے مطالعہ کیا ہو تالیف ابن ابی شیبہ اور دار قطنی اور حاکم اور بیہقی اور عبدالرزاق اور طحاوی کی ''شرح معانی الآثار'' اور ''مشکل الآثار'' کا تو وہ بخوبی جانتا ہے کہ امام صاحب سے ان میں کتنی روایتیں ہیں؟ [1] باوجود ان تصریحات ظاہرہ کے پھر یہ کہنا کہ

[1]...... امام صاحب رحمہ اللہ پر یہ اعتراض تو واقعی کوئی جاہل ہی کر سکتا ہے، اور اس بات کے دلائل پیش کرنا کہ امام صاحب رحمہ اللہ محدث تھے یا نہیں؟ یہ تو ایسا ہے کہ کوئی سورج دیکھ کر کہے کہ دن کی کیا دلیل ہے؟ کسی نے بہت صحیح کہا ہے۔

ولیس یصح فی الاذھان شئی اذا احتاج النھار الی دلیل

اگر دن کو بھی دلیل کی ضرورت ہوتو پھر کوئی بات صحیح اور ثابت نہیں ہوسکتی۔

میں یہاں پر حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی رحمہ اللہ کا صرف ایک اقتباس نقل کرنا کافی سمجھتا ہوں، اس سے پتہ چلے گا امام صاحب رحمہ اللہ کے مسانید کن کن ائمۂ کبار نے جمع کئے ہیں، ان مسانید سے امام صاحب رحمہ اللہ کا حدیث میں کیا مقام تھا اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔

قاضی القضاۃ محدث ابوالمؤید محمد بن محمود خوارزمی (م:۶۵۵) نے ''جامع المسانید الامام الاعظم'' میں امام ابوحنیفہ کی مسانید کے پندرہ نسخوں کو یکجا جمع کرنے کی کوشش کی، چنانچہ ''جامع مسانید'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ:

''میں نے شام میں بعض جاہلوں کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی کوئی مسند نہیں، اور وہ صرف معدودے چند حدیثوں کے راوی ہیں، اس پر مجھے حمیت مذہبی کا جوش ہوا، اور میں نے یہ چاہا کہ امام ممدوح کی ان پندرہ مسانید کو جنہیں نامور علماء محدثین نے مرتب کیا ہے یکجا جمع کردوں (چنانچہ یہ مسانید حسب ذیل ہیں:)

(۱):......مسند امام حافظ ابومحمد عبداللہ بن محمد بن یعقوب الحارثی البخاری المعروف بعبداللہ الاستاذ رحمہ اللہ،

(۲):......مسند امام اعظم حافظ ابوالقاسم طلحہ بن محمد بن جعفر الشاہد رحمہ اللہ۔

(۳):......مسند امام حافظ ابوالحسن محمد بن المظفر رحمہ اللہ۔

(۴):......مسند امام حافظ ابونعیم رحمہ اللہ۔

(۵):......مسند امام ابوبکر محمد بن عبدالباقی انصاری رحمہ اللہ۔

(۶):......مسند حافظ ابواحمد عبداللہ بن عدی جرجانی رحمہ اللہ۔

(۷):......مسند امام حسن بن زیاد لولوی رحمہ اللہ۔

(۸):......مسند حافظ عمر بن الحسن اشنانی رحمہ اللہ۔

(۹):......مسند حافظ ابوبکر احمد بن محمد خالد رحمہ اللہ۔

(۱۰):......مسند امام حافظ ابوعبداللہ حسین بن محمد بن خسرو بلخی رحمہ اللہ۔

(۱۱):......مسند امام ابویوسف قاضی رحمہ اللہ، جو نسخہ ابی یوسف سے موسوم ہے۔

بارہ حدیثیں یاد تھیں، وهذا ظاهر علی کل ماهر۔

مع ہذا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا زمانہ صحابہ کا تھا، اور اول زمانہ تابعین کا، چنانچہ میں ثابت کر چکا ہوں اپنے رسالہ ''سبع سنابل'' میں۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ اس زمانہ میں جم غفیر اور جماعت کثیر علماء ذی الشان کی تھی، اور علم اس زمانہ میں عالم شباب پر تھا، اور مشغول تھا اس زمانہ میں روایات احادیث میں ہر جوان و بوڑھا، یہاں تک کہ بچے اس زمانہ کے اعلم اور احفظ تھے فضلاء اس زمانہ سے۔ پھر باوجود اس کے کسی نے نہیں کہا کہ امام اعظم رحمہ اللہ کو سوائے سترہ روایات کے اور یاد نہیں تھیں۔ افسوس صد افسوس کہ اس زمانہ کے مقیدوں نے کہاں سے یہ بات تراشی ہے، فتنبه۔

مع ہذا سوچنے کی بات ہے کہ مسائل فرعیہ معاملات وعبادات شرعیہ وہ کہ جو نقل کئے گئے ہیں، بلاشبہ ہزاروں سے زیادہ ہیں جیسا کہ صاحب بصیرت پر پوشیدہ نہیں ہے، خاص کر ان لوگوں پر کہ جن کو دیکھنا ان کے شاگردوں کی کتابیں صحاح ستہ کا میسر ہوا ہے، یعنی ''جامع الصغیر'' اور ''جامع الکبیر'' اور ''سیر صغیر'' اور ''سیر کبیر'' اور ''زیادات'' اور ''مبسوط'' کا کہ مسمیٰ بظاہر الروایۃ ہے، اور ''کتاب الحجج '' اور ''کتاب الآثار'' اور ''مؤطا'' یہ کل امام محمد شیبانی کی ہیں، اور مثل تصانیف ابی یوسف اور حسن بن زیادہ اللؤلؤی وغیرہم کے اور یہ بات معلوم ہے کہ یہ کل مسائل منصوصۂ قرآن نہیں ہیں، اور نہ اجماع سے ثابت ہیں، ونیز

---

(۱۲):......مسند امام محمد بن الحسن الشیبانی رحمہ اللہ۔ یہ نسخہ محمد سے موسوم ہے۔

(۱۳):......مسند امام حماد بن ابی حنیفہ رحمہ اللہ۔

(۱۴):......مسند امام محمد رحمہ اللہ، جو الآثار سے موسوم ہے۔

(۱۵):......مسند امام حافظ ابوالقاسم عبداللہ بن ابی العوام السعدی۔

(تفصیل کے لئے دیکھئے! مقدمہ ''مسند الامام اعظم ابی حنیفة النعمان من روایة العلامة الحصکفی'')

اکثر مسائل ان کتابوں کے ایسے ہیں کہ جن میں مدخل اجتہاد مجتہدین کا نہیں ہے۔ پس بنا بر اس کے ضرور ہے کہ امام صاحب کو احادیث کثیرہ اور آثار وغیرہ پہونچی ہیں، ورنہ اتنے مسائل کہاں سے بغیر احادیث معلوم کئے ہوئے مستنبط کئے؟

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ تمام مجتہدین ومحدثین اور تمام علماء معتمدین نے اتفاق کیا ہے اس بات پر کہ ابوحنیفہ رحمہ اللہ مجتہدین میں سے ہیں، اور عبارتیں ان کی متفق ہیں اس بات پر کہ امام صاحب رحمہ اللہ معدود ہیں متقدمین میں۔ اسی واسطے علماء ذکر کرتے ہیں امام صاحب کے قول کو معرض اقوال علماء میں، اور درج کرتے ہیں حال امام صاحب کو اثناء احوال علماء میں، اور اہتمام کرتے ہیں علماء ساتھ آثار امام صاحب کے از روئے رفع وقدح کے وغیرہ وغیرہ۔

پس باوجود اس کے سترہ حدیثوں کی نسبت امام صاحب کی طرف کرنا اسی کا کام ہے جس کے دماغ میں کچھ خلل وضرر ہو، کیونکہ جس کو حدیثیں سترہ سے زیادہ نہیں پہونچی ہوں اس کا اعتبار کیا ہوسکتا ہے علماء انام کے نزدیک؟ اور نہ شمار کیا جاسکتا ہے وہ زمرۂ مجتہدین میں، اور نہ اس کے قول کی طرف کوئی التفات کرسکتا ہے، اور امام صاحب کا حال اس طرح نہیں ہے، بلکہ معدود فی المعتبرین والمعتمدین ہیں، **کما لا یخفٰی علی من له ادنٰی علم من الاحادیث۔**

پھر جائے غور ہے کہ بالاتفاق تمام علماء عظام قائل ہیں کہ امام اعظم رحمہ اللہ فقہاء کرام میں سے ہیں، اور تمام نے امام صاحب کو فقیہ عراق کے ساتھ موصوف کیا ہے، اور امام صاحب کو سادات فقہاء میں سے شمار کیا ہے، اور تمام علماء مجتہدین نے ان کے لئے تبحر استنباط مسائل کا مان لیا ہے، اور ضروری یہ امر ہے کہ کوئی فقیہ نہیں ہوتا جب تک وہ مجتہد نہ

ہو، اور جو مجتہد ہوگا اس کے لئے فقط سترہ حدیثیں کافی نہیں، پس حالات مذکورہ میں امام صاحب کے واسطے فقط سترہ حدیثیں ثابت کرنا نہیں ہے یہ کام مگر کم علموں کا۔

پھر جائے انصاف ہے کہ علامہ ابو عبداللہ الذہبی نے جن کو نقد تام باتفاق علماء کرام کے تھا وہ اپنے ''تذکرۃ الحفاظ'' میں امام صاحب کو ذکر حمید سے یاد فرما کر ان کو حفاظ حدیث میں شمار کرتے ہیں۔ اور اسی طرح دیگر علماء عظام نے اپنی اپنی تالیفات میں ذکر فرمایا ہے مثل ابن خلکان وغیرہ کے، اور حافظ الحدیث وہ ہرگز نہیں ہے جو کہ فقط سترہ حدیثیں جانتا ہو۔ نیز جماعت معتبرین نے ذکر کیا ہے کہ شیوخ اور اساتذہ ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے فن حدیث میں چہار ہزار ہیں۔ علامہ مزی رحمہ اللہ نے ''تہذیب الکمال'' میں ان میں سے ستر بتلائی ہیں، جس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ پس اگر فرض کیا جاوے کہ ہر ایک سے ایک ایک حدیث روایت کی ہوگی تو بھی چار ہزار ہوں گی، اتنی نہیں تو ستر ہی سہی، اور اگر ہر ایک سے ایک سے زیادہ روایت کی ہوں تو اسی قدر زیادہ ہوں گی، تو پھر بھی کہنا کہ امام صاحب کو نہیں پہونچی تھیں حدیثیں مگر سترہ، اباطیل اور لغویات سے ہے۔ ونیز جس کو فقط سترہ حدیثیں پہونچی ہوں تو وہ ضرور بالضرور مہجور نزدیک صغیر وکبیر کے ہوتا، ہرگز اس کا شہرہ مثل شہرت ائمہ مجتہدین کے نہیں ہوگا۔ باوجود اس کے کسی محدث یا فقیہ نے امام کے سوا نہیں کہا ہے پس یہ ادلہ العشرۃ المبشرۃ یا تلک عشرۃ کاملۃ ہیں، ویأبی اللّٰہ والمؤمنون الا ان یزید نور ابی حنیفۃ وھو متم نورہ ولو کرھت الفئۃ الباغیۃ الکارھۃ۔

امام صاحب پر ''اصحاب الرائے'' و''اہل الرائے'' کا الزام

بحث پنج: بیان لفظ ''امام اہل الرائے'' و''اصحاب الرائے''......

بعض متعصبین غیر مقلدین اپنی تالیفات میں لکھتے ہیں کہ: ابو حنیفہ نعمان بن ثابت امام

الحنفیہ ومقتدائے اصحاب الرائے ہیں۔

تواس کے جواب میں لکھتا ہوں بتوفیق ملک العلام کہ: اگران کی مراداس سے عقل اور فہم ہےتو وہ منقبۃ شریفہ اورمکرمۃ عظیمہ ہے، کیونکہ جس کے عقل نہ ہواس کوعلم نہیں، کیونکہ علم منقول بغیر معقول کے ناقص اور روایت بغیر درایت کے بیکار۔اور اگر مرادان کی اس رائے سے قیاس ہے وہ قیاس کہ جوایک قسم ادلہ اربعہ کی ہے،تو اگراس سے یہ مقصود ہے کہ امام صاحب قیاس کرتے تھےاس وجہ سے ان کےقول کا اعتبارنہیں،تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہرواحد مجتہدین میں سے قیاس کرتا تھا، پھرامام صاحب پر کیوں اعتراض؟ سب پر ہونا چاہئے۔اوراگر یہ مقصود ہے کہ امام صاحب قیاس کو کتاب اللہ سنت رسول اللہ پر مقدم کرتے تھے،تو یہ صریح تہمت ہے، اس واسطے کہ اس کو حافظ ابن عبدالبراور ابن حجر اور عبدالوہاب شعرانی (رحمہم اللہ) وغیرہم نے ثابت کردیا ہے کہ امام صاحب قیاس کوقرآن وحدیث پرمقدم نہیں کرتے تھے۔

وقال ابن الحجر المكى فى " الخيرات الحسان " بعد ماذكر محاسنه ومحامده فى ستة وثلثين فصلا فى الفصل السابع والثلثين : قال الحافظ ابن عبد البر ماحاصله : انه افرط بعض اصحاب الحديث في ذم ابي حنيفة وتجاوزوا الحد فى ذلك لتقديمه القياس على الاثر ، واكثر اهل العلم يقولون : اذا صح الحديث بطل الرأى والقياس ، لكنه لم يرد الا بعض اخبار الآحاد بتاويل محتمل وكثير منه قد تقدمه اليه غيره وتابعه عليه مثله كابراهيم النخعي واصحاب ابن مسعود رضى الله عنه ، الا انه اكثر من ذلك هو واصحابه ، وغيره انما يوجد له ذلك قليلا۔

یعنی ابن حجر مکی رحمہ اللہ نے ''خیرات الحسان'' میں بعد ذکر کرنے محاسن ومحامد جناب امام اعظم رحمہ اللہ کے چھتیس فصلوں میں فصل سینتیسویں میں کہا ہے کہ: حافظ ابن عبدالبر رحمہ

اللہ فرماتے ہیں کہ: ہر آئینہ بعض اصحاب حدیث نے زیادتی کی ہے مذمت کرنے میں ابی حنیفہ رحمہ اللہ کے، اور مذمت بھی اس قدر کی ہے کہ حد سے تجاوز کر گئے ہیں قیاس کو حدیث پر مقدم کرنے کی وجہ سے، اور اکثر اہل علم کہتے ہیں کہ: جب حدیث صحیح ہو تو رائے و قیاس باطل ہے ولیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے نہیں رد کیا، مگر بعض اخبار آحاد کو وہ بھی محتمل تاویل کے ساتھ، اور یہ طریقہ اکثر نے جو ان سے مقدم گذرے ہیں اختیار کیا ہے، اور متابعت کی امام صاحب کی اس طریقہ پر آپ کے مثل نے، جیسے ابراہیم نخعی اور اصحاب ابن مسعود رضی اللہ عنہ، مگر اتنا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب نے قیاس زیادہ کیا ہے (کیونکہ ان کو جس مسئلہ میں کوئی حدیث نہ ملی انہوں نے قیاس کیا) بہ نسبت اور مجتہدین کے:

ومن ثم لما قيل لاحمد ما الذى نقم عليه ؟ قال : الرأى ، قيل : أليس مالك تكلم بالراى؟ قال : بلى ، ولكن ابا حنيفة اكثر رأيا منه (قيل فهل اتكلم فى هذا لحصته وهذا بحصته فسكت احمد).

یعنی اسی باعث سے (یعنی جب ابراہیم نخعی اور اصحاب مسعود رضی اللہ عنہم وغیرہم اور دیگر علماء بھی تھوڑا بہت قیاس ورائے سے کام لیتے ہیں تو) جب امام احمد رحمہ اللہ سے کہا گیا کہ: کس سبب سے تم امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر ناراض اور غصہ ہو؟ تو امام احمد رحمہ اللہ نے جواب میں اس کے کہا کہ: رائے کے سبب سے، تو کہا گیا کہ: امام مالک رحمہ اللہ کلام ساتھ رائے کے نہیں کرتے تھے؟ کہا امام احمد رحمہ اللہ نے کہ: ہاں لیکن ابوحنیفہ قیاس میں امام مالک رحمہ اللہ سے بڑھے ہوئے ہیں اور زیادہ ہیں، تو کہا گیا کہ: کیا میں کلام کروں مالک رحمہ اللہ میں موافق ان کے حصہ کے اور ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ میں بقدر ان کے حصہ کے تو امام احمد رحمہ اللہ یہ سن کر چپ ہو گئے۔

ف:......مولوی عبدالحی مرحوم لکھنوی ''مقدمہ مؤطا امام محمد'' میں بعد اس عبارت کے تحریر فرماتے ہیں: ناقلاً عن ابن عبدالبر کہ ہرآئینہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی اجتہاد بالرائے اور قیاس ثابت ہے اسی طرح تابعین سے۔انتہی کلام ابن عبدالبر۔

جب یہ وطیرہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین اور امام مالک رحمہم اللہ وغیرہ کا جاری رہا کہ رائے اور قیاس سے انہوں نے بھی کام لیا ہے، تو ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر اس بارے میں مواخدہ کرنا سفاہت اور جہالت ہے، کیونکہ علماء متقدمین محدثین ومجتہدین سے جب قول بالرائے وبالقیاس ثابت ہے تو ابوحنیفہ پر اس کا کیوں الزام لگایا جاتا ہے؟ بلکہ اسی پر عمل عامہ فقہاء امصار وغیرہم کا بھی رہا، چنانچہ ''میزان شعرانی'' میں ابی جعفر شیرازی سے منقول ہے:لاخصوصية للامام ابی حنيفة فی القياس بشرطه المذكور أی عدم وجدان الحكم من الكتاب والسنة ، بل جميع العلماء يقيسون فی مضائق الاحوال اذا لم يجدوا فی المسئلة نصا من كتاب ولا سنة ولا اجماع ولا اقضية الصحابة ۔

یعنی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قیاس کرنے میں خصوصیت نہیں بشرط مذکور، یعنی وقت نہ پہنچنے حکم کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے، بلکہ جمیع علماء قیاس کرتے ہیں مضایق احوال میں، جب کہ وہ نہیں پاتے کسی مسئلہ میں نص کتاب اور سنت سے اور اجماع اور قضایا صحابہ سے۔[۱]

---

[۱]......امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر قیاس کا الزام بھی جاہلوں کی جہالت کا نتیجہ ہے۔ایک دلچسپ واقعہ سے اس کی حقیقت بہت اچھی طرح واضح ہوجائے گی کہ امام صاحب رحمہ اللہ حدیث کو مقدم رکھتے ہیں یا قیاس کو۔حضرت محمد بن باقر رحمہ اللہ کی ملاقات امام صاحب رحمہ اللہ سے ہوئی تو انہوں نے امام صاحب رحمہ اللہ سے مخاطب ہوکر فرمایا:

آپ نے تو میرے نانا کے دین اور ان کی احادیث کو قیاس سے بدل ڈالا۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا:......معاذ اللہ۔

بحث کثرت مشائخ ابی حنیفہ رحمہ اللہ کے اوران کے ثقہ ہونے میں

ابوحنیفہ رحمہ اللہ جیسے فقیہ تھے اسی طرح محدث تھے، بلکہ کبار مجتہدین فی الحدیث مانے

حضرت باقر رحمہ اللہ نے فرمایا:......آپ نے ایسا کیا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ:......تشریف رکھئے تاکہ میں بھی مؤدبانہ طریق سے بیٹھ سکوں، کیونکہ میرے نزدیک آپ اسی طرح لائق احترام ہیں جیسے آپ کے نانا صحابہ کی نظر میں۔ حضرت باقر رحمہ اللہ تشریف فرما ہوئے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ بھی زانوئے ادب تہ کرکے آپ کے سامنے بیٹھ گئے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ: میں آپ سے تین باتیں دریافت کرنا چاہتا ہوں، ان کا جواب مرحمت فرمائیے! کیا مرد کمزور ہے یا عورت؟

حضرت باقر رحمہ اللہ:......عورت۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ:......میراث میں عورت کو کیا حصہ ملتا ہے؟

حضرت باقر رحمہ اللہ:......مرد کو دو حصے عورت کو ایک۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ:......یہ آپ کے نانا ﷺ کا فرمان ہے، اگر میں نے ان کے دین کو بدل دیا ہوتا تو قیاس کے مطابق آدمی کو ایک حصہ دیتا اور عورت کو دو، کیونکہ عورت کمزور ہوتی ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ:......اچھا فرمائیے! نماز بہتر ہے یا روزہ؟

حضرت باقر رحمہ اللہ:......نماز۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ:......یہ آپ کے نانا ﷺ کا ارشاد ہے، اگر میں نے ان کا قول تبدیل کردیا ہوتا تو میں عورت سے کہتا کہ حیض سے پاک ہونے کے بعد روزہ کے بجائے وہ فوت شدہ نمازیں ادا کرے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ:......اچھا یہ فرمائیے! کہ پیشاب زیادہ ناپاک ہے یا نطفہ؟

حضرت باقر رحمہ اللہ:......پیشاب زیادہ نجس ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ:......اگر میں نے قیاس سے آپ کے نانا ﷺ کے دین کو بدل دیا ہوتا تو میں فتوی دیتا کہ پیشاب سے غسل کرنا چاہئے اور نطفہ سے وضو۔ معاذ اللہ بھلا میں یہ کام کیسے کرسکتا ہوں؟

حضرت باقر رحمہ اللہ:......اٹھ کر بغل گیر ہوئے، چہرہ پر بوسہ دیا اور آپ کی تکریم بجالائے۔

(حیات حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، ص ۱۲۸۔ از شیخ محمد ابوزہرہ)

گئے ہیں، چنانچہ واضح طور سے اوپر گزر چکا ہے۔ چنانچہ علامہ مولوی عبدالحئی لکھنوی رحمہ اللہ نے ''مقدمہ مؤطا'' میں تذکرہ علامہ ذہبی سے نقل کیا ہے کہ:

حدث عن عطاء ونافع وعبد الرحمن بن هرمز الأعرج وسلمة بن كهيل وابى جعفر محمد بن علي وقتادة وعمروبن دينار وابى اسحاق وخلق كثير۔

یعنی روایت کی ہے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے عطا اور نافع اور عبدالرحمٰن بن ہرمز الاعرج اور سلمہ بن کہیل اور ابی جعفر محمد بن علی اور قتادہ اور عمرو بن دینار اور ابی اسحاق (رحمہم اللہ) اور خلق کثیر سے۔

یعنی ان کے سوائے دوسروں سے بھی امام صاحب نے روایت کی ہے اور ان سے تفقہ حاصل کیا ہے۔ زفر بن ہذیل اور داؤد طائی اور قاضی ابو یوسف اور محمد بن الحسن اور اسید بن عمرو اور حسن بن زیادہ اور نوح الجامع اور ابومطیع البلخی (رحمہم اللہ) وغیرہم بہت سے دوسروں نے بھی ان سے یعنی امام اعظم رحمہ اللہ سے حدیثیں روایت کی ہیں، اور علم حدیث اخذ کیا ہے ذیل کے علماء محدثین نے اور وہ یہ ہیں:

وحدث عنه وكيع ويزيد بن هارون وسعد بن الصلت وابو عاصم وعبد الرزاق وعبيد اللّٰه بن موسى وبشر كثير۔

یعنی امام اعظم رحمہ اللہ سے حدیث (بیان) کی ہے وکیع اور یزید بن ہارون اور سعد بن الصلت اور ابوعاصم اور عبدالرزاق اور عبیداللہ بن موسیٰ (رحمہم اللہ) نے و نیز بہت سے لوگوں نے ان علماء کے علاوہ امام صاحب سے روایت کی ہے۔

اور اسی تذکرہ میں ہے:

وكان امامًا ورعا عالما عاملا متعبدا كبير الشان ، لايقبل جوائز السلطان بل يتجر ويكتسب۔

یعنی تھے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ امام پرہیزگار، عالم باعمل، عبادت کنندہ اور کبیر الشان، نہیں قبول کرتے تھے جائزہ کو سلطان کے، بلکہ تجارت کرتے تھے۔اور کسب کرتے تھے۔

قال ابن المبارک : ابو حنیفة افقه الناس۔

یعنی کہا ابن المبارک نے کہ: ابوحنیفہ رحمہ اللہ زیادہ تر فقیہ تھے (اور یہ بات معلوم ہے کہ بدون علم حدیث کوئی شخص فقیہ نہیں ہوتا ہے، چہ جائے کہ افقہ ہووے اور علم حدیث نہ رکھتا ہو)

وقال الشافعی : الناس فی الفقه عیال علی ابی حنیفة رحمة اللّٰه علیه ۔

یعنی جناب شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: لوگ فقہ میں ابی حنیفہ رحمہ اللہ کی عیال ہیں۔

اور روایت کی ہے احمد بن محمد بن القاسم نے یحیٰ بن معین سے کہ انہوں نے شان میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی " لابأس به " کہا ہے۔(اور یہ لفظ توثیق کا ہے، بلکہ دوسری جگہ تصریح کی گئی ہے کہ جب یحیٰ بن معین کسی کو " لابأس به " کہے تو مراد ثقہ ہوتا ہے) اور اس جگہ خود یحیٰ بن معین نے " لابأس به " کے متصل " ولم یکن متهما " بھی کہا ہے، یعنی ابو حنیفہ کسی تہمت سے متہم نہ تھے۔ یہ عبارت خود دلالت کرتی ہے کہ مراد " لابأس به " سے ثقہ ہے، کیونکہ نہ متہم ہونا دلالت توثیق پر ہے۔

وقال ابو داؤد : ان أبا حنیفة کان اماما۔

یعنی ابوداؤد صاحب کتاب فی الحدیث رحمہ اللہ نے کہا کہ ابوحنیفہ رحمہ اللہ امام تھے۔

وفی " خیرات الحسان " فی الفصل الثامن والثلاثین : قال ابو عمر یوسف بن عبدالبر : الذین رووا عن ابی حنیفة ووثقوه واثنوا علیه اکثر من الذین تکلّموا فیه ، والذین تکلموا فیه من اهل الحدیث اکثر ماعابوا علیه الاغراق فی الرأي والقیاس، وقد مرّ ان ذلک لیس بعیب۔

یعنی ''خیرات الحسان'' میں فصل اڑتیس میں ہے کہ: کہا ابوعمر یوسف بن عبدالبر نے کہ: جن لوگوں نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے روایت کی ہے اور ان کو ثقہ کہا ہے اور ان کی ثنا کی ہے وہ لوگ اکثر ہیں، ان لوگوں سے جنہوں نے کلام کیا ہے ان میں، اور جن لوگوں نے ان میں کلام کیا ہے اہل حدیث میں سے اکثر اس چیز کا کہ ان پر لوگ عیب لگاتے ہیں وہ مستغرق ہونا ان کا رائے اور قیاس میں ہے، اور بالتحقیق اوپر گذر چکا ہے کہ یہ عیب نہیں ہے'

وقد قال الامام علي بن المديني : ابو حنيفة روى عنه الثوري وابن المبارك وحماد بن زيد وهشام ووكيع وعباد بن العوام وجعفر بن عون وهو ثقة لابأس به، وكان شعبة حسن الرأي فيه ، وقال يحيٰ بن معين : اصحابنا يفرطون في ابي حنيفة واصحابه ، فقيل له : أكان يكذب ؟ قال : لا۔

یعنی ہرآئینہ امام علی بن المدینی نے کہا (جو کہ استاد بخاری وغیرہ محدثین کے ہیں) کہ: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے روایت کی ہے ثوری اور ابن المبارک یعنی عبداللہ ابن المبارک اور حماد بن زید اور ہشام اور وکیع اور عباد بن العوام اور جعفر بن عون (رحمہم اللہ) نے، اور یہ امام ابی حنیفہ ثقہ'' لابأس به '' ہیں۔ اور شعبہ جو امیر المؤمنین فی الحدیث کا لقب رکھتے ہیں وہ حسن الرائے تھے امام صاحب کی شان میں۔ اور یحیٰ بن معین نے کہا کہ: ہمارے اصحاب بہت زیادتی کرتے ہیں ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں کے بارے میں، تو کہا گیا یحیٰ سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے،؟ تو کہا کہ نہیں، پس ان عبارات بالا سے توثیق امام صاحب کی اظہر من الشّمس ہے۔

بحث ذکر میں اس بات کے کہ جرح کرنا امام صاحب پر مردود و باطل ہے

واضح ہو کہ جن لوگوں نے جناب امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر جرح کیا ہے اور بعد جرح

کرنے پھر قاعدہ اصول کا حجت پکڑا ہے کہ جب جرح اور تعدیل کسی میں جمع ہوں تو جرح مقدم ہوتی ہے تعدیل پر، لہٰذا امام اعظم رحمہ اللہ قابل حجت نہیں رہے۔

تو جواب اس کا یہ ہے کہ جرح کا مقدم ہونا تعدیل پر علی العموم نہیں ہے، بلکہ یہ قاعدہ مقید بچند قیود ہے، اور وہ قیود یہ ہیں:

اول...... جرح مفسر ہو وہ مقدم تعدیل پر ہوگی، بخلاف جرح مبہم کے کہ وہ مقدم تعدیل پر نہیں ہوتی۔

دیگر...... جو شخص کہ اس کی امامت اور عدالت ثابت ہو اور اس کے مادحین زیادہ ہوں اور جرح کرنے والے کم ہوں تو اس وقت جرح معتبر نہیں ہوتی۔

تیسرے...... اس جگہ کوئی قرینہ ایسا نہ ہو جو تعصب مذہبی پر دال ہو، ورنہ اس کی جرح کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا۔

چہارم...... جس کی طاعت غالب ہووے معصیت پر، اس کے حق میں بھی جرح معتبر نہیں۔

پنجم...... اگر جرح ہم عصر کا ہو تو اس کا جرح بھی مقبول نہیں، کیونکہ ہم عصر کے جرح اور طعن سے انبیاء اور صدیقین اور غوث اور قطب نہیں چھوٹے، تو ائمہ مجتہدین کب بچ سکتے ہیں؟ چنانچہ مولانا عبدالحی لکھنوی، ابن عبدالبر اور علامہ سیوطی اور علامہ سبکی (رحمہم اللہ) وغیر ہم سے تذکرہ میں نقل کرتے ہیں:

ان بعض الجروح مبهمة، والجرح المبهم غير مقبول عند الكملة لاسيما فى من تحققت عدالته وثبتت امامته۔

یعنی ہر آئینہ بعض جروح امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر مبہمہ ہیں، اور جرح مبہم غیر مقبول ہے نزدیک اہل کمال کے، خاص کر ان لوگوں کی شان میں کہ جن کی عدالت متحقق ہو اور امامت

ثابت ہو۔اور’’مقدمۂ مؤطا‘‘میں ہے:

وفی طبقات شیخ الاسلام التاج السبکی : الحذر کل الحذران تفهم ان قاعدتهم الجرح مقدم علی التعدیل علی اطلاقها، بل الصواب ان من ثبتت امامته وعدالته وکثر مادحوه وندر جارحوه وکانت هناک قرینة دالة علی سبب جرحه من تعصب مذهبی أوغیره لم یلتفت الی جرحه۔

یعنی طبقات شیخ الاسلام تاج السبکی میں ہے کہ: خوب ڈرو سمجھنے سے قاعدہ علماء محدثین کا کہ جرح مقدم ہے تعدیل پر علی الاطلاق، بلکہ صواب یہ ہے کہ جس کی امامت اورعدالت ثابت ہووے (مثل امام اعظم کے) اور زیادہ اس کے مادحین ہوں اور کم ہوں جارحین اس کے، اوراس جگہ کوئی قرینہ دالہ ہو سبب جرح پر تعصب مذہبی یا غیر سے تو نہیں التفات کیا جائے گا اس کی جرح کی طرف۔

اسی طرح مقدمہ مذکورہ میں ہے:

ثم قال ای التاج السبکی بعد کلام طویل : قد عرفناک ان الجارح لایقبل منه الجرح وان فسره فی حق من غلب طاعته علٰی معصیته ' ومادحوه علی ذامیه ' ومُزَّکُوہُ علی جارحیه اذا کانت هناک قرینة تشهد بان مثلها حامل علی الوقیعة فیه من تعصب مذهبی أو منافسة دینویة۔

یعنی علامہ تاج السبکی رحمہ اللہ نے بعد کلام طویل کے کہا کہ: ہم نے تجھے بتلا دیا کہ کسی جارح کی جرح قبول نہیں کی جائے گی اگرچہ مفسر ہو حق میں اس آدمی کے کہ طاعات اس کے غالب ہوں اس کی معصیت پر، اور مادحین اس کے زیادہ ہوں مذمت کرنے والوں سے، اورمزکین اس کے کثرت سے ہوں جرح اورطعن کرنے والوں سے، جبکہ قرینہ وہاں

گواہ اس امر پر ہو کہ حملہ کرنا جرح کا اس پر تعصب مذہبی اور منافسہ دینوی سے ہے۔ (جیسا کہ جناب ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی شان میں کوتاہ فہموں نے کیا ہے)

فلایلتفت لکلام الثوری فی ابی حنیفة ' وابن ابی ذئب وغیرہ فی مالک ' وابن معین فی الشافعی ' والنسائی فی احمد بن الصالح ونحوہ۔

یعنی پس التفات نہیں کیا جائے گا کلام سفیان ثوری کی طرف شان میں ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے، اور نہیں التفات کیا جائے گا کلام ابن ابی ذئب وغیرہ کی طرف شان میں امام مالک رحمہ اللہ کے، اور نہیں التفات کیا جائے گا کلام ابن معین کی طرف شان میں امام شافعی رحمہ اللہ کے، اور نہیں التفات کیا جائے گا کلام نسائی کی طرف شان میں احمد ابن صالح اور مثل اس کے۔

قال : ولو اطلقنا تقدیم الجرح علی التعدیل لما سلم لنا احد من الائمة ، إذ ما من امامٍ الّا وقد طعن فیه الطاعنون وهلک فیه الهالکون۔

یعنی علامہ سبکی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ: اگر ہم مطلق جرح اور طعن کو تعدیل پر مقدم کریں تو البتہ کوئی سلامت نہیں رہے ائمہ مجتہدین وغیرہم میں سے، کیونکہ نہیں ہے کوئی امام ائمہ میں سے کہ اس میں کسی طاعن نے طعن نہ کیا ہو اور اس میں کوئی ہلاک ہونے والا ہلاک نہ ہوا ہو۔

وفیه ایضا فی الفصل التاسع والثلاثین فی رد مانقله الخطیب في تاریخه عن القادحین فیه : اعلم انه لم یقصد بذلک الاجمع ما قیل فی الرجل علی عادة المؤرخین ، ولم یقصد بذلک انتقاصه ولاحط مرتبته ، بدلیل انه قدم کلام المادحین واکثر منه ومن نقل ماٰثرہ ، ثم عقبه بذکر کلام القادحین ، ومما یدل علی ذلک ایضا ان الاسانید التی ذکرها للقدح لایخلو غالبا من متکلم فیه أو

مجهول ، ولایجوز اجماعًا ثلم عرض مسلم بمثل ذلک، فکیف بامام من ائمة المسلمین وبفرض صحة ما ذکره الخطیب من القدح عن قائله لا یعتد به ، فانه ان کان من غیر اقران الامام فهو مقلد لما قاله أو کتبه اعداؤه وان کان من اقرانه فکذلک لما مر انّ قول الاقران بعضهم فی بعض غیر مقبول ، وقد صرح الحافظان الذهبی وابن الحجر بذلک ، قال : لاسیما اذا لاح انه لعداوة أو لمذهب اذ الحسد لاینجو منه الا من عصمه اللّٰه ، قال الذهبی: وماعلمت ان عصراً سلم اهله من ذلک الاعصرالنبیین والصدیقین ، وقال السبکی : ینبغی لک ایها المسترشد ان تسلک سبیل الادب مع الائمة الماضین وان لا تنظر الی کلام بعضهم فی بعض الا اذا اتیٰ ببرهان واضح ، ثم ان قدرت علی التاویل وحسن الظن فدونک ، والا فاضرب صفحًا عما جریٰ بینهم وایاک ثم ایاک ان تصغی الیٰ ما اتفق بین ابی حنیفة وسفیان الثوري ' أو بین مالک وابن ابی ذئب ' أو بین النسائی واحمد بن صالح ' أو بین احمد والحارث بن اسد المحاسبی، وهلم جرا الی زمان العز بن عبد السلام والتقی بن الصلاح فانک اذا اشتغلت بذلک وقعت علی الهلاک ، فالقوم ائمة اعلام ولإقوالهم محامل وربما لم نفهم بعضها، فلیس لنا الا الترضی والسکوت عما جريٰ بینهم کما نفعل فیما جريٰ بین الصحابة۔

یعنی ''خیرات الحسان'' کی فصل انتالیسویں میں ہے' ردکرنے میں اس امر کے کہ نقل کیا ہے اس کو خطیب نے اپنی تاریخ میں' قدح کرنے والوں سے شان میں جناب امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے: جان تو کہ خطیب نے قصد نہیں کیا ہے ساتھ اس فعل کے،مگر جمع کرنا اس چیز کا کہ کہا جائے حق میں کسی رجل کے بنابر عادۃ مؤرخین کے،اورنہیں قصد کیا ہے خطیب نے ساتھ اس کے گھٹانا مرتبے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو اور نہ کم کرنا ان کے رتبے کو،

بدلیل اس بات کے کہ مقدم کیا خطیب نے کلام مادحین کا اور کثرت سے کیا ان کا کلام اور آپ کے مناقب نقل کئے، اور بعد کو کلام قادحین کا بیان کیا، اور دلیل اس پر یہ ہے کہ ہرآئینہ اسانید ان روایات کے جن کو طعن وقدح وجرح کے موقع پر ذکر کیا زیادہ تر خالی نہیں ہیں متکلم فیہ یا مجہول راوی سے، اور نہیں جائز ہے نقص لگانا عزت کو کسی مسلمان کے ایسے کلمات سے، پس کیونکر جائز ہوگا ساتھ ایک امام کے ائمہ مسلمین میں سے؟ اور اگر ہم تسلیم کرلیں صحت قدح کی اس کے قائل سے بوجہ ذکر کرنے خطیب کے تو بھی اس پر اعتبار نہیں کیا جائے گا، کیونکہ وہ قدح اور طعن اگر ہو غیر اقران امام رحمہ اللہ سے تو وہ مقلد ہے اس چیز کا کہ کہا اسے اس کو یا لکھا ہے اس کو امام رحمہ اللہ کے اعدا نے، اور اگر طعن کرنے والا شان میں امام صاحب کے امام رحمہ اللہ کا ہم زمانہ ہے تو اس کا بھی قول اور طعن ایسا ہی غیر معتبر ہے، کیونکہ گزر چکا ہے کہ طعن ہم زمانہ بعض کا بعض کے حق میں غیر مقبول ہے، اور ہرآئینہ تصریح کی ہے علامہ ذہبی اور ابن الحجر نے اس کی، اور ان دونوں نے کہا کہ: خاص کر جبکہ ظاہر ہووے کہ یہ طعن بسبب عداوت کے یا بسبب مذہب کے ہے، کیونکہ حسد سے نجات نہیں پاتا ہے مگر وہ شخص کہ جس کو خدا پاک بچاوے۔ اور ذہبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ: میں نہیں جانتا ہوں کہ کوئی اہل زمانہ نجات پایا ہو سوائے زمانہ انبیاء اور صدیقین کے۔ اور علامہ سبکی نے کہا: سزاوار ہے اے طلب کرنے والے رشد وہدایت کے کہ اختیار کرلے تو طریقہ ادب ائمہ کا گذشتگان سے، اور لائق ہے تجھ کو کہ نہ نظر کرے تو کسی کے کلام کی طرف مگر جو کہ اپنا کلام دلیل اور برہان سے بیان کرے، پھر اگر تو قادر ہو تاویل اور حسن ظن پر تو بہتر ہے، ورنہ اعراض اور درگزر کر تو ان امور سے جو آپس میں ان کے واقع ہوئے ہیں، اور ڈر تو مکرر سہ کرر اس بات سے کہ میلان کرے تو طرف اس کے جو واقع ہوئی ہے

درمیان ابوحنیفہ اورسفیان ثوری کے اور درمیان امام مالک اور ابن ابی ذئب کے اور درمیان نسائی اور احمد بن صالح کے اور درمیان احمد اور حارث بن اسد المحاسبی کے، اور سوا ان کے زمانے میں عز بن عبد السلام اور تقی بن الصلاح کے، پس تو جب مشغول ہوگا ساتھ اس کے تو واقع ہوگا تو ہلاکت میں، پس ائمۃ الاعلام ایک ایسی قوم ہے کہ ان کے اقوال کے لئے محامل صحیحہ ہیں، اور بسا اوقات ہم ان کو نہیں سمجھ سکتے ہیں، لہٰذا ہم کو ماسوائے رضامندی اور سکوت کے اور کچھ چارہ نہیں ان امور سے جو ان کے آپس میں واقع ہوئے ہیں جیسا کہ صحابہ کے واقعات میں ہم سوائے سکوت اور کچھ دم نہیں مار سکتے۔

ف:......شروع سے یہاں تک تو جناب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اوصاف حمیدہ یعنی ثقہ اور عادل اور عالم باعمل اور حافظ اور تقی اور نقی اور زہد اور ورع وغیرہ کا بیان ہوا، جو دلائل باہرہ اور براہین قاہرہ سے ثابت ہوئے، جو کہ اہل انصاف پر پوشیدہ نہیں، اور تصنیفات ان کے مناقب میں جماعت علماء مذاہب متفرقہ نے بہت لکھے ہیں، چنانچہ اس کا بیان گزر چکا۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مناقب میں علماء غیر احناف کی کتابیں

امام صاحب پر طعن کرنے والے بھی وہ ہیں کہ جو صاحب تعصب اور جہالت ہیں۔ اب اگر طعن کنندہ امام صاحب پر اہل حدیث یا شافعی ہے، تو ہم اس پر پیش کریں گے عبارتیں ان کتابوں کی جو ان کے ہم مذہب علماء حدیث اور شافعی نے لکھی ہیں، اور ہم ظاہر کرتے ہیں انہیں کے مذہب والوں کی کتابوں سے، جیسا کہ علامہ نواب صدیق الحسن مرحوم کی ’’حطة فی اصول صحاح ستة‘‘ اور مثل علامہ سیوطی کے جو مولف ہیں ’’تبییض الصحیفة فی مناقب الامام ابی حنیفة‘‘ کے اور مثل ابن حجر المکی کے جو مولف ہیں ’’خیرات الحسان فی مناقب النعمان‘‘ کے اور مثل ذہبی کے کہ ذکر کیا ہے انہوں نے امام

صاحب کو ’’تذکرۃ الحفاظ‘‘ میں اور کاشف میں بہت تعریف لکھی ہے، اور آپ کے مناقب میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے، اور ابن خلکان شافعی نے بھی مناقب ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی اپنی تاریخ میں بیان کی ہیں، اور علامہ یافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مناقب میں ’’مرآۃ الجنان‘‘ تالیف کی ہے، اور حافظ ابن حجر نے بھی اپنی تالیفات میں امام اعظم صاحب کی بہت کچھ تعریف اور اوصاف وفضائل بیان کئے ہیں، اور علامہ نووی نے ’’تہذیب الاسماء واللغات‘‘ میں امام صاحب کے مناقب لکھے ہیں، اور امام غزالی نے بھی اپنی ’’احیاء العلوم‘‘ میں امام صاحب کی بہت ثنا لکھی ہے۔ اور اگر طعن کرنے والا مالکی ہے تو اس کو عبرت پکڑنی چاہئے اپنے ہم مشرب حافظ ابن عبدالبر وغیرہ سے کہ، انہوں نے باوجود مالکی مذہب ہونے کے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی توصیف سے اپنی تالیف کو بھر دیا ہے۔ اور اگر طاعن حنبلی ہے تو ہم اس کو یاد دلاتے ہیں تصریحات ان کے ہم مذہب کی مثل: یوسف بن عبدالہاد حنبلی مولف تنویر الصحیفۃ فی مناقب ابی حنیفۃ رحمۃ اللہ علیہ کی۔ اور اگر طاعن مجتہدین میں سے ہے تو ہم ان کو سناتے ہیں وہ امور جو مجتہدین کی زبانوں پر امام صاحب کے بارے میں جاری ہیں۔ اور اگر طاعن کوئی عامی ہو کہ اس کا کوئی مذہب نہیں تو وہ مثل چوپائے کے ہے، بلکہ چوپائے سے زیادہ گمراہ ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی شان میں ابن حجر رحمہ اللہ کے اقوال

تصریح اس کی یہ ہے کہ علامہ ابن حجر ’’تقریب‘‘ میں تحریر فرماتے ہیں کہ: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ طبقہ سادسہ سے ہیں، تو اس عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ امام صاحب تابعی نہیں ہیں۔ اور یہ مدعی اہل ظواہر متعصبین ومعاندین ابی حنیفہ رحمہ اللہ کا ہے، کیونکہ یہ لوگ امام صاحب کے بارے میں روایت عیوب اور جرح کو مقدم کرتے ہیں، بخلاف اس کے کہ علامہ ابن

تیمیہ اور ابن قیم اور بخاری اور مسلم اور محی الدین عربی اور شوکانی (رحمہم اللہ) وغیرہم باوجودیکہ جرح اور تعدیل دونوں ان حضرات کی کتاب نقادان فن میں مبین ومبرہن ہے، پھر بھی ان کی جرح کو چھوڑ کر تعدیل وتوثیق کی تشہیر کرتے ہیں، لیکن نہ معلوم کہ امام ابوحنیفہ نے ان غیر مقلدین کا کیا بگاڑا ہے جس کی وجہ سے وہ ان سے ناراض رہتے ہیں، اوران پر جرح کرتے ہیں۔ اور یہ بات ظاہر وباہر ہے کہ ناقصین اہل کمال کے ہمیشہ دشمن ہوتے ہیں۔ دیکھئے! جب حافظ ابن حجر رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے صحابہ کا زمانہ پایا تھا یانہیں؟ تو جواب میں کہا کہ: ایک جماعت صحابہ کو پایا ہے، لیکن ''تقریب'' سے زمانہ صحابہ کے پانے کا انکار پایا جاتا ہے، چنانچہ علامہ عبدالحی لکھنوی (رحمہ اللہ) نے 'تذکرہ' میں ذکر کیا ہے:

ورفع هذا السوال الى الحافظ ابن حجر فاجاب بما نصه : ادرک ابو حنيفة جماعة من الصحابة ، لانه ولد بالكوفة سنة ثمانين ، وبها يومئذ عبدالله بن ابى اوفى فانه مات بعد ذلک ، وبالبصرة يومئذ انس رضى الله عنه۔

یعنی یہ سوال کہ ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے زمانہ صحابہ کا پایا ہے یانہیں؟ تو اس سوال کے جواب میں علامہ حافظ ابن حجر (رحمہ اللہ) نے فرمایا کہ: ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے جماعت صحابہ کا زمانہ پایا ہے، کیونکہ ولادت ان کی کوفہ میں سنہ اسّی (۸۰) میں ہوئی، اوراس وقت کوفہ میں عبداللہ بن اوفیٰ تھے، کیونکہ عبداللہ کی وفات اس کے بعد ہوئی ہے، اور بصرہ میں اس وقت جناب انس رضی اللہ عنہ تھے۔

اسی طرح یہ عبارت علامہ نواب صدیق حسن خاں صاحب نے ''حطة فی اصول صحاح ستة'' میں لکھی ہے:

ورفع هذا السوال الی الحافظ ابن حجر العسقلانی، فاجاب بما نصه : ادرک الامام ابو حنیفة جماعة من الصحابة ، لانه ولد بالکوفة ،الخ۔

پس جب کہ کلام ابن حجر رحمہ اللہ کا ان کے فتویٰ کے معارض ہوا تو جمع کرنا اور تطبیق دینا عمدہ طریق سے وہ یہ ہے کہ حافظ ابن حجر نے امام اعظم صاحب کو ’’تقریب‘‘ میں طبقہ سادسہ سے نہیں شمار کیا ہے، بلکہ ان کے قلم کی لغزش ہے،لیکن یہ احتمال بعید ہے، ورنہ دونوں کلاموں میں تعارض ظاہر ہے، پھر بموجب قاعدہ ’’**اذاتعارضا تساقطا** ‘‘ان کے دونوں قولوں چھوڑ دینا چاہئے ،اور دوسرے محققین کے اقوال پر نظر کرنا چاہئے۔تو معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب نے صحابہ کا زمانہ پایا ہے،اور یہی ہمارا مدعا ہے۔

میرے نزدیک یہ سہو کاتب ہوا ہے کہ طبقہ خامسہ کے بجائے سادسہ لکھا گیا،اور ممکن ہے جو عبارت جواب میں حافظ ابن حجر سے واقع ہوئی ہے وہ عبارت اخیر کی ہو اس عبارت سے کہ جو ’’تقریب‘‘ میں واقع ہے۔

اگر کوئی معترض اعتراض کرے کہ تقریب کی عبارت مرجح اور مختار ہونا چاہئے بچند وجوہ:

ایک وجہ یہ کہ...... ’’تقریب‘‘ تالیف ابن حجر کی ہونا ثابت تواتر سے ہے،اور ثبوت جواب کا اس مرتبہ کا نہیں ہے، بلکہ خبر احاد سے ہے۔

اور ثانی وجہ یہ ہے کہ...... حافظ نے دیباچہ تقریب میں تصریح کی ہے کہ وہ ہر شخص پر بنا بر مذہب اصح کے حکم کریں گے،اور نہیں التزام کیا ہے اس طرح جواب کی عبارت میں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ...... علامہ حافظ ابن حجر نے سوال کے جواب میں اشارہ تردد کی طرف کیا ہے اور امام صاحب کے تابعی ہونے میں جزم نہیں کیا۔تو میں کہوں گا کہ: یہ تینوں وجہ

باطل ہیں عقلاء محققین معتمدین کے نزدیک، کما لایخفی۔

ونیز ''تقریب'' کی عبارت مخالف ہے ایک جماعت معتمدہ کے کلام کے پس اس کا اعتبار نہیں، اور سوال کا جواب ایک جماعت محدثین ارباب کمال کے کلام سے، چنانچہ ان کی عبارتیں اوپر گذر چکی ہیں کہ ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو دیکھا ہے اور تابعی ہیں، بعض اس کے راوی متقدمین میں ہیں اور بعض متاخرین میں سے، پس اخذ کرنا اس سوال جواب کو اولیٰ ہے کلام تقریب سے، چنانچہ عبارات متعددہ کتب متفرقہ سے علماء متبحرین ومتقدمین ومتاخرین کی تحریر کی گئیں، قلت : لکن الوجه الوجیه ماعرفت اولا۔

بحث فقہ اور فقہاء کی عمدگی اور افضلیت میں

یعنی جب کہ اہل ظواہر جناب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور اصحاب ابوحنیفہ رحمہم اللہ وغیرہ علماء احناف کو بطور حقارت کے فقیہ کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ محدث نہیں تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو احادیث کے اضطراب وعلل، الحاق وقلب متن وسند میں کچھ تمیز نہیں، یہ معلوم نہیں کہ متن حدیث میں کہاں پر الحاق ہوا ہے؟ اور کونسی عبارت ملحقہ ہے؟ حدیث میں قلب کس موقع پر واقع ہوا ہے؟ اصل میں کیا ہونا چاہئے؟ سند میں روایت کا تغیر وتبدل کس جگہ پر ہے اور کیا ہونا چاہئے؟ ان امور سے بالکل نابلد اور کوسوں اور منزلوں بعید ہیں، مع ہذا اپنے آپ کو بہت ہی بڑا محدث جانتے ہیں، اور محدثین کے زمرہ میں شمار کرتے ہیں، اور اس کی خبر نہیں کہ روایت کے ساتھ فقاہت ودرایت نہ ہوتو اس وقت تک اس محدث کا کیا اعتبار ہوسکتا ہے، گویا یہ دونوں آپس میں لازم وملزوم ہیں، لہٰذا چند حدیثیں فقاہت اور فقہ اور فقیہ کی فضیلت اور اس کے درجہ اور اس کی خوبیوں میں بیان کرتا ہوں:

(١)......عن معاویة رضی اللّٰه عنه قال : قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم : من یرد اللّٰه

به خیر ایفقهه فی الدین۔(متفق علیه)

یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ: جس کے ساتھ خدا پاک ارادہ خیر کا کرتا ہے تو دین میں اس کو فقاہت نصیب کرتا ہے، یعنی اس کو فقیہ فی الدین بناتا ہے۔ (روایت کی ہے اس کو بخاری اور مسلم نے)

ف:......اس حدیث کی شرح شارحین نے یوں کی ہے: ''أی یجعله فی الدین فقیها ''یعنی اس کو خدا پاک فقیہ فی الدین گردانتا ہے۔

(۲)......عن عبداللّٰه ابن مسعود قال : قال رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم : نضر اللّٰه عبدا سمع مقالتي ، فحفظها ووعاها واداها ، فرب حامل فقه غیر فقیه ' ورب حامل فقه الی من هو افقه منه ۔(رواه الشافعی والبیهقی، ورواه احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجة والدارمی عن زید بن ثابت کما فی المشکٰوة)

اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: فرمایا رسول خدا ﷺ نے کہ: سبز کرے اللہ تعالیٰ اس بندہ کو جس نے میرے قول کو سنا پھر یاد کر لیا اس کو، پس بہت سے اٹھانے والے فقہ کے غیر فقیہ ہوتے ہیں اور بہت سے اٹھانے والے فقہ کے اپنے سے افقہ کی طرف پہنچا دیتے ہیں۔ (اور روایت کیا اس کو شافعی اور بیہقی نے۔ اور روایت کیا ہے اس حدیث کو احمد اور ترمذی اور ابوداؤد اور ابن ماجہ اور دارمی نے زید بن ثابت سے جیسا کہ مشکوٰۃ شریف میں ہے)

(۳)......وعن زید بن ثابت وجبیر بن مطعم وانس ابن مالک قالوا : قال رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم : نضر اللّٰه امرأ سمع مقالتی فبلغها فرب حامل فقه الی من هو افقه منه۔(رواه ابن ماجه)

اور زید بن ثابت اور جبیر مطعم اور انس بن مالک رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ: فرمایا

رسول خدا ﷺ نے: خوش وخرم کرے اللہ تعالیٰ اس مرد کو کہ سنا اس نے میری بات کو پھر پہونچا دیا اس کو، کیونکہ بہت سے فقہ کے اٹھانے والے طرف اس شخص کے وہ افقہ ہوتا ہے اس شخص سے۔ (روایت کیا اس حدیث کو ابن ماجہ نے)

(۴)......وعن علی رضی اللّٰہ عنہ قال : قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم : نعم الرجل الفقیہ فی الدین ان احتیج الیہ نفع و ان استغنی عنہ اغنی نفسہ۔(رواہ رزین)

اور علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: فرمایا رسول خدا ﷺ نے: عمدہ ہے رجل فقیہ فی الدین کہ اگر حاجت کی جاوے طرف اس کے تو نفع دیوے اور اگر بے پروائی کی جاوے اس سے تو وہ بے پروا کرے اپنے نفس کو۔ (روایت کیا اس کو رزین نے، کذا فی المشکوۃ۔[۱])

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی حدیثیں ہیں مگر بوجہ اختصار کے انہیں پر اکتفا کیا گیا۔ پس ان احادیث بالا سے بداہۃ یہ مقدمہ ثابت ہو گیا کہ افضل الناس افقہ الناس ہیں، اور جہلا فقیہوں کو خاص کر امام اعظم کو فقیہ کے ساتھ بطور حقارت کے ملقب کرتے ہیں، اور یہ نہیں جانتے کہ امام صاحب کو ہر علم وفن میں امام اور فقیہ ماننا عین ان کی تعظیم اور عظمت ہے، اس درجہ کا لفظ حافظ میں نہیں، کیونکہ حافظ بالحدیث تعلق الفاظ سے رکھتا ہے، اور فقاہت اور امامت اور اجتہاد کو معانی اور مطالب سے علاقہ ہے، اور کم فہم یہ نہیں جانتے کہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو شافعی مذہب والے اور مالکی مذہب والے اور حنبلی مذہب والے وغیرہ محدثین نے امامت اور فقاہت اور اجتہاد اور استنباط کے ساتھ موصوف مانا ہے، یہ درجہ اور رتبہ کسی سے کیا کم ہے، بلکہ دوسرے محدثین کو امام اور فقیہ کا رتبہ اور لقب کم حاصل ہوا ہے۔

اور ''نبذۃ الوصول شرح عمدۃ الاصول'' میں ہے:

---

[۱]......فقہ کے مزید فضائل کے لئے دیکھئے! مقدمہ مرغوب الفتاوی جلد اول۔

وقد ثبت بنقول خير القرون من الائمة الكبار ان الامام ابا حنيفة افقه الناس، قال ابن حجر المكي وهو من الائمة الشافعية : قال الشافعی : ان الناس عيال فی الفقه على ابی حنيفة ، مارأيت احدا افقه منه ، وروی الخطيب وهو من ائمة الشافعية عن الربيع قال : سمعت الشافعي يقول: الناس عيال على ابی حنيفة فی الفقه ، وقال الامام النووی فی " تهذيب الاسماء واللغات " : قال عبد اللّٰه بن المبارک : مارأيت احدا فی الفقه مثل ابی حنيفة۔

یعنی خیر القرون کے ائمہ کبار سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ امام ابوحنیفہ افقہ الناس ہیں، اور ابن حجر المکی جو کہ ائمہ شافعیہ میں سے ہیں وہ کہتے ہیں کہ: امام شافعی فرماتے ہیں کہ: لوگ ابوحنیفہ کی عیال ہیں فقہ میں، میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ وہ زیادہ افقہ ہو امام صاحب سے۔ اور علامہ خطیب روایت کرتے ہیں جو کہ خود شافعی تھے: ربیع سے سنا میں نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو کہ وہ فرماتے تھے کہ: لوگ عیال ابوحنیفہ کی ہیں فقہ میں۔

اور علامہ امام نووی نے " تہذیب الاسماء واللغات " میں فرمایا ہے کہ: عبداللہ بن مبارک نے کہا کہ: میں نے نہیں دیکھا کسی کو فقہ میں مثل ابوحنیفہ کے۔

وقال الحافظ الذهبی فی كتابه المسمٰی بالصحيفة فی مناقب ابی حنيفة : قال عبداللّٰه بن المبارک : ان الا ثر قد عرف ، وان احتيج الى الرأی فرايُ مالک والثوری وابی حنيفة ، وابو حنيفة احسنهم رأيا وهو افقه الثلا ثة ۔

یعنی علامہ حافظ ذہبی نے اپنی کتاب " صحیفہ فی مناقب ابی حنیفہ " رحمہ اللہ میں کہا ہے کہ: عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ: حدیث تو معلوم ہوگئی، اب اگر احتیاج فہم کی ہو تو مالک اور ثوری اور ابوحنیفہ رحمہم اللہ کی فہم وعقل ہے، لیکن ابوحنیفہ رحمہ اللہ فہم وعقل میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں، نیز ان تینوں میں بھی ابوحنیفہ رحمہ اللہ ہی فقیہ زیادہ ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر قیاس کا الزام

ف:...... یہاں سے اول کم فہموں کو سبق لینا چاہئے کہ جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر قیاس کرنے کا الزام لگاتے ہیں، بلکہ اس حکم میں امام مالک اور سفیان ثوری بھی داخل ہیں، ان کو بھی اہل الرائے کہنا چاہئے، ورنہ فرق بیان کرنے والے اپنی زبان بے لگام کو سکوت وخاموشی کی لگام دیں، اور یہ سمجھیں کہ سمجھ بوجھ' عقل ورائے' فہم وفراست' تیزی وذکاوت جس کو عطا ہو گیا اس کو دین ودنیا کی دولت مل گئی۔

﴿قال اللّٰہ تعالیٰ ومن یؤت الحکمة فقد اوتي خیرًا کثیرًا﴾

اور یہی وجہ ہے کہ باوجود ان ائمہ کے اہل رائے ہونے کے پھر بھی ان کو سب نے تسلیم کیا اور سر اطاعت ان کے سامنے جھکا دیا، ورنہ یہ کبھی نہ ہوتا، لہٰذا اپنی گستاخی سے باز آجاؤ اور شرماؤ، کیونکہ ائمہ مجتہدین محدثین ان کے ثنا گو ہیں، چنانچہ اوپر ثابت ہو چکا۔ و نیز امام صاحب استاد الاستاد علماء محدثین مثل بخاری اور مسلم وغیرہ کے ہیں، ان کو برا کہنا اپنی کم علمی اور کم فہمی کو ظاہر کرنا ہے، معاذ اللہ۔

وقال عبداللّٰہ ابن المبارک : لیس احد أحق ان یقتدیٰ بہ من ابی حنیفة ، لانہ کان اماما ' نقیا ' تقیا ' ورعا ' فقیھا، کشف العلم کشفا لم یکشفہ احد۔

یعنی فرمایا ہے عبداللہ ابن المبارک رحمہ اللہ نے کہ: کوئی احق اور لائق اس بات کے نہیں ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے امام ابوحنیفہ سے، کیونکہ وہ امام نقی اور تقی اور ورع اور فقیہ تھے، علم کی وضاحت اور کشف انہوں نے ایسا کر دیا کہ آج تک کوئی ایسا نہ کر سکا، یعنی ابوحنیفہ علم کی حقیقت سے واقف تھے۔

ف:...... غیر مقلدین کا دعویٰ ہے کہ ہم تقلید نہیں کرتے، حالانکہ قدم قدم پر ائمہ محدثین مثل

بخاری اور مسلم وغیرہما کی تقلید کرتے ہیں، کیونکہ بخاری وغیرہ کے اجتہادی اور استنباطی مسائل پر مطابق ان کے قول کے بدون تحقیق کے عمل کرتے ہیں یہی تقلید ہے، اگر یہ تقلید نہیں تو کیا شے ہے؟ بیان کریں۔اسی طرح وہ لوگ جو اپنے آپ کو مقلد کہتے ہیں کرتے ہیں، یعنی جو ان کے امام تحقیق کر چکے ہیں اس پر ان کا عمل ہے، پھر وہ مورد طعن کیوں ہیں اور خود کیوں نہیں؟ مابہ الامتیاز بتلاؤ! ہاں اتنا فرق ہے کہ غیر مقلدین ان لوگوں کی جو ائمہ مجتہدین کبار محدثین مثل امام اعظم اور امام شافعی اور امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ کے شاگردان شاگرد ہیں، مثل بخاری اور مسلم اور ترمذی اور ابوداؤد اور نسائی اور دارقطنی رحمہم اللہ وغیرہم کی تقلید کرتے ہیں، اور مقلدین ان ائمہ کی تقلید کرتے ہیں، چارہ تقلید سے دونوں جماعتوں کو نہیں ہے۔حاصل کلام یہ ہے کہ جو اوصاف امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہیں اور کتب معتبرہ میں بیان کئے گئے، ان میں سے تھوڑے سے اس مختصر میں احقر نے بیان کئے، ورنہ تمام بیان کرنے کے لئے ایک دفتر بلکہ کئی دفتر (دفاتر) چاہئے، لیکن پھر بھی وہ ختم نہیں ہوسکتے، و نیز جو اوصاف حمیدہ امام صاحب کے محققین ائمہ نے بیان کئے ہیں مثلاً: امام، نقی، تقی، ورع، زاہد، عالم باعمل، عابد، فقیہ الامۃ، وغیرہ وغیرہ اور کسی کے اتنے بیان نہیں کئے۔اور یہی نہیں کہ یہ اوصاف امام اعظم صاحب رحمہ اللہ کے حنفیہ کے بیان کردہ ہیں، بلکہ غیر مذہب والوں شافعی، مالکی، حنبلی کے بیان کردہ ہیں، جو میں نے نقل کئے ہیں تاکہ پھر کسی طرح کلام کرنے کی گنجائش نہ رہے، ہاں اگر حنفیہ ایسی تعریف امام صاحب رحمہ اللہ کی کرتے تو بیشک کوئی کہہ سکتا تھا کہ اس کا اعتبار نہیں۔

وقال يحيىٰ بن معين : القراء ة عندی قراء ة حمزة ' والفقه فقه ابی حنيفة ، وعلى هذا ادركت الناس، ذكره ابن خلكان في تاريخه۔

یعنی یحیٰ بن معین رحمہ اللہ نے کہا کہ: میرے نزدیک معتبر قرأۃ حمزہ کی ہے، اور فقہ ابی حنیفہ کی، اور اسی طریق پر پایا میں نے لوگوں کو۔ ذکر کیا ہے اس کو تاریخ ابن خلکان میں۔

وقال صاحب المشکوٰۃ فی کتاب اسماء رجال الحدیث : وکیع بن الجراح الکوفی هو من مشائخ الحدیث الثقات المرجوع الی قولهم وکان یفتی بقول ابی حنیفة رحمة اللّٰه علیه وکان سمع منه شیئًا کثیرا، وهو من شیوخ الشافعي واحمد۔

یعنی صاحب المشکوٰۃ نے کتاب اسماء رجال الحدیث' میں کہا ہے کہ: وکیع بن الجراح الکوفی یہ مشائخ الحدیث ثقات میں سے ہیں کہ جن کے قول کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، باوجود اس کے یہ فتویٰ دیتے تھے قول پر ابو حنیفہ کے، اور انہوں نے امام صاحب سے بہت سی احادیث سنی ہیں، اور یہ شافعی اور احمد کے استادوں میں سے ہیں۔

وقال ابن معین : کان لابن المبارک فضل ، ولکن مارأیت افضل من وکیع، کان یستقبل القبلة ' ویسرد الصوم ' وکان یفتی بقول ابی حنیفة ، وکان سمع منه شیئا کثیرا، وهو من شیوخ الشافعی واحمد۔

اور ابن معین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ: ابن مبارک کے لئے فضیلت تو ہے، لیکن میں نے وکیع سے افضل کسی کو نہیں دیکھا کہ یہ استقبال کرتے قبلہ کا' اور پے در پے روزہ رکھتے تھے' اور ابی حنیفہ رحمہ اللہ کے قول پر فتویٰ دیتے تھے، اور بہت سی حدیثیں وکیع نے ابو حنیفہ سے سنی ہیں، اور یہ شافعی اور احمد رحمہما اللہ کے استادوں میں سے ہیں۔

وقال یحیٰ بن سعید القطان : لانکذب علی اللّٰه تعالٰی ما سمعنا احسن من رأی ابی حنیفة ، وقد اخذنا بأکثر اقواله ، ذکره الخوارزمی فی مسنده۔

اور علامہ یحیٰ بن سعید القطان رحمہ اللہ نے کہا کہ: ہم جھوٹ نہیں بولتے ہیں اللہ تعالیٰ پر

کہ ہم نے نہیں سنا ہے کسی کو کہ وہ احسن الرائے ہوا ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے، اور ہم اکثر اقوال ابو حنیفہ پر عمل کرتے ہیں۔ذکر کیا اس کو خوارزمی نے اپنے مسند میں۔

وقال الامام احمد بن حنبل : إن ابا حنيفة كان من اهل العلم والورع والزهد وايثار الآخرة بمحل لايدركه احد۔

اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ: ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ علم اور ورع اور زہد اور ایثار آخرت میں ایسے بلند مرتبہ پر پہنچے ہوئے ہیں کہ دوسرا اس مرتبہ پر نہیں پہنچ سکتا۔

پس ثابت ہوگیا ہے اس جگہ سے کہ ابوحنیفہ رحمہ اللہ افقہ الناس اور مصداق احادیث گذشتہ کے علی وجہ الاتم اور خیر التابعین ہیں، **كما لايخفى**۔

بحث: ذکر میں اس بات کے کہ ابوحنیفہ رحمہ اللہ مفسر اور مستنبط کلام اللہ تھے

پوشیدہ نہ رہے کہ جناب امام اعظم رحمہ اللہ کا مفسر ہونا اظہر من الشّمس ہے، کیونکہ استنباط کرنا ان کا قرآن شریف اور سنت رسول اللہ الکریم سے معروف ومشہور ہے، چنانچہ کتب اصول اور کتب تفسیر مثل مدارک اور احمدی وغیرہ سے واضح ولائح ہے، جن اصحاب کو ان کتب پر اور کتب اصول پر سرسری نظر بھی ہوگی وہ ہرگز ہرگز اس کا انکار نہیں کرسکتے، لہٰذا پہلے امام صاحب کو میں مستنبطین میں سے ثابت کرتا ہوں، پھر ان کے مفسر ہونے کو ثابت کروں گا، چنانچہ علامہ مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ اپنی تالیف ''انصاف فی بیان سبب الاختلاف'' میں تصریح فرماتے ہیں:

المجتهد المطلق هو من يعرف من القراٰن والسنة مايتعلق بالاحكام وخاصه وعامه ومجمله ومبينه وناسخه ومنسوخه ومتواتر السنة وغيره ، والمتصل والمرسل، وحال الرواة قوة وضعفا، ولسان العرب لغة ونحوا، واقوال العلماء من

الصحابة ومن بعدهم اجماعا واختلافا والقياس بانواعه ، ثم المجتهد قد يكون مستقلا وقد يكون منتسبا الى المستقل من امتاز عن سائر المجتهدين بثلاث خصال كما ترىٰ ذلک في ابي حنيفة رحمة اللّٰه عليه والشافعی رحمة اللّٰه عليه ۔

مجتہد مطلق وہ شخص ہے کہ پہچانے قرآن اور سنت سے ان امور کو جو متعلق ہوں احکام کے، اور معلوم کرے اس کے خاص وعام، مجمل ومبین، ناسخ ومنسوخ، حدیث متواتر، وغیر متواتر، متصل ومرسل حدیث کو، اور جانے رواۃ حدیث کے حال کو باعتبار قوت وضعف کے، اور زبان عرب کو معلوم کرلے باعتبار لغت ونحو کے، اور اقوال صحابہ اور تابعین کے معلوم کرے باعتبار اتفاق واختلاف کے، اور قیاس کو مع اس کی قسموں کے جانتا ہو۔

پھر مجتہد کبھی مستقل ہوتا ہے اور کبھی منسوب مستقل کی طرف ہوتا ہے۔ اور مستقل وہ ہے کہ جو ممتاز ہو تمام مجتہدین سے تین خصلتوں میں، چنانچہ دیکھتا ہے تو ابوحنیفہ اور شافعی رحمہما اللہ میں۔ جب ابوحنیفہ اور شافعی رحمہما اللہ تمام مجتہدین کے ممتازوں میں سے ہوئے تو کوئی یہ کیوں کر کہہ سکتا ہے کہ ابوحنیفہ تفسیر اور عربیۃ نہیں جانتے تھے، باوجودیکہ ہر مذہب والے امت محمدیہ کے قائل ہیں کہ امام صاحب مجتہد مطلق ومجتہد مستقل تھے۔ اسی طرح علامہ ملاعلی قاری رحمہ اللہ سے علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ اپنے ''تذکرہ'' میں نقل فرماتے ہیں:

ان الفقهاء على سبع طبقات : الاولٰى طبقة المجتهدين فی الشرع كالائمة الاربعة ومن سلک مسلكهم فی تأسيس قواعد الاصول واستنباط احكام الفروع عن الادلة الاربعة الكتاب والسنة والاجماع والقياس من غير تقليد لاحد ، الخ۔

جب یہ ثابت ہوا کہ امام اعظم رحمہ اللہ مثل شافعی اور مالک اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے مجتہدین اور مستنبطین اور ائمہ کبار میں سے ہیں، تو اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ اجتہاد اور

استنباط مسائل فرعیہ کا امام اعظم رحمہ اللہ وغیرہ سوائے آیات قرآنی اوراحادیث نبوی کے اور کسی سے کرتے تھے؟ یا آیات واحادیث سے؟ لیکن جب یہ ثابت ہوجائے کہ آیات قرآنی اوراحادیث نبوی سے استنباط کرتے تھے تو پھر امام اعظم رحمہ اللہ کو غیر مفسر کہنا بڑی بے انصافی کی بات ہے، اور یہ کہنے والا کتنی بڑی غلطی کرنے والا ہے کہ انجام کو سوائے ندامت اور کچھ اس کو حاصل نہیں ہے، یہ ایسا ہی ہے جس طرح امام صاحب کے بارے میں قلت روایت کے قائل ہوکر فقط سترہ حدیثوں کا اعتقاد کیا، اور جب زیادہ حدیثیں امام صاحب سے ثابت ہوئیں، چنانچہ تصریح اس کی اوپر کتب معتبرۂ تالیفات علماء شافعیہ وغیرہ محدثین سے گذر چکی ہے، تو پھر کیسی شرمندگی اٹھانی پڑی کہ سر اٹھانے کی جگہ نہیں رہی، چنانچہ چند اقوال کتب تفاسیر سے امام صاحب کی تفسیر کردہ اقوال میں سے ''مشتے نمونہ ازخروارے'' نقل کردیتا ہوں تاکہ بوقت انکار منکرین کے اہل انصاف کو ان منکروں پر حجت ہوں۔

قال ابو حنيفة : انها تدل على انه لا يجوز قتل الحر بالعبد ولا الذكر بالانثٰى ، فهي منسوخة بآية المائدة ، وهو قوله تعالٰى ﴿وكتبنا عليهم فيها ان النفس بالنفس﴾

''تفسیر احمدی'' (کے صفحہ:۲۵) میں ہے کہ: جناب ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: یہ آیت دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ نہیں جائز ہے قتل کرنا حر کا بدلہ غلام کے، اور جائز نہیں قتل کرنا مذکر کا بدلہ مؤنث کے، پس یہ آیت منسوخ ہے ساتھ آیت مائدہ کے، اور وہ آیت قول اللہ تعالیٰ ہے: ﴿وكتبنا عليهم فيها ان النفس بالنفس﴾ اب معلوم ہوا کہ امام صاحب مفسر تو ہیں، مگر بڑھ کر اس سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ امام صاحب کو استنباط کرنا مسائل کا آیت قرآنی سے اور علم ناسخ ومنسوخ کا بھی تھا۔

اسی طرح دوسری جگہ دیکھو:

اومنسوخ بقوله ﴿وان احكم بينهم بما انزل اللّٰه﴾ وهو قول ابن عباس رضی اللّٰه عنه ، واليه ذهب ابو حنيفة علٰى مافى الكشاف۔(تفسیر احمدی صفحہ:۲۸)

یعنی یا منسوخ ہے ساتھ قول اللہ تعالیٰ کے:﴿وان احكم بينهم بما انزل اللّٰه﴾اور یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے، اور اسی کی طرف ابوحنیفہ رحمہ اللہ گئے ہیں جیسا کہ کشاف میں ہے، پس اس سے بھی مفسر ہونا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا اور استدلال پکڑنا آیت قرآنی سے امام صاحب کا ثابت ہوا ہے۔

﴿واتخذُوا من مقام ابراهيم مصلى﴾ لوكان ركعتين بعد الطواف واجبتان عند ابى حنيفة رحمة اللّٰه عليه فيكون الامر للوجوب عنده۔(تفسیر احمدی:صفحہ؍۴۳)

یعنی یہ آیت ''واتخذوا'' سے اگر دو رکعتیں بعد طواف واجب ہوں تو پس امر واسطے وجوب کے ہے نزدیک امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے۔

اسی طرح ''تفسیر احمدی'' کے صفحہ:۵۹؍میں ہے:

وصرح بان مذهب ابى حنيفة رحمة اللّٰه عليه ان قوله : عفى بمعنٰى اعطٰى ، واليه ذهب ابن عباس والحسن ومجاهد والضحاک۔

یعنی تصریح کی ہے بایں طور کہ مذہب ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہ ہے کہ قول اللہ تعالیٰ کا ''عفی'' بمعنی اعطٰی کے ہے۔اور اسی کی طرف ابن عباس اور حسن اور مجاہد اور ضحاک گئے ہیں۔

اسی طرح ''تفسیر احمدی'' کے صفحہ:۱۴۲؍میں ہے:

وقد تمسک ابوحنيفة بما سيأتي في سورة الأحقاف من قوله تعالٰى :﴿وحمله وفصاله ثلثون شهرًا﴾۔

یعنی ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے تمسک پکڑا ہے ساتھ اس آیت کریمہ کے کہ عنقریب آتی ہے

سورۂ احقاف میں، قول اللہ تعالیٰ سے: ﴿ وحمله فصاله ثلثون شهرا ﴾ یعنی رضاعت کی مدت اڑھائی سال ہے، اور دلیل امام صاحب کی یہی آیت ہے۔

اور اسی طرح ''تفسیر احمدی'' صفحہ: ۱۶۳/ میں ہے صلوٰۃ الوسطیٰ کے بیان میں:

وقد اختلف في تفسيرها ، فقال ابو حنيفة وعليه الجمهور من اكابر الصحابة من عمر وعلى وعائشة وام سلمة وحفصة وابن مسعود انها صلوة العصر لما فى مصحف حفصة : والصلوٰة الوسطى صلوٰة العصر ، ولقوله عليه السلام يوم الاحزاب حين فاته العصر شغلونا عن الصلوٰة الوسطى صلوٰة العصر۔

یعنی علما نے تفسیر میں صلوٰۃ الوسطیٰ کے اختلاف کیا ہے، پس کہا ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اور اس پر جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم عمر اور علی اور عائشہ اور ام سلمہ اور حفصہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم ہیں کہ صلوٰۃ الوسطیٰ صلوٰۃ العصر ہے، اس واسطے کہ مصحف میں حفصہ کے والصلوٰۃ الوسطیٰ صلوٰۃ العصر موجود ہے۔

اور اسی طرح ''تفسیر احمدی'' کے صفحہ: ۲۱۹/ میں ہے:

فى بيان ﴿ واتقوا النار التى اعدت للكافرين ﴾، ولهذا قال ابو حنيفة رحمة اللّٰه عليه : هي اخوف اٰية فى القراٰن۔

یعنی بیان میں آیۂ کریمہ ﴿ واتقوا النار التى اعدت للكافرين ﴾ کے ہے کہ اسی واسطے جناب ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ: یہ آیۃ زیادہ تر خوف والی ہے قرآن شریف میں۔

اسی طرح صفحہ: ۲۲۹/ میں ہے کہ:

والحاصل حينئذ انه يفهم من الأية انه لايجوز دفع مال السفيه اليه وإن كان

حرا عاقلا بالغا ، وهذا القدر کاف مما اتفق علیه ابو حنیفة مع ابی یوسف ومحمد۔

یعنی حاصل اس وقت میں یہ ہے کہ سمجھا جاتا ہے کہ آیۃ کریمہ سے کہ جائز ہے دفع کرنا مال السفیہ طرف اس کے، اگر چہ حر عاقل بالغ ہو، اور اسی قدر کافی ہے اس چیز سے کہ متفق ہیں اس پر ابو حنیفہ ساتھ ابو یوسف اور محمد رحمہم اللہ کے۔

پس یہ چند مواضع تفسیر اور استدلال ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے آپ کے سامنے پیش کئے گئے ہیں تاکہ زبان نہ کھولے۔ مگر کوئی معترض اس جگہ اعتراض کرسکتا ہے کہ یہ اقوال جتنے بیان کئے امام صاحب کے مفسر ثابت کرنے میں وہ ’’تفسیر احمدی‘‘ سے نقل کئے گئے ہیں، اور مصنف تفسیر احمدی کے ملا جیون صاحب حنفی المذہب ہیں، تو فیصلہ ہو گیا کہ گھر کے ہی آدمی مفسر اور محدث بنانے والے ہیں، جو چاہیں لکھدیں اس کا اعتبار نہیں، لہٰذا کوئی غیر حنفی کی تفسیر سے امام اعظم رحمہ اللہ کی تفسیر اور استدلال نقل کرو تو ہم تسلیم کریں کہ امام اعظم رحمہ اللہ مفسر تھے، تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ بیشک امام صاحب مفسر ہیں، اور تفسیر ان کی کتب تفاسیر علماء شافعیہ وغیرہم سے اظہر من الشّمس ہے۔ مگر ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمہ آفتاب راچہ گناہ [1]

اس کے نزدیک سب یکساں ہیں تو وہ اقوال غیر مذہب والے کے یہ ہیں۔

﴿فلا جناح علیه ان یطوف بهما﴾ کی تفسیر میں علامہ نواب صدیق الحسن خاں ’’فتح البیان‘‘ میں تحریر فرماتے ہیں:

ورفع الجناح یدل علی عدم الوجوب ، وبه قال ابو حنیفة واصحابه والثوری، وحکی الزمخشری فی الکشاف عن ابی حنیفة انه یقول : هو واجب ولیس برکن

[1]...... اگر چمگاڈر کو دن میں نظر نہیں آتا تو آفتاب کا کیا قصور؟ (خود اس کا قصور ہے)

وعلی تارکه دم۔

یعنی صفحہ:۱۸۴/میں ﴿ فلا جناح علیه ان یطوف بهما ﴾ کی تفسیر میں ہے کہ اور رفع جناح کا لفظ دلالت کرتا ہے عدم وجوب پر، اور ساتھ اسی قرائت کے جناب ابوحنیفہ نے کہا ہے، اوران کے اصحاب اور ثوری نے بھی۔

اور علامہ زمخشری نے اپنی ''تفسیر کشاف'' میں حکایت ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے اس طرح کی ہے کہ: امام صاحب وجوب کے قائل ہیں اور وہ رکن نہیں ہے، اور اس کے تارک پر دم آتا ہے۔

پس اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب مفسر تو کیا، بلکہ مشہور قرأۃ اور اجتہاد میں اس درجہ کے ہیں کہ ''کشاف'' جیسی تفسیر جو ''بیضاوی'' وغیرہ کا ماخذ ہے، اور اس کے مصنف بھی علم عربیت میں ناموراس درجہ کے ہیں کہ صرف اورنحو اور بلاغت وغیرہ فنون میں ان کی سند پکڑی جاتی ہے، وہ خود امام ابوحنیفہ کے قول کو نقل کر کے حجت پکڑتے ہیں۔ تو اب کیونکر متعصبین غیر مقلدین کی دروغ گوئی پر اہل انصاف عمل کریں گے کہ امام صاحب قلیل العربیت تھے مفسر نہیں تھے۔

اور ﴿ مَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ ﴾ کی تفسیر کے تحت میں ''فتح البیان'' کے صفحہ:۱۹۸/میں ہے: وقال مالک والشافعی وابوحنیفة : لایحل ذلک ، والحجة فیه انهم اذا ذبحوا علی اسم المسیح فقد اهلّو به لغیر اللّٰه فوجب ان یحرم۔

اور امام مالک اور شافعی اور ابوحنیفہ رحمہم اللہ نے کہا کہ: نہیں حلال ہے یہ اور حجت اس میں یہ ہے کہ بالتحقیق جب کہ انھوں نے ذبح کیا نام پر مسیح کے تو ان سے اہلال لغیر اللہ صادر ہوا پس واجب ہوا کہ وہ حرام ہو۔

اور''فتح البیان'' کے صفحہ:۲۶۵/میں ہے:﴿ فان اللّٰہ سمیع ﴾ کی تفسیر میں نواب صدیق الحسن خاں صاحب تحریر فرماتے ہیں:

سميع لقولهم وسميع يقتضى مسموعا بعد المضى ، وقال ابو حنيفة : سميع لا يلائه۔

یعنی خدا پاک سمیع ان کے قول کا ہے، اور لفظ سمیع مقتضی مسموع کو بعد گذرنے کے ہے۔ اور جناب ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے تفسیر میں سمیع کے یوں فرمایا ہے کہ: خدا پاک سمیع ہے اس کے ایلاء کا۔ پس اس سے بھی ثابت ہوا کہ امام صاحب مفسر تھے پس غیر مقلد کا طعن غیر مفسر ہونے کا دروغ بے فروغ ہے۔

''تفسیر بیضاوی'' صفحہ:۴۷/میں:﴿ ما كان لهم ان يدخلوها الا خائفين ﴾ کی تفسیر میں ہے:

واختلف الائمة فيه ، فجوّز ابوحنيفة ، ومنع مالک ، وفرق الشافعى بين المسجد الحرام وغيره۔

یعنی اختلاف کیا ہے ائمہ نے اس میں پس جائز رکھا ہے ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے، اور مالک رحمہ اللہ نے منع کیا، اور امام شافعی رحمہ اللہ نے فرق کیا ہے درمیان مسجد الحرام اور اس کے غیر میں۔ اور قول''وجوز ابو حنيفه رحمه الله'' کے حاشیہ میں ہے:

قوله :'' فجوز ابوحنيفة '' مطلقا بدليل هذه الأية ، فإنها تفيد جواز دخولهم بخشية وخشوع ، الخ ، عبدالحكيم۔

پس جائز رکھا ہے ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے مطلقاً بدلیل اس آیت کریمہ کے، کیونکہ یہ آیت مفید جواز دخول مشرکین کے ساتھ خوف اور خشوع کے ہے۔

اسی طرح بیضاوی صفحہ:۸۶ر﴿ ولا جناح علیه ان یطوف بهما ﴾کی تفسیر میں ہے:

’’وعن ابی حنیفة انه واجب یجبر بالدم ‘‘یعنی ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ: یہ طواف واجب ہے جبر کیا جائے گا ساتھ دم کے۔

اس کے حاشیہ میں ہے: قوله : دلیل ابی حنیفة ان الاٰیة لاتدل الاعلی نفی الاثم الخ،

یعنی دلیل ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی یہ ہے کہ آیت مذکورہ نہیں دلالت کرتی ہے مگر نفی گناہ پر، آخر تک۔

اور بیضاوی صفحہ:۱۰۰میں ر﴿ فمَااستیسر من الهدي ﴾کی تفسیر میں ہے:

وعند ابي حنیفة رحمة اللّٰه علیه : یبعث به ویجعل للمبعوث بیده یوم امارة ، فاذا جاء الیوم وظن انه ذبح تحلل لقوله :﴿ ولا تحلقوارؤسکم حتی یبلغ الهدی محله﴾، اس کے حاشیہ میں ہے: فیه اشارة الی ان ظاهر الاٰیة مع الحنفیة۔

یعنی اس میں اشارہ ہے اس بات پر کہ ظاہر آیت حنفیہ کی دلیل ہے، اور ماسوائے اس کے بہت اقوال تفاسیر میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے جابجا موجود ہیں، مگر یہ مختصران اقوال کی گنجائش نہیں رکھتا، لہٰذا اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں، فقط۔

ف:......ان آیتوں اوران کی تفسیروں اوران سے استدلال پکڑنے سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ امام اعظم کی طرف جو’’عوام کالانعام بل هم اضل ‘‘یہ بہتان لگاتے ہیں کہ: امام صاحب اپنے مذہب میں فقط رائے اور قیاس کے ڈھکوسلے چلاتے ہیں وہ بالکلیہ غلط ہیں۔ اگر کسی کو میری اس تحریر میں کچھ شک وشبہ ہو ان کو میں بالقسمیہ کہتا ہوں کہ کتب تفاسیر’’معالم التنزیل‘‘ اور’’تفسیر خازن‘‘ اور’’ بیضاوی‘‘ و’’مدارک‘‘ و’’تفسیر احمدی‘‘ کا ملاحظہ کریں تو

ضرور معلوم ہوگا کہ کن کن آیتوں سے کیسے کیسے استدلال امام صاحب نے کئے ہیں۔علیٰ ہذاالقیاس احادیث صریحہ سے بھی جابجا استدلال کیا،ہاں جب قرآن واحادیث سے امام صاحب کو دلیل نہیں ملتی تھی،تو قیاس کرتے تھےاور یہ عین عمل بالحدیث ہے،چنانچہ:

عن معاذ بن جبل : قال له رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم : بما تقضى يا معاذ ؟ قال : بكتاب اللّٰه ، قال : فان لم تجد ، قال : فبسنة رسول اللّٰه ، قال : فان لم تجد؟ قال : أجتهد برأيي، فقال رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم : الحمد للّٰه الذى وفق رسول رسوله بما يرضى به رسوله۔

یعنی اصحاب سنن نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ:جب یہ عامل یمن کے ہوکے جانے لگے،تو حضرت ﷺ نے ان کوفرمایا کہ:اے معاذ!ساتھ کس چیز کے فیصلہ کروگے؟ تو معاذ نے کہا کہ: ساتھ کتاب اللہ کے، پھر فرمایا کہ اگر کتاب اللہ میں نہ پاؤ گے؟ تو کہا معاذ نے کہ: فیصلہ کروں گا میں ساتھ سنت رسول اللہ کے، پھر فرمایا کہ:اگر نہ پاؤ سنت رسول اللہ میں؟ تو کہا کہ: اجتہاد کروں گا اپنی رائے سے۔تو فرمایا رسول کریم ﷺ نے:تعریف اس خدائے پاک کو ہے کہ جس نے توفیق دی ہے رسول کے فرستادے کوساتھ ایسی چیز کی کہ راضی ہووے ساتھ اس کے رسول اس کا۔

پس واسطے خدا پاک کے خوبیاں اور تعریف کاملہ ہے کہ اس نے ہمارے امام اعظم رحمہ اللہ اور باقی تمام مجتہدین کوایسی توفیق عنایت فرمائی کہ انہوں نے استنباط کئے احکام اور مسائل فرعیہ کتاب اللہ سے پھر سنت رسول اللہ سے پھر ساتھ اجماع کے پھر ساتھ اقوال صحابہ کے اگرچہ ایک صحابی ہو،پس جس وقت نہ پاتے ہیں دلائل ثلثہ مذکورہ تو پھر بے قرار ہوتے ہیں طرف قیاس کے، وہ قیاس کہ جو مستنبط قرآن اور حدیث اور اجماع سے

ہے، یعنی قیاس شرعی نہ وہ قیاس کہ جو عقلی مخالف ادلۂ شرعیہ ثلاثہ مذکورہ کے ہوکر حصہ شیطانی بمقتضائے مضمون حدیث صریح کے ہو۔

اور اگر یہ ائمۂ مجتہدین مسائل فرعیہ کو بوقت نہ ملنے قرآن وحدیث واجماع کے استنباط قیاس سے نہ کرتے تو البتہ بند ہوجاتے معاملات درمیان لوگوں کے، کیونکہ بہت سے معاملات ایسے ہیں کہ ثبوت ان کا محض قیاس شرعی سے ہے، اور سوائے قیاس شرعی کے دوسرا کوئی نص قرآنی اور حدیث نبوی اور اجماع صحابہ وغیرہم سے نہیں ہے۔

رسالہ کی غرض تحریر یہ ہے کہ امام اعظم کو برا کہنے والوں کو غیرت ہو

تنبیہ:......اس رسالہ کے ناظرین کو معلوم ہو کہ احقر کو اس رسالہ کی تحریر سے نہ دنیوی کچھ غرض ہے، اور نہ اپنی جولانی طبیعت کو ظاہر کرنا ہے، اور نہ کسی کی عزت ریزی یا ذلت اور طعن کرنا منظور ہے، بلکہ بمقتضائے فرمودہ علیہ السلام:

’’کسی کو بعد موت کے برائی کے ساتھ یاد مت کرو، کیونکہ ہر فرد اپنے مرنے کے بعد اپنے عمل کے بدلے کو پاچکا ہے‘‘۔

جب یہ حکم ہر فرد بشر مسلم خاص ہو یا عام کے واسطے ہے، تو اتنے بڑے پیشوا کو کہ جس کے واسطے خطاب امام اور ثقہ اور حافظ اور عالم باعمل اور متقی اور نقی اور ورع اور تابعی کا دیا گیا ہو، ونیز زاہد' مجتہد' فقیہ افضل' اعبد العباد' حافظ اور خدا کی یاد اور تلاوت قرآن میں رات بھر بیداری کرنے والے وغیرہ وغیرہ اوصاف سے موصوف کو' سجدہ میں انتقال کرنے والے کو' کم فہم کوتاہ بیں قاصر الانظار اور برا بھلا کہیں۔ جائے تعجب ہے کہ ان اوصاف کے علاوہ اور بھی اوصاف کتب متداولہ معتبرہ میں جناب امام شافعی اور امام مالک اور عبداللہ ابن المبارک وغیرہم (رحمہم اللہ) سے منقول ہیں، ان کو میں نے تطویل کی وجہ سے ترک کردیا۔ نہ

معلوم یہ لوگ کیوں زبان طعن سے بے علموں حنفیوں کو ادھر ادھر سے آ کر وسوسہ ڈالتے پھرتے ہیں، اور حدیث مذکور کا خلاف کرتے ہیں، اپنے آپ کو زمرۂ محدثین میں داخل کرتے ہیں، مگر ابتدا سے یہ قاعدہ چلا آیا ہے کہ اہل کمال کے بے ہنر دشمن ہوتے ہیں، اس لئے یہ بیچارے مجبور ہیں۔

بخاری، مسلم، ابن تیمیہ، ابن قیم، محی الدین عربی (رحمہم اللہ) وغیرہ پر جرح

دیکھئے! دارقطنی (رحمہ اللہ) وغیرہ نقادفن نے امام بخاری (رحمہ اللہ) پر جرح کیا ہے۔ نیز ان کی حدیثوں پر بھی، اسی طرح مسلم (رحمہ اللہ) پر اور ان کی حدیثوں پر۔ اور ہمارے زمانے کے علماء متاخرین ابن تیمیہ اور ابن قیم اور محی الدین عربی (رحمہم اللہ) تینوں ستون دین اور مجدد دین عدیم المثل ہادی امت محمد ﷺ کے تھے، باوجود اس کے ان پر کسی نے کفر کا فتویٰ دیا، کسی نے ملحد، کسی نے مرتد وغیرہ وغیرہ طعنوں سے مطعون کیا۔

کون سی جرح مردود ہے؟

لیکن کتب اصول کا یہ قاعدہ بدیہیہ ہے کہ جرح مبہم ومردود ہے، اور جرح مفسر بھی ہم زمانے کا بعض کا بعض پر غیر مقبول ہے، جیسا امام مالک (رحمہ اللہ) کا جرح محمد بن اسحاق (رحمہ اللہ) پر۔ اسی طرح جو جرح کرنے والا لائق جرح کرنے کے ہو اور وہ جرح کرے عناد اور تعصب سے تو وہ بھی جرح مردود ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اور سببوں سے بھی جرح مردود ہوتی ہے۔ اسی قاعدہ پر عمل کر کے جرح بخاری اور مسلم اور ابن تیمیہ اور ابن قیم اور محی الدین عربی (رحمہم اللہ) پر مردود ہے، لیکن ان پر جو جرح کی گئی ہے اس کو چھپاتے ہیں، اور امام اعظم (رحمہ اللہ) کے جرح کو کیوں معرض بیان میں لاتے ہیں؟ اور اپنی نیکیوں کو برباد کرتے ہیں، نعوذ باللہ منہ۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر یہ الزام کہ آپ حدیث پر قیاس کو مقدم کرتے ہیں

بعض طعن کرتے ہیں کہ امام صاحب احادیث پر قیاس مقدم کرتے ہیں، حالانکہ یہ سراسر بہتان ہے، اور جس کو شک ہو تو ملاحظہ کرلے ''خیرات الحسان'' اور ''میزان'' کو تا کہ ظاہر ہووے اس کو اپنا خسران۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر یہ الزام کہ آپ کثیر الرائے تھے

اور دوسرا طعن یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ (رحمہ اللہ) کثیر الرائے تھے اسی واسطے ان کو محدثین اصحاب الرائے کہتے ہیں، اور یہ فی الحقیقت طعن نہیں ہے، کیونکہ اہل بصیرت کے نزدیک کثرۃ رائے اور قیاس فقاہت ونباہت پر دلالت کرنے والا ہے، کیونکہ نقل بغیر عقل کے مفید اور کمال پذیر نہیں ہوتی۔ اور ہمارا اعتقاد اور اعتقاد ہر مصنف کا امام صاحب کے حق میں یہ ہے کہ زمانہ امام صاحب کا اس قدر فتنہ اور فساد کا تھا کہ آدمی ایک شہر سے دوسرے شہر تک نقل وحرکت تو کیا کرتا مسجدوں میں بھی جماعت سے نماز ادا کرنے سے تنگ تھا، یہ قصہ بنی امیہ اور نبی عباسیہ وغیرہ کا مشہور ومعروف ہے، اور تحصیل علوم اور اخذ احادیث اس زمانہ میں سفر پر موقوف تھا کہ مدینہ منورہ وغیرہ اطراف عالم میں سفر کیا جاتا، لیکن اس زمانہ میں یہ ممکن نہ تھا۔ ہاں اگر امام صاحب (رحمہ اللہ) اس زمانہ کو پاتے جس میں کثرت روایات احادیث کی ہوئی اور چہرۂ احادیث سے پردہ اٹھ گیا تھا فتنہ وفساد کے دور ہونے کی وجہ سے تو بیشک امام صاحب کے مذہب میں قیاس کم ہوتا، چنانچہ تحقیق کی اس کی عبدالوہاب شعرانی رحمہ اللہ نے اپنی ''میزان'' میں، اور ملا معین نے اپنی کتاب ''دراساة اللبیب فی الاسوة الحسنة بالحبیب'' میں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر یہ الزام کہ آپ قلیل الروایت تھے

اور ایک طعن یہ کہ امام صاحب رحمہ اللہ قلیل الروایت ہیں، لیکن حقیقت میں یہ طعن نہیں ہے، کیونکہ مرتبہ امام صاحب (رحمہ اللہ) کا اس باب میں مشابہ ہے مرتبہ صدیقیت کے۔ پس اگر یہ واقع میں طعن ہو تو جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جو کہ بعد انبیاء کے افضل البشر بالتحقیق ہیں وہ بھی مورد اس طعن کے ہوں گے، کیونکہ جیسے امام صاحب رحمہ اللہ بہ نسبت اور محدثین کے قلیل الروایت ہیں، اسی طرح جناب سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بلکہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی بہ نسبت اور صحابہ کے قلیل الروایت تھے۔ ''ماھذا الا القول الذی یدخل قائلہ فی الورطۃ الظلماء''۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر یہ الزام کہ آپ کثیر التعبد تھے

اور ایک طعن یہ ہے کہ امام اعظم رحمہ اللہ کثیر التعبد تھے۔ یعنی بہت عبادت کرتے تھے، یہاں تک کہ تمام رات بیداری کرتے تھے اور یہ بدعت ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ: یہ قول صادر ہوا ہے غفلت سے، اور اس کو سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، اور مجھ کو اس قائل سے تعجب ہوا کہ اس کی زبان سے یہ کلمہ کس طرح سرزد ہوا، کیونکہ کثرت عبادت حسب طاقت مثل احیاء شب اور ختم قرآن رات میں اور ادا کرنا ہزار رکعت کا اور مثل اس کے منقول ہے نقول صحیحہ صریحہ کے ساتھ اکثر صحابہ اور تابعین وغیرہم سے مانند فقہاء اور محدثین رحمہ اللہ کے، مثل عثمان اور عمر اور ابن عمر اور تمیم داری اور علی اور شداد بن اوس کے رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، اور تابعین میں سے مثل مسروق اور اسود اور نخعی اور عروہ بن زبیر اور ثابت البنانی اور زین العابدین علی بن الحسین اور قتادہ اور محمد بن واسع اور منصور بن زاذان اور علی بن عبداللہ بن عباس اور امام شافعی اور سعد بن ابراہیم

الزہری وشعبہ بن الحجاج اور خطیب البغدادی رحمہم اللہ وغیرہم۔ پس اس سے امام صاحب پر کیا طعن لازم آیا؟ ورنہ یہ کل کے کل بدعتی ہوں گے؟ حاشا للہ، بلکہ اس قول کا قائل اکبر مبتدعین الضالین میں سے ہے۔

امام ابوحنیفہ پر یہ طعن کہ سفیان ثوری اور دارقطنی نے آپ پر جرح کی

اور ایک طعن یہ ہے کہ امام اعظم رحمہ اللہ پر جرح کیا ہے سفیان ثوری اور دارقطنی اور خطیب اور ذہبی وغیرہم محدثین نے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ: یہ قول صادر ہوا ہے کسی غافل سے، اگر مطلق جرح عیب ہوتی اور اس کی وجہ سے راوی کو ترک کر دیا جاتا تو چاہئے کہ بخاری اور مسلم اور شافعی اور احمد اور مالک اور محمد بن اسحاق صاحب مغازی (رحمہم اللہ) وغیرہم اجلہ اصحاب حدیث کو بھی ترک کر دیا جائے، کیونکہ یہ تمام مجروم اور مقدوح ہیں، بلکہ اصحاب رسول خدا ﷺ کے بھی سلامت نہیں رہے، تو کیا کوئی عاقل کہہ سکتا ہے کہ ان کو ترک کر دیا گیا یا کر دیا جائے اور ان کی روایت پر اعتبار و اعتماد نہ کیا جائے؟ کلا واللہ ہرگز ایسا نہ ہوا ہے اور نہ ہوگا ع

ایں خیال است ومحال است وجنوں

پس اسی طرح امام صاحب رحمہ اللہ پر جو جرح کی گئی ہے مقبول نہیں مردود ہے، کیونکہ بعض جروح کہ جو امام صاحب پر ہوئے ہیں وہ مبہم ہیں، مثل قول ذہبی کے ''میزان الاعتدال'' میں اسمٰعیل بن حماد اور الامام ابی حنیفہ یہ دونوں ضعیف ہیں، حالانکہ مقرر ہو چکا ہے کتب اصول میں یہ کہ جرح مبہم قبول نہیں کی جائے گی، خاص کر اس کے حق میں جس کی عدالت و امامت ثقاہت ونباہت ثابت ہو چکی ہو، چنانچہ اوصاف حمیدہ امام صاحب رحمہ اللہ کے اوپر کتب معتبرہ سے گذر چکے ہیں۔

ونیز بعض جروح صادر ہوئے ہیں ان کے ہم زمانہ سے اور کتب اصول میں یہ بھی ثابت ہے کہ جرح ہم عصر کا بعض کا بعض پر غیر مقبول ہے خاص کر جب کہ جرح تعصب اور عداوت کے باعث سے ہوگا، اگر یہ قاعدہ امام اعظم رحمہ اللہ کے بارے میں نہ قبول کیا جائے تو پھر جرح ابن معین کی امام شافعی رحمہ اللہ کے حق میں اور جرح احمد (رحمہ اللہ) کی حارث محاسبی رحمہ اللہ کے حق میں اور جرح حارث رحمہ اللہ کی امام احمد رحمہ اللہ کے حق میں اور جرح مالک رحمہ اللہ کی محمد ابن اسحاق صاحب مغازی کے حق میں مقبول ومعتبر ہونا چاہئے، اوران کی احادیث کو ترک کردینا چاہئے، حالانکہ کسی اہل بصیرت نے ایسی جرحوں پر عمل نہیں کیا۔ اور بعض جرح متاخرین متعصبین سے صادر ہوئیں مثل دارقطنی اور ابن عدی وغیرہما سے، اور یہ جرح ایسے ہیں کہ جن پر قرائن جلیہ گواہی دے رہے ہیں کہ یہ جرح محض تعصب سے ہے، اور ثابت ہے کتب اصول میں کہ ایسی جرح بھی مردود ہے مقبول نہیں، بلکہ دارقطنی خود قابل جرح کے ہیں، چنانچہ علامہ شیخ الاسلام بدر الدین محمود العینی رحمہ اللہ نے تصریح کی ہے بحث قرأۃ الفاتحہ میں جو شرح ہدایہ میں ہے کہ: دارقطنی کو کیا حق ہے کہ امام اعظم رحمہ اللہ کی تضعیف کرے، بلکہ یہ خود مستحق تضعیف کے ہیں، کیونکہ یہ دارقطنی اپنی مسند میں احادیث سقیمہ اور معلولہ اور منکرہ اور غریبہ اور موضوعہ روایت کرتے ہیں، اور اسی شرح ہدایہ میں علامہ عینی رحمہ اللہ نے بحث اجارہ زمین مکہ اور مکانات مکہ میں لکھا ہے کہ: لیکن قول ابن قطان کا کہ علت اس حدیث میں جناب ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ضعف ہے پس یہ اساءۃ ادب اور قلت حیا ہے، کیونکہ امام صاحب کی توثیق وتعریف سفیان ثوری اور ابن المبارک (رحمہما اللہ) وغیرہما نے کی ہے پس ان کی کیا مقدار ومرتبت ہے کہ تضعیف کریں امام کی ان ائمہ مذکورین کی توثیق اور توصیف کے مقابل میں۔

اور یہاں پر یہ بھی معلوم کرنا چاہئے کہ بعض اہل علم تشدد کرتے ہیں جرح کرنے میں رواۃ کے بے پروائی سے اور درج کرتے ہیں احادیث غیر موضوعہ کو موضوعات میں، ان میں سے ابن جوزی اور صغانی اور جوزقانی اور مجدالدین فیروزآبادی اور ابن تیمیہ الحرانی الدمشقی اور ابوالحسن بن القطان (رحمہ اللہ) وغیرہم ہیں۔

اور بعض ایسے ہیں کہ اپنی تصانیف میں ذکر کر دیتے ہیں وہ چیزیں کہ کسی کے حق میں وہ کہی گئی ہوں بغیر فرق کرنے درمیان مقبول اور غیر مقبول کے، مثل ابن عدی اور ذہبی کے جن حضرات نے ''میزان'' اور ''کامل'' کو دیکھا ہوگا وہ خوب جانتے ہوں گے۔ پس ہر شخص کو احتیاط سے کام لینا چاہئے لفظ جرح دیکھ کر کسی پر بغیر تحقیق وتدقیق کے جرح نہ کرنا چاہئے کہ یہ بہت معیوب ہے، کیونکہ بعض جروح روایات معتبرہ سے ثابت نہیں ہوئیں مثل روایت خطیب کے جرح میں امام صاحب کے، اور اکثر جرح کرنے میں خطیب ہی کے عیال ہیں، تو ایسی جرح مردود اور مجروح ہے۔

امام ابوحنیفہ پر یہ طعن کہ آپ کے اکثر تلامذہ وضاعین ومجروحین تھے

اور ایک طعن یہ ہے کہ اکثر تلامذہ امام صاحب رحمہ اللہ کے وضاعین اور مجروحین تھے، مثل نوح الجامع اور ابی مطیع البلخی اور حسن اللؤلوی کے، لیکن یہ جرح مخالف ہے قول اللہ تعالیٰ کے: ﴿ولا تزر وازرة وزر اخری﴾ اگر یہ جرح معتبر ہوتی تو اکثر سادات اہل بیت مثل جعفر صادق اور محمد باقر اور مثل ان کے اکثر تلامذہ رافضی کذابین میں سے تھے، لہٰذا ان کو بھی مجروح سمجھنا چاہئے، **ولا قائل به احد ، فکذا هذا**۔

اور ایک طعن یہ ہے کہ امام صاحب نے ضعفاء سے روایت کی ہے اور حال یہ ہے کہ یہ امر مشترک درمیان علماء انام کے ہے، کیونکہ اکثر راوی شافعی اور مالک اور احمد اور بخاری

اورمسلم وغیرہ کے ضعفاء میں سے ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر یہ طعن کہ آپ قلیل العربیہ تھے

اور ایک طعن یہ کہ امام اعظم قلیل العربیۃ تھے اور جواب اس کا یہ ہے کہ طعن اگر چہ بعضوں نے اپنی تصانیف میں بھی داخل کیا، لیکن یہ طعن اہل حدیث کے نزدیک قادح نہیں ہے، کیونکہ حقیقت میں یہ طعن ہی نہیں ہے، ومع ہذا ثقات محققین نے اس طعن کو اپنی تالیفات میں بیان کرکے اس کا جواب بھی بیان کردیا ہے، چنانچہ ابن خلکان نے اس کی تصریح کی اور عبارت اس کی پہلے گذر چکی، فتأمل۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جناب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مناقب جمیلہ اور فضائل جلیلہ اس درجہ ہیں کہ عقل انسان کی ان کے ادراک سے قاصر ہے، اور زبان ان کے بیان کرنے سے عاجز، چنانچہ علماء مذہب متفرقہ نے آپ کے مناقب میں دفتر کے دفتر لکھ ڈالے، مگر پھر بھی اقرار کیا کہ ہم عاجز ہیں۔ پس امام صاحب پر وہی طعن کرے گا جس کو تعصب مذہبی یا جہالت گھیرے ہوئے ہوگی۔

هذا اٰخر المختصر من القاصر المقتصر، ومن اللّٰه ارجو حسن الخاتمة وعيش الدنيا والاخرة، والحمد للّٰه رب العٰلمين، والصلوٰة علىٰ رسوله محمد واله وصحبه اجمعين،

ایک ضروری وضاحت

حضرت مولانا قاضی سید رحمت اللہ صاحب لاجپوری محدث راندری رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ ’’تحقیق المسائل من عمدة الوسائل ‘‘ کے آخر میں حضرت مفتی اعظم ہند مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ کا ایک مختصر مضمون حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے متلق نقل کیا تھا، جدید ترتیب میں اسے ’’تلک عشرة کاملة ‘‘ کے آخر میں ملحق کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوا۔

مرغوب احمد لاجپوری

مختصر تذکرہ مناقب امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کوفی رحمۃ اللہ علیہ

حافظ ابن حجر (رحمہ اللہ) ’’تہذیب التہذیب‘‘ میں لکھتے ہیں:

قال محمد بن مزاحم سمعت ابن المبارک یقول : افقه الناس ابو حنیفة ، مارأیت فی الفقه مثله،

(حضرت) عبداللہ بن مبارک (رحمہ اللہ) فرماتے ہیں کہ: ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ افقہ الناس ہیں۔فقہ میں ان کے مثل میں نے کسی کو نہ دیکھا۔

’’تاریخ ابن خلدون‘‘ ثالث میں ہے:

قال یحي بن معین : القراء ة قرائة حمزة ، والفقه فقه ابی حنیفة۔

یحیٰ بن معین (رحمہ اللہ) فرماتے ہیں کہ: قرأت تو حمزہ کی قرأت ہے، اور فقہ ابوحنیفہ کا فقہ ہے۔

علامہ ابن حجر مکی شافعی (رحمہ اللہ) ’’خیرات الحسان‘‘ میں لکھتے ہیں:

قال وکیع : مارأیت احدا افقه منه ،

(حضرت) وکیع (رحمہ اللہ) نے فرمایا کہ: میں نے ابوحنیفہ (رحمہ اللہ) سے زیادہ فقیہ کسی کونہیں دیکھا۔

خطیب ''تاریخ بغداد'' میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کرتے ہیں:

من اراد ان یتبحر فی الفقه فهو عیال علی ابی حنیفة،

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جو فقہ میں تبحر پیدا کرنا چاہے، وہ ابوحنیفہ (رحمہ اللہ) کا عیال ہے۔

امام نووی (رحمہ اللہ) ''تہذیب الاسماء واللغات'' میں لکھتے ہیں:

فكان يحي الليل صلٰوة ودعاء وتضرعًا،

یعنی امام ابوحنیفہ (رحمہ اللہ) تمام رات نماز اور دعا اور تضرع میں مشغول رہتے تھے۔

علامہ ابن اثیر جزری (رحمہ اللہ) ''جامع الاصول'' میں امام ابوحنیفہ (رحمہ اللہ) کے مناقب کثیرہ تحریر کرنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں:

ولو ذهبنا الى شرح مناقبه وفضائله لأطلنا الخطب ولم نصل الى الغرض منها، فانه كان عالمًا ' عاملا ' زاهدا ' عابدا ' ورعا ' تقيا ' اماما في علوم الشريعة مرضيا۔

یعنی اگر ہم امام کے مناقب وفضائل مشرح بیان کرنے لگیں تو بڑے بڑے دفتر ہو جائیں اور پھر بھی غرض پوری نہ ہو، کیونکہ وہ ایک عالم، عامل، زاہد، پرہیزگار، متقی اور علوم شریعت کے برگزیدہ امام تھے۔

علامہ ذہبی (رحمہ اللہ) نے ''تہذیب التہذیب'' میں لکھا ہے:

قال سليمان بن الربيع : ثنا حبان بن موسى سمعت ابن المبارک يقول : جالست الكوفيين فمارأيت منهم اورع من ابى حنيفة ، وقال حامد بن اٰدم : سمعت

ابن المبارک یقول : مارأیت احدًا أورع من ابی حنیفة ،

یعنی عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: میں نے (امام) ابوحنیفہ (رحمہ اللہ) سے زیادہ پرہیزگار کسی کو نہیں دیکھا۔

حافظ ابن حجر (رحمہ اللہ) نے ''تہذیب التہذیب'' میں لکھا ہے:

ومناقب الامام ابی حنیفة کثیرة جدا،

یعنی امام ابوحنیفہ (رحمہ اللہ) کے مناقب بہت ہی ہیں۔

علامہ ابن حجر مکی شافعی (رحمہ اللہ) ''خیرات الحسان'' میں لکھتے ہیں:

وقال احمد بن حنبل فی حقه : انه من العلم والورع والزهد وایثار الدار الاخرة بمحل لایدرکه احد۔

یعنی امام احمد بن حنبل (رحمہ اللہ) نے فرمایا کہ: امام ابوحنیفہ (رحمہ اللہ) علم وتقوی اور زہد اور آخرت کو دنیا کے مقابلہ میں اختیار کرنے میں اس مرتبہ پر تھے کہ وہاں تک کوئی نہ پہنچے گا۔

الحاصل امام ابوحنیفہ (رحمہ اللہ) کے مناقب سے یہ چند اقوال ''مشتے ازخروارے کے از ہزار'' کی نسبت بھی نہیں رکھتے۔ تمام ائمہ دین وعلماء مجتہدین امام الائمہ (رحمہ اللہ) کی مدح وثنا میں رطب اللسان ہیں، اور بیشمار کتابیں امام کے مناقب میں اہل مذاہب اربعہ نے لکھی ہیں، ایسے امام عالی مقام کی نسبت گستاخی آمیز کلمات کہنے والے کا جو حشر ہوگا وہ مخفی نہیں۔ ہمیں زیادہ بیان کی ضرورت نہیں، سمجھ دار کو ایک اشارہ کافی ہے، واللہ الموفق۔

محمد کفایت اللہ عفا عنہ مولانا شاہ جہانپوری

اسلامی ضرورت اور اوقاف کی فاضل آمدنی

اس رسالہ میں اوقاف کی زائد آمدنی کو دوسرے کسی اہم مصارف میں بوقت ضرورت خرچ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں قدرے تفصیل سے اکابر علماء کی دستخط کے ساتھ فتاوی جمع کئے گئے ہیں۔

حضرت مولانا قاضی رحمت اللہ صاحب لاجپوری' راندیری

ترتیب' حواشی واضافہ

مرغوب احمد لاجپوری

عرض مرتب

فقہاء نے صراحت فرمائی ہے کہ اوقاف کی آمدنی اور رقوم میں واقف کی شرط کے خلاف کسی طرح کا تصرف جائز نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اگر واقف نے وقف نامہ میں خود ہی کوئی صراحت اس طرح کی کردی ہو کہ وقف کی زائد آمدنی کسی بھی کار خیر میں صرف کی جاسکتی ہے تو مسئلہ دوسرا ہے۔

ہاں کسی مسجد کے پاس اموال کثیرہ جمع ہوں اور مسجد کو نہ فی الحال ان کی حاجت ہو اور نہ بظن غالب فی المآل اور ان اموال کے اسی طرح جمع رہنے میں ضائع ہوجانے اور متغلبین کے کھا اڑا جانے کا اندیشہ ہو تو یہ زائد از حاجت اموال جمع شدہ کسی دوسری محتاج مسجد میں خرچ ہوسکتے ہیں، اسی طرح کسی ایسے دینی مدرسہ میں جو علوم شریعت' تفسیر' حدیث' فقہ وغیرہ کی تعلیم دیتا ہو، خرچ کرنا جائز ہے۔ (کفایت المفتی ص ۲۰۷ ج ۱۰، ادارہ الفاروق کراچی)

اسی طرح اس زائد آمدنی سے غریب' بیوہ' فقراء کی امداد کرنا بھی جائز ہے۔

آج سے سو سال قبل اس قسم کے ایک سوال میں یہ رسالہ وجود میں آیا اور اس میں اکابر علماء و ارباب افتاء کی تائید سے اس مسئلہ پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی۔

اس دور میں بعض مدارس و مساجد کے اوقاف کی قیمت اس قدر زیادہ ہوگئی ہے کہ الامان والحفیظ، اور ان اوقاف کی آمدنی آسمان سے باتیں کررہی ہے، اس وقت بطور خاص اس مسئلہ کی اہمیت اور ضرورت بڑھ گئی ہے۔ انشاء اللہ اس رسالہ کی اشاعت ایسے وقت میں نافع اور کارآمد ثابت ہوگی۔

اللہ تعالیٰ اس کاوش کو اپنے دربار عالی میں شرف قبولیت سے نوازے، اور ذخیرۂ آخرت اور ذریعۂ نجات بنائے آمین۔

مرغوب احمد لاجپوری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مسجد کی فاضل آمدنی سے کوئی مدرسہ یا یتیم خانہ کھول سکتے ہیں یا نہیں؟

سوال:...... کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ بعض ملکوں میں مسجدوں کے اوقاف ہیں، اوران کی آمدنی اس قدر ہے کہ مسجد میں کما حقہ بلکہ زیادہ خرچ کرنے کے بعد بھی ہمیشہ بہت بچ رہتی ہے، اور مسجدوں کا روپیہ بہت جمع رہتا ہے، اب خوف یہ ہے کہ اگر یہ روپیہ یونہی جمع ہوتا رہا تو کوئی نہ کوئی شخص اس کو ہضم کر جائے گا اور ضائع کردے گا، چنانچہ ایسی کئی نظیریں گذر چکی ہیں اور گذر رہی ہیں، تواب یہ امر دریافت طلب ہے کہ آیا اس روپیہ سے کوئی مدرسہ دینی یا یتیم خانہ کھول سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر کھول سکتے ہیں تو بہتر ہے، کیونکہ ایک امر دین میں روپیہ صرف ہوگا جو کہ واقف کی دلی تمنا تھی، کیونکہ اس نے جو وقف کیا تھا اسی غرض سے کیا تھا کہ میرے بعد یہ صدقۂ جاریہ رہے، اور مجھے اس کا ثواب عنداللہ ملتا رہے، اوراس صورت میں جمع ہونے کے بعد لوگ اس مال کو کھا جائیں گے تو کیا خاک اس کا ثواب ملے گا۔

علمائے اسلام سے یہ التجا ہے کہ اس کو مدلل کتب فقہ سے جو کہ معتبر ہیں تحریر فرماویں اور اچھی طرح سے اس کی تحقیق فرماویں، کیونکہ اس مسئلہ کی سخت ضرورت ہے۔ انّ اللّٰہ لا یضیع اجر المحسنین۔ بینوا توجروا۔

الجواب:...... قال في رد المحتار نقلا عن الفتح : فان شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع وهو مالک فله ان يجعل ماله حيث يشاء مالم يكن معصية ، الخ (ص/ ۳۶۱ جلد ثالث ،[۱])

---

[۱]...... شامی ص ۵۲۷ ج ۶، مطلب : شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع ، كتاب الوقف ، مكتبه دارالباز ، مكة المكرمة۔

وفیہ ایضًا : وکذا سیأتی فی فروع الفصل الاوّل ان قولهم شرط الواقف کنص الشارع : ای فی المفهوم والدلالة ، ووجوب العمل به ، الخ۔(ص:۳۷۶ج۳) ۱؎

وفی الدر المختار : (اتحد الواقف والجهة وقل مرسوم بعض الموقوف علیه) بسبب خراب وقف احدهما (جاز للحاکم ان یصرف من فاضل الوقف الآخر علیه) لانهما حینئذٍ کشیء واحد (وان اختلف احدهما بان بنی رجلان مسجدین) أو رجل مسجداً ومدرسة ووقف علیهما اوقافا (لا)یجوز له ذلک۔

(درمختار مع ردالمحتار جلد۳،ص۳۷۰) ۲؎

عبارات مذکورہ بالا سے واضح ہے کہ کوئی تصرف وقف میں خلاف شرط واقف کرنا جائز نہیں، اور آمدنی اوقاف مسجد معین کو دوسری مسجد یا مدرسہ وغیرہ میں صرف کرنا درست نہیں، اور اس آمدنی سے مدرسہ جدید کھولنا اور قائم کرنا جائز نہیں ہے، البتہ اگر واقف نے وقف نامہ میں کوئی ایسا کلمہ لکھ دیا ہے کہ فاضل آمدنی کو کسی دوسرے کار خیر میں لگا دیا جائے یا مدرسہ وغیرہ قائم کیا جاوے تو موافق شرط واقف کے مدرسہ کھولنا درست ہے، بدون اس کے درست نہیں۔

یہ ہے اصل مذہب حنفیہ کا، لیکن اگر اسی مسجد میں آبادی مسجد کی غرض سے کوئی مدرسہ جاری کردیا جاوے کہ وہ روپیہ زائد کار خیر میں صرف ہوجاوے تو اس سبب سے کہ غرض واقف ظاہراً یہ ہوتی ہے کہ یہ روپیہ ضائع نہ ہو اور کار خیر میں صرف ہو، اس وجہ سے اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اور نظیر اس کی فتویٰ بعض مشائخ کا ہے جس کو شامی نے نقل کیا ہے

۱؎......شامی ص۵۹۵ ج۶ ، مطلب : فی نقل کتب الوقف من محلها ، کتاب الوقف ، مکتبه دارالباز مکة المکرمة۔

۲؎......شامی ص۵۵۱ ج۶ ، کتاب الوقف ، مکتبه دارالباز ، مکة المکرمة۔

کہ بخوف تلف مال مسجد اس مال کو دوسری مسجد میں لگانا جائز ہے، پس اگرچہ اصل مذہب حنفیہ عدم جواز ہے، لیکن بعارض خوف تلف وہ امر اختیار کرنا جس میں غرض واقف حاصل ہو درست معلوم ہوتا ہے۔

اور اصل یہ ہے کہ فقہاء معتبرین نے اس امر کی اجازت دی ہے کہ اگر کوئی وقف مسجد وغیرہ ویران ہو جائے اور اس میں ضرورت نہ رہے تو اس مسجد کے سامان اور آمدنی اوقاف کو دوسری مسجد وغیرہ میں صرف کرنا جائز ہے۔ تو صورت مسئولہ میں اگرچہ یہ بات تو نہیں ہے کہ وہ مساجد جن کی آمدنی کثیر فاضل جن میں بحث ہے ویران وغیر آباد ہو گئے ہوں، مگر اس اعتبار سے کہ بحالت استغنا جیسے وہاں نقل اموال جائز ہے کہ درصورت عدم نقل خوف تلف وتغلب ظلمہ ہے، وہ وجہ صورت مسئولہ میں بھی خیال کی جاسکتی ہے، یعنی جب آمدنی کسی مسجد کی اس قدر زیادہ ہے کہ اس مسجد میں کسی حال میں صرف نہیں ہوسکتی، اور ہمیشہ روپیہ زیادہ جمع ہوتا رہتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ ایسی مقدار کو پہنچ جاوے کہ اس مسجد میں اس مقدار کے صرف کا کوئی احتمال بھی باقی نہ رہے تو ایسی صورت میں اگر اس روپیہ سے مدرسہ وغیرہ کسی کار خیر کے جاری کرنے اور اس میں صرف کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی تو سوائے اس کے کہ آمدنی اوقاف کو ضائع کیا جائے اور لوگوں کے تصرف میں دیا جائے، غرض واقف اس سے کسی طرح حاصل نہیں ہوسکتی۔

پس صورت مسئولہ میں اگر ان دو اصلوں کو پیش نظر رکھ کے (ایک یہ کہ غرضِ واقف کا لحاظ کرنا چاہئے دوسرے یہ کہ بحالت استغنا اس مال کثیر کو تلف وتغلب سے بچایا جائے) اگر یہ کہا جائے کہ امور خیر میں اس روپیہ کا صرف کرنا درست ہے، مگر دو امر کا لحاظ اس میں ضروری رہے گا:

ایک یہ کہ......اس مسجد کوکسی وقت ضرورت تعمیر وغیرہ ہوتو اس کی ضروریات کومقدم کیا جائے گا۔

دوسرے یہ کہ......حتی الوسع اسی مسجد کے متعلق مدرسہ وغیرہ جاری کیا جاوے تا کہ مزید آبادی مسجد کا باعث ہواور من وجہٍ وہ روپیہ اسی مسجد کے متعلقات میں صرف ہو۔عبارت ’’درمختاروشامی‘‘ درج ذیل سے ان امورکا پتہ لگ سکتا ہے۔

قال فی الدر المختار : (ویبدأ من غلته بعمارته) ثم ماهو اقرب لعمارته کامام مسجد ومدرس مدرسة یعطون بقدر کفایتهم ، ثم السراج والبساط کذالک الی آخر المصالح ،(وان لم یشترط الواقف) لثبوته اقتضاءً،

قوله :(لثبوته اقتضاء) لان قصدالواقف صرف الغلة مؤبداً ولا تبقی دائمة الا بالعمارة فیثبت شرط العمارة اقتضاءً، ۱؎

وفی موضع اٰخر فان فضل شئ یعطی لبقیة المستحقین اذلاشک ان مراد الواقف انتظام حال مسجده أو مدرسة لا مجرد انتفاع اهل الوقف وان لزم تعطیله الخ ۲؎

اورشامی:ص:۲/۳۷۲ میں ہے: وکذلک اوقافه یأکلها النظار اوغیرهم ، ویلزم من عدم النقل خراب المسجد الآخر المحتاج الی النقل الخ، ۳؎

۱؎...... شامی ص۵۵۹ج۶، مطلب : ویبدأ من غلة الوقف بعمارته ، کتاب الوقف ، مکتبه دارالباز ، مکة المکرمة۔

۲؎......شامی ص۵۶۱ج۶، مطلب : ویبدأ بعد العمارته بما هو اقرب الیها، کتاب الوقف ، مکتبه دارالباز ، مکة المکرمة۔

۳؎...... شامی ص۵۵۰ج۶، مطلب : فی نقل انقاض المسجد و نحوه ، کتاب الوقف ، مکتبه دارالباز ، مکة المکرمة۔

وایضًا فی الشامی :ص: ۴۲۳/۴علیٰ انهم صرحوا بان مراعاة غرض الواقفين واجبة الخ ،[۱] فقط واللّٰہ تعالیٰ اعلم۔ کتبہ:عزیزالرحمٰن عفی عنہ

مفتی مدرسہ عربیہ دیوبند

محمد احمد

مہتمم مدرسہ عربیہ دیوبند

بیشک اصل مذہب یہی ہے کہ قول وغرض واقفین کی رعایت ضروری ہے، مگر حسب تصریحات فقہا یہ بھی لازم ہے کہ مال کوتلف سے بچانا چاہیئے، اس لئے صورت مسئولہ میں حق یہی معلوم ہوتا ہے کہ اجازت دی جائے، واللہ اعلم۔ بندہ محمود عفی عنہ

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
محمد سہول عفی عنہ عفی عنہ	بندہ: محمد حسن عفی عنہ	محمد مرتضی عفی عنہ
الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
عبدالصمد عفی عنہ	غلام رسول عفی عنہ	احقر الزمن: گل محمد خان

ویقرب من ذلک من بعض الوجوه وان لم یکن عینه ماذکره فی الدر المختار من مکروهات الصلوٰة : (ولابأس بنقشه خلا محرابه) فانه یکره ، لانه یلهی المصلی، ویکره التکلّف بد قائق النقوش ونحوها خصوصاً فی جدار القبلة ، قاله الحلبی، وفی حظر المجتبی : وقیل یکره فی المحراب دون السقف والمؤخر انتهی ، وظاهره ان المراد بالمحراب جدار القبلة ، فلیحفظ (بجص وماء ذهب) لو (بماله) الحلال (لامن مال الوقف) فانه حرام (وضمن متولیه لوفعل) النقش

---

[۱]......شامی ص۵۶۱ ج۶، مطلب : ویبدأ بعد العمارته بما هو اقرب الیها ، کتاب الوقف ، مکتبه دارالباز ، مکة المکرمة۔

أو البيـاض ، الا اذا خيف طـمـع الـظـلـمة فلا بأس به ، كافى ، وقال : قوله : (الاّ اذا خيف ، الـخ) أى بـأن اجتمعت عنده اموال المسجد وهو مستغن عن العمارة ، والا فيضمنها كما فى القهستانى عن النهاية ۔[۱] راقم: محمد انور عفا اللہ عنہ کشمیری

مدرس مدرسہ عربی دیوبند

بیشک بصورت استغناء مسجد بحالت اندیشہ طمع طامعین آمدنی زائد کا حوائج فقراء میں صرف کرنا یا اس سے مدرسہ اسلامیہ جاری کرنا افضل ہے۔ وهـو اوفـق لـغـرض الواقف والله سبحانه وتعالیٰ اعلم وعلمه اتم۔ حررہ خادم الطلبہ احقر الزمن:

احمد حسن الحسینی الامروہی غفرلہ

جبکہ مسجد کی آمدنی کثیر ہو اور مسجد اُس کی نہ فی الحال محتاج ہو اور نہ آئندہ احتیاج کی توقع ہو، اور اس کے ضیاع کا اندیشہ ہو، اور مسلمانوں کو دینی نوائب پیش آئیں، اور بیت المال نہ ہو تو ایسی حالت میں آمدنی مسجد کو دینی ضروریات میں مثلاً دینی مدرسہ کے اجراء، ونفقہ یتامی وغیرہ میں صرف کرنا جائز ہے۔ ''عالمگیریہ'' میں ہے:

مـال موقوف علىٰ سبيل الخير وعلى الفقراء بغير اعيانهم ، ومال موقوف على الـمسـجـد الـجامع واجتمعت من غلتهما ، ثم نابت الاسلام نائبة مثل حادثة الروم ، واجتيـج الى النفقة فى تلك الحادثة ، أما المال الموقوف على المسجد الجامع ان لـم تـكـن لـلـمسجد حاجة للحال ، فللقاضى ان يصرف فى ذلك ، لكن على وجه الـقرض ، فيكون ديناً فى مال الفئ ، وأماالمال الموقوف على الفقراء فهذا علىٰ ثلثة اوجـه : اما ان يصرف الى المحتاجين أوالى الاغنياء من ابناء السبيل أو الى الاغنياء

---

[۱]......شامی ص ۴۳۱ ج ۲، مـطـلـب : ((كـلـمة لا بأس)) دليل على المستحبّ غيره ، لان البأس الشدة ، كتاب الصلاة ، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها ، مكتبه دارالباز ، مكة المكرمة۔

من غير ابناء السبيل ، ففى الوجه الاول والثانى جاز لاعلى وجه القرض ، وفى الوجه الثالث المسئلة على قسمين : إما ان رأى قاض من قضاة المسلمين جواز ذلك أولم يرء ففى القسم الاوّل جاز الصرف لابطريق القرض ، وفى القسم الثانى يصرف على وجه القرض فيكون دينا فى مال الفئ كذا فى الواقعات الحسامية۔[1]

یہ روایت دلالت کرتی ہے کہ بوقت ضرورت ایک نوع وقف کی آمدنی سے دوسرے نوع میں صرف کرنا جائز ہے، لیکن احتیاج فی الحال نہ ہوتو بطور قرض صرف کیا جاوے۔اس سے واضح ہے کہ اگر احتیاج نہ فی الحال ہواور نہ فی المآل اور ضیاع کا اندیشہ ہوتو اس وقت دینی نائبہ میں بلا قرض بھی صرف ہوسکے گا، علی ہذا مال موقوف علی الفقراء کا' اغنیاء ابناء السبیل پر صرف کا جائز ہونا ثبوت مدعا کی دوسری واضح دلیل ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

حررہ: خلیل احمد عفی عنہ مدرس مظاہر علوم سہارنپور

حین ورودہ راندیر، فی جمادی الآخر ۱۳۲۸ھ

لقد اصاب فيما اجاب واجاد فيما افاد	المجيب مصيب
اشرف علی عفی عنہ	خادم الطلبہ القاضی رحمت اللہ علیہ عفی عنہ
الجواب صحیح	الجواب صحیح
عاشق الٰہی عفی عنہ میرٹھی	حررہ الراجی عفور بہ الصمد غلام محمد عفی عنہ

الجواب صحيح والمجيب مصيب

سید عالم، مدرسہ اشرفیہ

[1]......عالمگیری ص۴۶۴ ج ۲، كتاب الوقف ، الباب الحادى عشر ، الفصل الثانى۔

وكذا فى الفتاوى التا تارخانية ص۵۹۷ ج۵، كتاب الوقف ، الفصل الرابع والعشرون فى الاوقاف التى يستغنى عنها ...... الخ۔

مسجد کی فاضل آمدنی سے علما' فقرا' سادات اور درویشوں کی خدمت کرنا درست ہے یانہیں؟

سوال:......کیا قول ہے تمہارا اے علمائے دین محمدی ﷺ بیچ اس مسئلہ کے کہ ایک مسجد معین پر کسی شخص نے کچھ وقف کیا اور آمد اس کی خرچ مسجد سے بہت فاضل رہتی ہے۔مثلاً آمد ہزار کی ہے اور خرچ: ۱۰۰/ (سو) کا بھی نہیں آیا،اس فاضل سے خدمت علماء جو فقراء ہیں اور سادات اور درویش لوگوں کی خدمت کرنی درست ہے یانہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: واللہ اعلم بالصواب......صورت مذکورہ میں البتہ خدمت علماء عاملین اور علی ہذا القیاس سادات وغیرہم کی درست ہے،اس مال سے جو بچ رہتا ہے مسجد کے خرچ سے،اس لئے کہ یہ مال گویا خالی ہے اپنے مصرف سے،اور جو مال وقف خالی ہوا پنے مصرف سے، پس اس کو صرف فقراء وغیرہ کی طرف کرنا درست ہے۔

قال فی قاضی خان : وقف ضیعة ولم یذکر حکمها اذا خلت عن اهلها ، قال الشیخ الا مام ابو بکر محمد بن الفضل رحمه الله تعالی : ان کان الواقف جعلها وقفا فی صحته وحیاته ، وقال :" وقفت هذه الضیعة علی مسجد کذا " ولم یزد علی هذا ، ولم یجعل الوقف بلفظ الصدقة صح وتصرف غلته الی الفقراء ولم یکن للورثة حق۔

هذا المسطور فی الکتاب المذکور موجود وغیره ایضًا موجودو هوهذا، واذا استغنی هذا المسجد یصرف الی فقراء المسلمین ، فیجوز ذلک لان جنس هذه القربة مما لاینقطع ویبقی مابقی الاسلام ، فقط

کتبه : محمد فاضل عفی عنه

الـجـواب صـحـيـح ، والرواية التى اخرجها الشيخ الاجل المتوه باسمه محمد فاضل صريحة فى المقصود ، واللّٰه اعلم بالصواب ،

رقمه : احقرعباداللّٰه الصمد خادم علماء الحرمين الشريفين والهند

محمد عفى عنه

الامر كذلک خادم الطلبه والعلماء

رحيم الدين ولايتى عفى عنه

هٰذا المذكور كما هو المسطور، نمقه أضعف عباد اللّٰه الصمد خادم العلماء

حافظ محمد عفى عنه

هٰـذا جـواب صـحـيـح ' لاريـب فيـه ، والـمسـئلتان اللتان استنبطهما الشيخان الـفـاضلان الجامعان العلم العقلى والنقلى اعنى الشيخ مولانا محمد فاضل المفسر بالقراٰن سلمه اللّٰه الغفران ، ومولانا وبالفضل اولانا المحدث المولوى محمد ،

حرره العبد المفتقر الى رحمة ربه المعين خادم طلبه المدرسة الاشرفيه

محى الدين عفى عنه

هـذا الجواب بالصواب والروايتان اللتان اخرجهما الشيخان الماهران بالعلوم العقلى والنقلى' اعني الشيخ مولانا محمد فاضل ومولانا محمد مد ظلهما الله تعالى واضحتان على المراد ،

حرره العبد المفتقر الى رحمة ربه الودود ، خويدم العلماء والطلبة

محمود عفي عنه

مسجد کی ضرورت سے زائد آمدنی کو یتامی اور بیواؤں پر خرچ کرنے کا حکم

سوال:......کیا فرماتے ہیں علماء دین کہ بعض مسجدوں پر جو جائداد وقف ہے اس کی آمدنی اس قدر کثیر ہے کہ مسجد کے تمام اخراجات پورے کر کے بھی ہزاروں روپیہ اس کے جمع ہو گئے ہیں، اور پھر اس جائداد کی آمدنی سے اور جائداد خرید لی گئی، اور اس طرح آمدنی اس قدر ہو گئی ہے کہ اس مسجد کو کسی وقت اس جمع شدہ مال کی حاجت نہ ہوگی، تو ایسی صورت میں مسجد کے اس جمع شدہ مال میں سے کسی اسلامی ضرورت اور حادثہ میں مثلاً آج کل ترکوں کے مجروحین و یتامی و بیوگان کو امداد میں روپیہ دینا جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ روپیہ اگر اسی طرح جمع ہوتا رہا تو اندیشہ ہے کہ کسی وقت یہ ضائع ہو جائے، یعنی متغلبین اپنے تصرف میں لے آئیں، جیسا کہ اکثر اوقاف میں مشاہدہ ہوا ہے، بینوا توجرا۔

الجواب:......اصل مسلک یہ ہے کہ کسی خاص چیز پر وقف شدہ جائداد اور اس کی آمدنی کو دوسری جگہ منتقل نہیں کر سکتے۔ اور کتب فقہ میں یہ حکم بصراحت تمام مذکور ہے، لیکن کسی ایسے سخت حادثہ اور مصیبت کے وقت جو اسلام یا عام مسلمین کی زوال شوکت اسلامی کا باعث ہو، کسی ایسے وقف کی آمدنی سے جو اس کے مصارف سے بہت زائد ہو اور جمع ہو اور اس وقف کو اس مال کی نہ فی الحال حاجت ہو اور نہ بظن غالب فی المآل اور نیز اس جمع شدہ مال پر متغلبین کے بیجا تصرف کا اندیشہ ہو تو نوائب عامہ میں خرچ کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ ضرورت یعنی ہزارہا ترک مجروحین اور یتیم بچوں اور بیواؤں کی دردناک حالت بیشک اس لائق ہے کہ اموال اوقاف موصوفہ بصفات بالا میں سے ان کی امداد کی جائے۔ حکم مذکور کے لئے ان روایات فقہیہ سے استیناس کیا جا سکتا ہے۔

اصابه البرد الشديد فى الطريق ، فدخل مسجداً فيه خشب الغير، ولو لم يوقد نارا

يهلک، فخشب المسجد فی الايقاد اولیٰ من غيره ، (عالمگيری)۔ ۱؎

قلت : لما جاز صرف مال المسجد لضرورة احياء نفس واحدة فلأن يجوز لضرورة احياء نفوس جماعة من المسلمين اولیٰ،

و فی الهندية ايضا : يجوز ادخال الحبوب ، وأثاث البيت فی المسجد للخوف فی الفتنة العامة كذا فی القنية ،(عالمگيری) ۔ ۲؎

وفی الدر المختار : لاباس بنقشه خلا محرابه بجص وماء ذهب لو بماله لامن مال الوقف، فانه حرام، وضمن متوليه لوفعل النقش أو البياض، الا اذاخيف طمع الظلمة فلا بأس به كافی انتهی مختصرا، (در مختار)۔

وفی رد المحتار : قوله الا ادا خيف الخ ، بان اجتمعت عنده اموال المسجد، وهو مستغن عن العمارة والا فيضمنها كما فی القهستانی عن النهاية انتهی، (رد المحتار) ۔ ۳؎

قلت : لما جاز عند خوف طمع الظلمة وضياع المال صرف مال المسجد فی وجه لم يكن الصرف فيه جائزا كان هٰذا الجواز دليلا علیٰ ما قلنا، والله اعلم،

وفی رد المحتار:والذی ينبغی متابعة المشايخ المذكورين فی جواز النقل بلا فرق بين مسجد أوحوض كما افتی به الامام ابوشجاع والامام الحلوانی وكفی بهما قدوة، ولا سيما فی زماننا فان المسجد أو غيره من رباط أو حوض اذا لم ينقل يأخذ أنقاضه اللصوص والمتغلبون كما هو مشاهد وكذلک اوقافه ، يأكلها النظار

۱؎......عالمگیری ص۳۲۱ ج ۵،كتاب الكراهية ، الباب الخامس فی آداب المسجد۔

۲؎......عالمگیری ص۳۲۱ ج ۵،كتاب الكراهية ، الباب الخامس فی آداب المسجد۔

۳؎......شامی ص ج ۲،كتاب الصلاة ، مطلب كلمة " لابأس " دليل على ان المستحب غيره ، لان البأس الشدة۔

أوغيرهم ، ويلزم من عدم النقل خراب المسجد الآخر المحتاج الى النقل ، الخ ، (رد المحتار)۔ [۱]

وفی الهندية : مال موقوف على سبيل الخير وعلى الفقراء بغير اعيانهم ، ومال موقوف على المسجد الجامع واجتمعت من غلتهما ، ثم نابت الاسلام نائبة مثل حادثة الروم ، واحتيج الى النفقة في تلك الحادثة، أما المال الموقوف على المسجد الجامع ان لم يكن للمسجد حاجة للحالِ فللقاضی ان يصرف فی ذلک، لكن على وجه القرض، فيكون دينا فی مال الفئی، وأما المال الموقوف على الفقراء فهذا على ثلٰثة اوجه : اما ان يصرف الى المحتاجين أو الى الاغنياء من ابناء السبيل أوالى الاغنياء من غير ابناء السبيل، ففی الوجه الاول والثانی جاز لا على وجه القرض، وفی الوجه الثالث المسئلة على قسمين : اما ان راٰی قاض من قضاة المسلمين جواز ذلک او لم ير ، ففی القسم الاول جاز الصرف لابطريق القرض، وفی القسم الثانی يصرف على وجه القرض فيكون دينا فی مال الفيئ ، كذا فی الواقعات الحسامية انتهی، (عالمگيری)۔ [۲] والله اعلم بالصواب،

کتبہ: محمد کفایت اللہ عفی عنہ مولاہ
مدرس مدرسہ امینیہ دہلی

---

[۱]...... شامی ص۵۵۰ ج۶ ، مطلب : فی نقل انقاض المسجد و نحوه ، كتاب الوقف ، مكتبه دار الباز، مكة المكرمة۔

[۲]...... عالمگیری ص۴۶۴ ج۲، كتاب الوقف ، الباب الحادی عشر ، الفصل الثانی۔

وكذا فی الفتاوی التاتارخانية ص۵۹۷ ج۵، كتاب الوقف ، الفصل الرابع والعشرون فی الاوقاف التی يستغنی عنها ...... الخ۔

الجواب صحیح	الجواب صواب	الجواب صحیح
بندہ: عزیز الرحمٰن عفی عنہ	محمد انور عفا اللہ عنہ	بندہ: محمود عفی عنہ
مفتی مدرسہ عربیہ دیوبند	مدرس مدرسہ عربیہ دیوبند	مدرس مدرسہ عربیہ دیوبند
الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صواب
سیف الرحمٰن	شبیر احمد عفا اللہ عنہ	محمد قاسم
مدرس مدرسہ فتح پوری، دہلی	مدرس مدرسہ عربیہ دیوبند	مدرس مدرسہ امینیہ، دہلی
الجواب صحیح	الجواب صواب	الجواب موافق للصواب
بندہ: محمد امین	محمد ضیاء الحق	محمد یونس
مدرس مدرسہ امینیہ، دہلی	مدرس مدرسہ امینیہ، دہلی	مہتمم انجمن ہدایت الاسلام
الجواب صحیح	المجیب مصیب	المجیب مصیب
محمد عبد الحق	محمد عالم	محمد عبد المنان
۱۲۹۰ھ	مدرس مدرسہ فتح پوری، دہلی	مدرس مدرسہ فتح پوری، دہلی
الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
قطب الدین	محمد شفیع	عبد الرحمٰن
مدرس مدرسہ فتح پوری، دہلی	مدرس مدرسہ عبد الرب، دہلی	

[۱]

[۱]...... یہ فتویٰ ''کفایت المفتی'' میں بھی موجود ہے، مگر اس میں سوال و جواب میں فرق ہے۔ اور اس میں کچھ زیادتی بھی ہے۔ (کفایت المفتی (مع اضافات جدیدہ) ص ۲۱۱ ج ۱۰، ادارۃ الفاروق کراچی)